الامانت سے الامین تک

پروفیسر محمد منوّر

297.
170
108

Marfat.com

الامانت سے الامین تک

پروفیسر محمد منوّر

الفیصل
ناشران و تاجرانِ کتب
غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

Marfat.com

297.63 Muhammad Manawar, Prof.
Alamanat Say Alamin Tak/ Prof. Muhammad Manawar.- Lahore: Al-Faisal Nashran, 2012.
240p.

1. Seerat-e-Nabvi I. Title Card.

ISBN 969-503-851-4

108624

مارچ2012ء
محمد فیصل نے
آر۔آر پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔

قیمت:-/350روپے

AI-FAISAL NASHRAN
Ghazni Street, Urdu Bazar, Lahore. Pakistan
Phone: 042-7230777 & 042-7231387
http: www.alfaisalpublishers.com
e.mail: alfaisalpublisher@yahoo.com

Marfat.com

فہرست

	تلقینِ منوّر (صلاح الدین ایوبی)	7
	حصّۂ اوّل	
-1	رحمتِ تمام ﷺ	9
-2	الامانت سے الامین تک	17
-3	قرآنِ حکیم کا بارِ امانت	27
-4	اِسلام غلبے کا دین ہے	37
-5	انکارِ خدا-- خودشناسی سے محرومی	45
-6	توحید اور وحدتِ امّت	52
-7	بعثتِ نبوی اور روحانی انقلاب	58
-8	حدیث-- دوسرا آئینی ماخذ	66
-9	تصوف اور پیروئ سنت	71
-10	نعتِ رسول ﷺ اور ظفر علی خان	88
-11	حصولِ عبرت کی اہمیت	99
	حصّۂ دوم	
-12	رضائے الٰہی انقیادِ احکامِ الٰہی	107
-13	اطاعتِ خداوندی-- انفرادی جوابدہی	113

Marfat.com

-14	کمالِ رسالت -- کمالِ سیرت	123
-15	عیدالاضحیٰ	130
-16	قربانی -- یادِ یار	133
-17	غزوۂ بدر کا پیغام	136
-18	سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی	141
-19	معرکۂ بدر	144
-20	سامان اور صولتِ ایمان	146
-21	اپنی ذات سے فرار کیوں	148
-22	ہمارا تجارتی اخلاق	153
-23	نمود و نمائش	158
-24	صاحبِ دیانت عہدہ دار -- مجرم یا مجاہد	162
-25	حقوقِ ہمسائیگی	166

حصّۂ سوم

-26	یونانی اور مزدکی فکر کے مضمرات	173
-27	ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب	186
-28	اسلامی تمدّن کی اساس	201
-29	ملّتِ مسلمہ -- شاہ پسند کہ فقیر دوست	210
-30	ایمان کی اہمیت	214
-31	مسلمان اور تمدّنِ جدید	218
-32	مَاتَ الیھُودِی	221
-33	اجرامِ فلکی تک انسان کی رسائی	226

Marfat.com

تلقینِ منور

ہمارے ابا جان-- پروفیسر مرزا محمد منوّر مرحوم فصیح البیان مقرر تھے۔ اپنے موضوع سے مکمل انصاف کرتے اور سامعین کی ذہنی سطح کو سامنے رکھتے ہوئے ابلاغ کا پورا پورا حق ادا کرتے۔ ان کی ہمہ قسم تقاریر سننے کا اتفاق ہوا۔ تاہم جو لطف الامانۃ سے الامین تک کے موضوع پر ان کی گفتگو سننے کا آتا رہا اس کا کوئی حدّ وحساب نہیں۔ پروفیسر صاحب پر ایک جذب کی کیفیت طاری ہو جاتی اور وہ سامعین کو بھی اپنے ساتھ ہی بہاتے ہوئے لئے چلے جاتے۔ عیاں ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ کی جانب سے وحی کے نزول کا ذکر ہے، انبیاء علیہم السّلام اور پھر خاتم النبیّن علیہ الصّلوٰۃ والسّلام پر اس نورِ ہدایت کی تکمیل کا تذکرہ-- سماعتوں میں رس گھل رہا ہے، مشامِ جاں معطّر ہے اور چشمِ اشک بارِ بے حوصلہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔

پروفیسر محمد منوّر اوّلین صوفیہ کرام کا ذکر نہایت ذوق وشوق کے ساتھ کرتے، ان کی تعظیم ہی نہیں ان سے محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ قارئینِ کرام ملاحظہ فرمائیں گے کہ آپ نے زیرِ نظر مضامین میں ان پاکباز نفوس کے رُشحاتِ قلم سے بخوبی استفادہ کیا ہے۔ پھر اس سے بڑھ کر یہ امر پروفیسر صاحب کی تحریر کو از حد مؤثر اور مستند بنا رہا ہے کہ آپ نبی اکرم ﷺ کے فرامین کو ہر مسئلے کی توضیح کے لیے انتہائی برجستگی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ عالمی ادب ہو، عربی فارسی اور اردو کے صاحبِ طرز ادیب ہوں یا صوفیہ عظام کی لافانی تحریریں اور احادیثِ مبارکہ، پروفیسر صاحب کا مطالعہ نہایت وسیع ہے اور آپ کی یادداشت قابلِ داد ہے۔

پروفیسر مرزا محمد منوّر نے ایک موضوع پر خاص طور پر توجہ دی ہے اور یہی موضوع ان کی تحریک پاکستان سے متعلق تحریروں میں بھی نمایاں حیثیت کا مالک ہے یعنی ملّتِ کفر اور امّتِ مسلمہ کے درمیان خطِّ امتیاز! آپ نے کئی مضامین میں یہ موضوع بحث کے لئے منتخب کیا اور عیاں ہے کہ اس کے دو مقاصد تھے۔ ایک تو یہ کہ مسلمان نسلی، لسانی اور علاقائی بنیادوں پر بننے والی اقوام (اور بعض اوقات مذاہب) کی غیر اسلامی تشکیل سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں۔ اسی میں دو قومی

Marfat.com

نظریے کی تفہیم اور ہنود و یہود کی دسیسہ کاریاں بھی شامل ہیں اور دوسرے یہ کہ ملکِ پاکستان میں جو تحاریک ایسی ہی غیر دینی بنیادوں پر چلانے کی کوشش کی جارہی ہے ان کی ہلاکت آفرینی سے آگاہ ہو کر اسی اسلامی اخوت کو حرزِ جان بنالیں جس کی تلقین قرآن وسنّت نے کی ہے۔

دو باتیں اور عرض کرنا چاہوں گا۔ پروفیسر صاحب کی کتاب کا مجموعی تاثر کسی صوفی کی تحریر کا سا ہے۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ آپ صرف متقدمین صوفیہ سے لگاؤ رکھتے ہیں، دیگر کو ازرہِ احتیاط ''متصوفین'' قرار دیتے۔ اپنی کتاب ''میزانِ اقبال'' کے ایک مقالے ''کلام اقبال میں عجم کا مفہوم'' میں پہلے علامہ اقبال کے ایک خط بنام حافظ اسلم جیراجپوری کا یہ جملہ نقل کرتے ہیں۔

''تصوّف سے اگر اِخلاص فی العمل مراد ہے تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہوسکتا۔''

پھر علامہ سلیمان ندوی کے نام خط میں اقبال کا یہ جملہ پیش کرتے ہیں۔ ''خواجہ نقشبند اور مجدد سرہند کی میرے دل میں بڑی عزت ہے مگر افسوس کہ یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا۔'' علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے اپنے الفاظ نقل کرنے کے بعد پروفیسر محمد منور مرحوم اپنی رائے اس طرح پیش کرتے ہیں۔ ''گویا تصوف جس سے اخلاص فی العمل مقصود تھا، تفلسف میں کھو گیا ..... حتیٰ کہ قرآنِ حکیم میں علم کلام، فلسفہ اور لُغت ونحو تو رہ گئے مگر خود قرآن غائب ہوگیا۔ (صفحہ 52-53)''

اس وضاحت کی رو سے یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ پروفیسر صاحب قرآن وسنّت کے بارے میں کڑا نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ آپ اپنے مرشد کی 1920-1938 تک کی اس رائے سے بھی متفق نہ تھے جس میں اقبال نے ابن عربی کے لیے نرم گوشے کا انتخاب کرلیا بلکہ پروفیسر صاحب آخر عمر تک ابن عربی کے تفلسف کو (اقبال کی 1915-1920 تک کی رائے کے مطابق) الحاد اور زندقہ ہی سمجھتے رہے۔

دوسری بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پروفیسر صاحب ادب کے علاوہ سائنس، تاریخ، جغرافیے اور علم ہیئت کے بھی ماہر تھے۔ اگرچہ شیخ بن باز کا مقالہ بہت خوب ہے مگر پروفیسر صاحب کی اسی موضوع پر اپنی لکھی ہوئی تحریر خاصے کی چیز ہوتی جس کے لکھنے کا یقیناً انہیں موقع نہ مل سکا۔

صلاح الدین ایوبی

Marfat.com

رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام

حضور نبی اکرم ﷺ سے قبل جتنے بھی انبیاء علیہم السلام تشریف لائے وہ اپنی اپنی قوم کی ہدایت کے لئے تشریف لائے۔ محدود زمانے کے لئے تشریف لائے، مگر آپؐ تمام بنی آدم کے ہادی بن کر افق عالم پر بلکہ آفاق عالمین پر جلوہ فرما ہوئے جبھی تو خدائے تعالیٰ نے آپؐ سے ارشاد کیا کہ

قُل یَا ایّھا النّاس انّی رسول اللّٰہ الیکُم جمیعًا ط (۲/۱۵۸)

''آپ بتا دیجئے اے اولاد آدم میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔'' اور واضح رہے کہ آدم کے جہاں کی کوئی حد نہیں ابھی اسے سینکڑوں دنیائیں مزید آباد کرنا ہیں۔ ہر نئے جہاں میں حضور نبی اکرم ﷺ ہی کی رسالت کارفرما ہوگی۔ خدائے رحمٰن ورحیم نے قرآن کریم میں آپ کو یہی تو خبر دی تھی:

وَمَا ارسلنٰکَ الّا رحمۃً للّعٰلمین

''ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

اس آیۂ کریمہ ورحیمہ میں لفظ عالم یعنی ایک دنیا نہیں آیا، لفظ عالمین آیا ہے جس سے بہت سی دنیائیں مراد ہیں..... جہاں بھی بنی آدم دنیا بسائے گا وہیں نبی اکرم ﷺ کی رسالت وہدایت کو رحمت خداوندی کے طور پر موجود پائے گا۔ حضرت علامہ اقبال نے بجا ہی تو کہا تھا:

ہر کجا ہنگامہ عالم بود
رحمۃ للعالمینی ہم بود
یا زنام مصطفیٰؐ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاش مصطفیٰؐ ست

آپ رحمۃ للعالمین ہیں۔ لہٰذا آپ کی رسالت کا دوسرا نام ہے رحمۃ للعالمینی....

جو وحی نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوئی وہ خود قرآن ہی کے الفاظ میں ہدایت بھی ہے اور رحمت

Marfat.com

بھی ،نور بھی اور شفا بھی۔

فَقَدْ جآء کُم بیّنۃٌ من ربّکُم وھدًی و رحمۃ. (۶/۱۵۷)

''اب تو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے روشن دلیل، ہدایت اور رحمت آ چکی ہے۔''

وَ ننزّلُ من القرآنِ ماھُوَ شِفآءٌ و رحمۃٌ لّلمومنین o (۱۷/۸۲)

''ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں جو ایمان والوں کے حق میں شفاء بھی ہیں اور رحمت بھی۔''

یَا ایّھا النّاس قَدْ جآء کُمْ بُرھانٌ من ربّکم و انزَلنآ اِلیکُم نوراً مّبیناً o

(۴/۱۷۴)

اے لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل آ چکی ہے اور ہم تم لوگوں پر ایک کھلا ہوا نور اتار چکے ہیں۔''

ساتھ ہی یہاں ایک اور آیۃ کریمہ کا ذکر کر دوں، وہ یہ ہے۔

فَالّذین اٰمنوا بہٖ و عزّرُوہُ و نصرُوہُ واتّبَعوا النّورالّتی اُنزِل معہٗ فاؤلٰئک ھُم المفلِحُون o (۷.۱۵۷)

''پس وہ لوگ جو رسولؐ پر ایمان لائے، اس کا ساتھ دیا اس کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ہمراہ، اس کی معیت میں اتارا گیا۔ وہی لوگ ہیں فلاح پانے والے۔''

شفاء، نور، رحمت کے باب میں انزل علیٰ یا الی آیا ہے مگر یہاں ہے انزل معہ اس کی معیت میں نور آیا۔ اس اعتبار سے وحی کے ساتھ ساتھ آپؐ کی سیرت بھی نور قرار پاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآنی اخلاق اور قرآنی مثالی سیرت کا مظہر اتم آپؐ ہی کی ذات تھی، حضرت عائشہؓ کا ارشاد گرامی یہی تو تھا، کَانَ خُلُقُہُ الْقرآن کہ حضور نبی کریم ﷺ کی سیرت قرآن ہی تو تھی،.....اور خدا نے نبی اکرمؐ کو بھی رحمت قرار دیا اور قرآن کو بھی رحمت بتایا۔ اور یہ آیت پہلے عرض کی جا چکی ہے یعنی و نُنزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَاھُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَۃٌ لِّلْمُومِنِیْنَ بحضور نبیٔ اعظمؐ علامہ اقبال نے کیا خوب عرض کیا ہے۔

Marfat.com

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

اور پھر ظاہر ہے کہ جس گھڑی یہ آیت نازل ہوئی:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ○

کہ ''آج ہم نے تمہارے لئے دین مکمل کر دیا اور تمہارے لئے اپنی نعمت کو تمام عطا کر دیا۔ نیز تمہارے لئے دین کے طور پر اسلام کا نام پسند کر لیا''

تو اس گھڑی نبی اکرم ﷺ کی رسالت کے ساتھ ساتھ سیرت بھی مکمل ہو گئی جو سر بسر رحمت تھی، رحمت اتم بن گئی..... اب تا قیامت قرآن کریم اور آپ کی سیرت بنو آدم کی ہدایت کے لئے کافی ہے، بنو آدم کا عالم یہ دنیا ہو یا اس کے علاوہ نو آباد، لاتعداد دنیائیں..... چونکہ آپ کا لایا ہوا قرآن کسی ایک دور اور کسی ایک محدود علاقے یا ایک دنیا کے لئے نہیں بلکہ لامحدود ہے اور اسی طرح آپ کی سیرت بھی، لہٰذا قرآن بھی رحمت تمام اور آپ بھی رحمت تمام۔

انسان کو جن عناصر کے خمیر سے تعمیر کیا گیا تھا اور جن جن اہلیتوں سے اس کو نوازا گیا تھا، ان کا تقاضا یہ تھا کہ اسے ہدایت و تعلیم سے وقتاً فوقتاً نوازا جاتا رہے۔ خدا قادر و مختار ہے، اس نے کائنات میں کسی اور شے کو اپنی شان قدرت و اختیار میں سے کچھ نہ دیا۔ حتیٰ کہ فرشتے بھی اس جوہر سے محروم رہے یہ ''مختاری'' وہ امانت تھی جو اللہ نے زمینوں آسمانوں پہاڑوں اور ہر شے کو دکھائی، کسی میں یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ اس بار امانت کو اٹھا لے، مرضی اور اختیار کا بار اپنے سر لینا اور پھر اس امانت کو ٹھیک سے اس کے ہر تقاضا کے مطابق کام میں لانا کٹھن معاملہ تھا۔ آدم نے یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی۔

کائنات کی باقی ہر شے قانون فطرت کی تابع ہے۔ کیا نبات اور کیا حیوان اور کیا فرشتگاں..... ہر شے اور ہر وجود قدرت کے ضابطے کے مطابق مصروف عمل، کوئی ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتا، مگر آدم کی شان ہی نرالی ٹھہری، اس کو نہ فقط دانش و عقل کی فراوانی سے مزین کیا گیا بلکہ مرضی و ارادہ سے بھی مسلح کر دیا گیا۔

خدا نے کائنات کی ہر شے کے اسرار اور خصائص آدم پر منکشف کر دیئے اور اسے ان پر

Marfat.com

متصرف کر دیا۔اب واضح رہے کہ اس شان اور اس آن کا وجود اگر صرف اس کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے تو بالکل خطرہ تھا کہ وہ اپنی مرضی اور ارادے کا غلط استعمال بھی کرلے گا وہ اپنی اہلیتوں کو ناجائز طور پر بھی استعمال میں لائے گا،ممکن تھا کہ وہ نافرمانی اور معصیت کا مرتکب ہو۔ ممکن تھا کہ اس کا ذوق پرستش بہت سے خدا گھڑ لے۔ پودے، حیوان، فرشتے ازروئے فطرت گناہ نہیں کر سکتے ،وہ نافرمان نہیں ہو سکتے ،وہ باختیار نہیں،لہٰذا ذمہ دار نہیں، چنانچہ گناہ گار بھی نہیں، گناہ گار تو مختار ہی ہو سکتا ہے۔

آدم کا ٹھیک ٹھیک متوازن و متناسب انداز میں زندگی بسر کرنا اس کی اہلیتوں کے تحفظ کے لئے بھی ضروری تھا اور ترقی کے لئے بھی، غلط روی اور حدود شکنی یعنی بے توازن زندگی آدم کی آدمیت کے لئے نقصان دہ تھی۔ یہ باتیں اسے روبہ زوال کر سکتی تھیں۔ چنانچہ خدائے تعالیٰ کی یہ عین رحمت تھی کہ اس نے بنو آدم کو راہ راست پر رکھنے کے لئے لفظی وحی بھی بھیجی اور عملی وحی بھی۔ عملی وحی سے مراد انبیاء علیہم السلام کی سیرت طیبہ ہے، وہ لفظی وحی قرآن کی صورت میں کمال کو پہنچی اور عملی وحی سیرت مصطفےٰ ﷺ کے روپ میں اتمام پذیر ہوئی۔اسی کو قرآن کریم نے اتمام نعمت قرار دیا ہے۔

جو آدمی جتنا حکم خداوندی کے تابع رہا اتنا ہی بہتر انسان بنا،اور جو محض جبلتوں کا کہا مانتا رہا وہ حیوانی سطح سے اوپر نہ جا سکا، وہ دوپایہ تو رہا آدمی نہ بن سکا، خواہ کتنا ہی عالم وفاضل تھا۔

حیوانوں کی انواع میں درجات حیوانی کے مابین زیادہ فرق نہیں پایا جاتا۔ ایک ہاتھی دوسرے ہاتھی سے کچھ تو مختلف ہو سکتا ہے مگر سراسر نہیں۔ ایک شیر یا گیدڑ ہزاروں شیروں یا گیدڑوں کے برابر نہیں ہو سکتا۔مگر ایک انسان جو محض حیوانی سطح پر ہو اس سے وہ انسان جو حکم خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

لیس شیٌ خیراً مِّن اَلفِ مثلہٖ الّا الانسانَ

کوئی شے اپنی جیسی ہزار اشیاء کے برابر نہیں ہو سکتی سوا آدم کے۔''

یعنی ایک آدمی جو زیور آدمیت سے آراستہ ہو وہ جو ہر آدمیت سے محروم ہزاروں کے برابر ہوتا ہے۔ہمیں معلوم ہے کہ اس زمانے میں عربوں کی گنتی ہزار پر ختم ہو جاتی تھی۔اس اعتبار سے ہم حضور اکرم ﷺ کی حدیث کے یہ معنی لے سکتے ہیں کہ ایک آدمی لاتعداد افراد کے برابر ہو سکتا ہے......

Marfat.com

آدم خود اپنا خالق نہیں، لہٰذا اسے معلوم نہیں کہ اسے کیا ضوابط و اسالیب سچ مچ انسان بنا سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ خدا ہی خالق ہے، وہی جانتا ہے کہ اس کے لئے کیا مفید ہے اور کیا مضر، چنانچہ جو افراد خدا پر ایمان لائے اور حکم خداوندی کے مطابق پروان چڑھے خدا کے نزدیک برتر قرار پائے۔

حضور نبی کریم ﷺ کی حدیث شریف ہے:

لیسَ شیٌ اکرَمُ علی اللّٰہ مِن المؤمِنِ

''صاحب ایمان شخص سے بڑھ کر اللہ کے نزدیک کوئی شے مکرم نہیں۔''

صحیح معنوں میں مومن ہونا ہی انسان ہونا ہے، یہی انسان سازی کا فریضہ جملہ انبیائے کرام علیہم السلام ادا کرتے رہے، مگر بنو آدم بار بار اپنی حس حیوانی کے تابع ہو کر قرآن و حدیث کی رو سے مقرر کردہ انسانی حیثیت کھو بیٹھتے رہے، یہی باعث ہے کہ جب رحمت اتم ﷺ کی خدمت میں غزوۂ احد کے موقع پر التجا کی گئی کہ کفار و مشرکین کے حق میں بددعا فرمائیں تو آپؐ نے بددعا کے بجائے یہ دعا فرمائی:

اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعلَمُوْنَ o

''اے میرے رب میری قوم کو صحیح راہ پر ڈال دے، یہ لوگ تو جانتے ہی نہیں کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔''

صاف ظاہر ہے کہ جب وہ لوگ حیوانی سطح پر جی رہے تھے تو آپؐ ان کے لئے بددعا کیوں فرماتے، یہی کیفیت طائف میں جلوہ گر ہوئی۔ جب آپؐ زخمی ہوئے، سر کا خون پاپوش تک چلا گیا، تو خادم نے التجا کی، آپؐ اہل طائف کے حق میں بددعا فرمائیں۔ آپؐ نے ارشاد کیا، نہیں، انھی لوگوں سے آگے چل کر بڑے بڑے صاحب ایمان افراد پیدا ہوں گے، حضور نبی اکرم ﷺ کو کس قدر یقین تھا کہ وہ لوگ قرآن سے اور حضورؐ کی رسالت کے مفہوم سے اور سیرت طیبہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہیں گے۔

عہد بعہد اور درجہ بدرجہ انبیاء علیہم السلام ہدایت و اصلاح کا فریضہ ادا فرماتے رہے، مگر اولاد آدم اپنی ہوس کے تقاضاؤں کے باعث ہدایت سے منہ موڑتی رہی یا ہدایت کی صورت مسخ کر دیتی رہی۔ کبھی ایسی آزادیاں حاصل کر لیں جو احکام خداوندی نے نہ دی تھیں، کبھی ایسی پابندیاں اپنے اوپر عائد کر لیں جو احکام خداوندی نے عائد نہ کی تھیں..... اسی طرح جھوٹ اور سچ کا آمیزہ تیار ہوتا

Marfat.com

رہا۔شر اور خیر گڈ مڈ ہو جاتے رہے حرام و حلال خلط ملط کر دیئے جاتے رہے۔

......آنحضرت ﷺ کی شریعت نے ہر بات واضح کر دی۔حرام و حلال کا امتیاز کھول کر بتا دیا۔غلط بندھنوں اور اوہام سے نجات بخشی......گویا معیاری زندگی کے آداب عطا کر دیئے اور وہ دین اور وہ اسلوب حیات ارزانی فرمایا جسے اللہ نے اولاد آدم کے لئے پسند کیا تھا،

وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا o

آدم کو صحیح معنی میں آدم بننے کے طریق سے آگاہ فرمایا۔اللہ کی سب سے بڑی رحمت تھی اور اس رحمت کا نمونہ کامل اور مظہر اتم حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس تھی ۔گویا دین اسلام سارا رحمت ہے،انسانیت کا اعلیٰ اور حقیقی درجہ اسی دین کی پیروی سے میسر آسکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ آدمی معاشرتی وجود ہے وہ اپنے کمال کو معاشرتی زندگی کے بغیر نہیں پہنچتا اور بہترین معاشرتی زندگی وہی ہے جس میں سب افراد ایک دوسرے کے لئے معین و مددگار ہوں۔ جبھی تو نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

خیر النّاسِ انفعهم للنّاس

''لوگوں میں بہترین وہ فرد ہے جو لوگوں کے حق میں سب سے زیادہ نفع رساں ہے۔''

اب دیکھئے کہ یہ نفع رسانی گھر سے شروع ہوتی ہے۔چنانچہ حضورؐ نے فرمایا:

رَضَاءُ الرّب فی رِضَا الوالدَینِ و سخطه' فی سخطِهِمَا.

''خدا کی خوشنودی والدین کی خوشنودی میں اور خدا کی ناخوشنودی والدین کی ناخوشنودی میں مضمر ہے۔''

گھر کے بعد ہمسائے کا درجہ ہے۔حضورؐ نے فرمایا

لایدخل الجنّةَ من لا یامن جاره بوائقه'

''وہ شخص جس کی شرارتوں سے اس کا ہمسایہ مامون نہیں وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔''

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی زبانی حضور اکرم ﷺ کا ارشاد مروی ہے،

مازال جبریل یوصینی بالجار حتّٰی ظننت انّه یورّثه'

''مجھے ہمسائے کے بارے میں جبریل نے اتنی تلقین کی میں سمجھنے لگا کہ شاید وہ ہمسائے کو وارثوں میں شامل کر دے گا۔''

Marfat.com

حضرت عمرؓ کی زبانی آپ کا ارشاد مروی ہے۔

خیرُ بیوتکم بیتٌ فیه یتیمٌ مکرّمٌ

''تم میں سب سے بہتر گھر وہ ہے جس میں یتیم معزز طریقے سے رہتا ہے۔''

انسانی سوسائٹی گھر سے شروع ہوتی ہے اور پھر ہمسائے اور ہمسائے کے دم سے بستیاں اور شہر آباد ہوتے ہیں۔ اگر افراد سب ایک دوسرے کے حق میں رحیم ہیں، تو وہ معاشرہ واقعی سکھی معاشرہ ہے۔ معاشرتی علوم کے ماہرین غور تو فرمائیں کہ کنبے اور ہمسائے کے حقوق کا یوں پاس ملحوظ خاطر ہو تو یہ دنیا جنت بنتی ہے یا نہیں۔ حضورؐ کا ارشاد عام ہے کہ

مَنْ لا یَرْحَمَ فی الارضِ لایَرحَمُہٗ من فی السّماء

''جو زمین والوں پر رحم نہیں کرے گا، آسمان والا اس پر رحم نہیں کرے گا۔''

گویا اسلامی تعلیمات کا لب لباب ہے۔ حکم خداوندی کے اتباع اور سیرت مصطفویؐ کی روشنی میں صحیح معنوں میں انسان بننے کی انتھک کوشش کرتے رہنا..... اس کے لئے لازم ہے رزق حلال کمایا جائے، نبی اکرم ﷺ نے اس مرد مزدور کا ہاتھ جس پر محنت کرتے کرتے گٹے پڑ گئے تھے چوم لیا تھا..... یہ کہ دوسروں کے حقوق کا احترام کیا جائے، خیر کے جملہ امور کے ساتھ حتی الامکان تعاون کیا جائے، شر کی راہیں جہاں تک ہو سکے مسدود کی جائیں۔ اپنی کمائی میں مساکین کا حصہ ان کے حق کے طور پر تسلیم کیا جائے اور دیا جائے، مساکین میں بھی سب سے اول اپنے اقرباء کا خیال رکھا جائے، حضورؐ کا ارشاد ہے کہ

افضل الصّدقة الصّدقةُ عَلٰی ذِی الرّحمِ الکاشِح

''افضل ترین وہ صدقہ ہے جو اس قریبی رشتہ دار کو دیا جائے جو عداوت اور دشمنی رکھتا ہو۔''

یہ کہ آدمی کا آدمی کی حیثیت سے احترام ملحوظ رکھا جائے۔ اسلام نے آدمی کے لئے معیار عظمت نسب، نسل، خاندانی وجاہت، شان وشوکت، مال ومنصب وغیرہ کو قرار نہیں دیا، بلکہ ارشاد ربانی ہے،

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ

''بیشک اللہ کے نزدیک تم میں سے معزز ترین وہ شخص ہے جو پاکباز ترین ہے۔''

جو مستوجب سزا امور سے باقیوں کے مقابل دور تر رہتا ہو۔ جھیتو حضور پرنور ﷺ کا قول

Marfat.com

گرامی ہے:

اُتونی باعمالِکم ولا تاتونِی بأنسابِکم ۝

''میرے پاس اپنے نسب نامے مت لاؤ، مجھے اپنے اعمال نامے دکھاؤ۔''

اسلام نے اس طرح ہر فرد آدم کو اپنے اعمال کا ذمہ دار بنایا، اور حسن عمل کے مطابق اس کا درجہ آدمیت قرار دیا۔ اس آدم ساز معیار نے آدم کو ہر جھوٹی نمائش اور ہر فانی سروسامان کو زیور عظمت کے طور پر ساقط الاعتبار کر دیا، بقول حضرت علامہ:

آدمیت احترام آدمی!
باخبر شو از مقام آدمی!

اور ہر تکلیف سے بری اور ہر نمائش کے سروسامان سے آزادی کا کامل نمونہ اور ہر خیر کا تا قیامت اسوۂ حسنہ ذات ہے نبی کریم ﷺ کی جنہوں نے فرمایا تھا:

''الفقر فخری''

درویشی میرا نشان فخر ہے۔''

زندگی کو اس قدر آسان بنا دینے والی ذات کتنی مہربان اور کتنی رحیم ہے، بلکہ رحمت تمام۔

وصلّی اللّٰہ تعالیٰ علٰی خیر خلقہٖ محمّدٍ و علٰی آلہٖ واصحابہٖ اجمعین ۝

Marfat.com

الامانت سے الامین تک

واضح ہے کہ حضور اکرم ﷺ عبد بھی تھے اور رسول بھی، آپ کا مقام نبوت آپؐ سے خاص ہے اس لئے کہ آپ خاتم النبین ہیں۔ آپ کا مقام عبدیت بھی آپ ہی سے خاص ہے اس لئے کہ آپ ''الامین'' ہیں آپ کو آخری رسالت اور کامل بلکہ اکمل رسالت سے خدا نے نوازا مگر آپ کو الامین کا خطاب بندوں نے دیا اور وہ بندے تقریباً سارے کافر مشرک تھے..... ان لوگوں نے آپؐ کی امانت کا اقرار پہلے کیا، اللہ نے رسالت بعد میں عطا فرمائی۔ قاضی عیاضؒ لکھتے ہیں:

"فَكَانَ صلى اللّٰهُ عليه وسلّم آمَنَ النّاس و أَعْدَلَ النّاس واَعفَّ النّاس و اَصْدَقَهُمْ لَهجَةً منذُ كَانَ اعْتَرفَ لَهُ بذلكَ حادّوهُ وعداهُ وَكَانَ يُسمَّى ألامين بما جَمعَ اللّٰهُ فِيْهِ مِن الاخلاق الصّالِحة.

یعنی حضور اکرم ﷺ سب سے بڑھ کر امین، سب سے بڑھ کر عادل، سب سے بڑھ کر عفیف اور سب سے بڑھ کر صادق القول تھے اور اس بات کا اعتراف تو ان کے مخالفوں اور دشمنوں نے بھی کیا اور آپؐ کو نبوت کے منصب پر فائز ہونے سے قبل ''الامین'' کا نام دیا جاتا تھا، اور بقول ابن اسحاق آپ کو الامین آپؐ کے ان جملہ اخلاق صالحہ کے باعث کہا جاتا تھا جو اللہ نے آپؐ کی ذات میں جمع کر دیئے تھے۔

یہیں قاضی عیاض نے اس واقعہ کی جانب بھی اشارہ کیا جو مفسرین کی اکثریت کے یہاں مذکور ہے یعنی حجر اسود کو کعبے میں کعبے کی مرمت کے بعد دوبارہ نصب کرنے کا واقعہ..... جب قریش آپس میں لڑ پڑے تھے، کیونکہ ہر قبیلہ حجر اسود کی تنصیب کا فخر و شرف حاصل کرنے میں پہل کرنا چاہتا تھا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا تھا کہ اگلے روز جو شخص سب سے اول حدود کعبہ میں داخل ہو وہی حجر اسود نصب کرے، چنانچہ از سر نو تعمیر ہونے والے کعبے کی تکمیل اور تفضیلی لوح نصب کرنے کی خاطر

Marfat.com

سب سے اول آپؐ ہی حدود کعبہ میں داخل ہوئے، آپؐ ہی کو تو تعمیر رسالت کی آخری خشت بننا تھا، بہر حال جب حضورؐ کو قریش نے دیکھا تو پکار اٹھے،

"هذا محمدٌ، هَذآ الامين، قدرَضُينا به"

(یہ تو محمدؐ ہیں۔ یہ تو الامین ہیں، ہم ان کے باب میں رضامند ہیں)۔

آپ نے قاضی عیاض کے الفاظ ملاحظہ فرمائے کہ بقول ابن اسحاق،

"كانَ يَسمَّى الامين بما جَمَعَ اللّٰهُ فِيهِ مَنِ الاخلاقِ الصَّالحَةُ"

یہاں "الامین" سے مراد عام صاحب امانت نہیں، فقط معاملات اور لین دین کے ضمن ہی میں امانت دار مقصود نہیں بلکہ اپنے جملہ خصائل وآداب، مسائل واعمال میں امانت دار،

ہم عام طور پر کسی کو امین کہتے ہیں تو ہمارے پیش نظر لوگوں کے ساتھ معاملات میں امانت داری ہوتی ہے، مگر ابن اسحاق اور قاضی عیاض نے جملہ اخلاقِ فاضلہ وصالحہ کے یکجا ہونے کو امانت داری قرار دیا ہے..... ایک آدمی معاملے کا کھرا ہے، مگر ویسے تند مزاج ہے، بداعمال ہے، بدزبان ہے، مغرور ہے، علیٰ ہذا تو اسے امین نہیں کہا جائے گا گویا امانت کا تعلق پوری شخصیت کے جملہ احوال واعمال سے ہے، زندگی کی ہمہ جہتی طرز وروش سے ہے۔

حضور اکرمؐ کے حسن کردار اور کمال امانت کا عالم یہ تھا کہ ابوجہل بھی نہیں کہتا تھا محمدؐ جھوٹ بولتے ہیں ہاں وہ اس پیغام کی تردید کرتا تھا جو آپ پیش فرماتے تھے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے۔

"قال ابو جهل للّنبيّ إنّا لا نكذِّبُكَ ولكنْ نكذِّبُ مَا جئتَ به .....

ابوجہل کو یہ بات پسند نہ تھی کہ آقا اور غلام بھائی بھائی ہیں۔ یا عرب اور عجم بحیثیت انسان برابر ہیں۔ یہ کہ برتر وہ ہے جو اتقا میں برتر ہو، خواہ وہ حبشی ہی کیوں نہ ہو وعلیٰ ہذا اسی امر پر قرآن کریم کی آیۂ ذیل دلالت کرتی ہے۔

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِى يَقُوْلُوْنَ. فَاِنَّهُمْ لَايُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ○ (۶/۳۳. انعام)

ہمیں معلوم ہے کہ یہ جو کچھ کہتے ہیں وہ آپ کو رنج پہنچاتا ہے یہ لوگ آپ کو تو نہیں جھٹلاتے یہ ظالم تو اللہ کی نشانیوں ہی سے انکار کر دیتے ہیں۔

Marfat.com

یہاں یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہئے کہ رسالت کا در تو بند ہو چکا، لہٰذا اب عباد الٰہی کے لئے عبدیت کا مقام اعلیٰ اور بلند ترین فقط امانت ہے۔ اللہ پر ایمان لانے والا جو شخص جتنا ''امین'' ہوگا اتنا ہی گویا حضور اکرم ﷺ سے قریبی نسبت کا مالک ہوگا اور اتنا ہی زیادہ خدا کا محبوب ہوگا،

حضرت خواجہ عبداللہ انصاری فرماتے،

''......وبدانید کہ بعد از ایمان و معرفت بندہ راہیچ صفت بالاتر از امین بودن نیست و بعد از کفر صفتی، بدتر و پست تر از خیانت نیست..........امانت رکن دین است وکمال توحید وصفت پیامبران وفرشتگان۔''

ایمان کے بعد جس طرح کوئی صفت بلند تر از امانت نہیں اسی طرح کفر کے بعد کوئی صفت پست تر از خیانت نہیں۔ امانت دین کا تھم ہے، کمال توحید اور پیغمبروں اور فرشتوں کی صفت ہے۔

سورۃ شعرا میں ہے:

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ ن الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْقَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ ۝ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّی لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوااللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝

اسی طرح حضرت ہودؑ نے اپنی قوم عاد سے خطاب کر کے فرمایا:

اِنِّی لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ فَاتَّقُوْا اللّٰهَ وَ أَطِيْعُوْنِ ۝

اسی طرح حضرت صالحؑ نے اپنی قوم ثمود سے فرمایا:

اِنِّی لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ فَاتَّقُوْا اللّٰهَ وَ أَطِيْعُوْنِ ۝

حضرت لوطؑ نے اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے یہی فرمایا: اِنِّی لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ

حضرت شعیبؑ نے اصحاب الایکہ سے فرمایا: اِنِّی لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ

کسی رسول نے اپنے بارے میں الرسول کا لفظ استعمال نہیں کیا، اسی طرح کسی بھی رسول نے اپنے ضمن ''الامین'' کا کلمہ نہیں کہا۔ میرا مطلب ہے کسی بھی رسول نے ''انی لکم الرسول الامین'' نہیں کہا اس لئے کہ الرسول اور الامین آپؐ ہی کو کہلانا تھا۔

اور جب رسل کا تذکرہ ہو چکا تو قرآن کے باب میں ارشاد ربانی ہوا۔

''وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ

''اور یہ قرآن ہے رب عالمین کا اتارا ہوا، جسے لے کر اترا روحِ امین''

Marfat.com

تو ہم نے دیکھا کہ خدا کے پیغمبروں نے اپنے اپنے دور میں اور اپنے اپنے معاشرے میں اپنے آپ کو صاحب امانت یعنی ''امین'' کہہ کر پیش کیا، گویا ہر پیغمبر اپنے معاشرے میں جملہ فضائل کی صفات کاملہ کا مظہر اتم تھا بالفاظ دیگر جس طرح ہر رسالت کو آخر کار ختم الرسل کی رسالت میں آ کر اتمام پذیر ہونا تھا اسی طرح امانت کو ''الامین'' کی ذات میں آخری حد کمال کو پہنچنا تھا۔

''اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا ۙ

''اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانات ان کو پہنچا دو جو ان کے اہل ہیں۔''

کیا اس آیت میں امانتوں سے مراد اشیاء نقدی وغیرہ کی امانتیں ہیں جو ان کے مالکوں کو واپس کر دی جانی چاہئیں ...... مگر یہاں امانت لوٹانے کے بجائے امانت ادا کرنے کا حکم ہے اور اھلھا کا لفظ آیا ہے جو وسیع معانی کا مالک ہے،

ہم پہلے قاضی عیاض کے الفاظ میں یہ جان چکے ہیں کہ امانت سے مراد جملہ فضائل اخلاق ہیں ...... موجودہ دور کے بھی مفسرین کی اکثریت نے یہی مفہوم قبول اور بیان کیا ہے۔ یہاں فقط سید قطب صاحب کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

''وَمِنْ ھٰذِہِ الاِمَانَاتِ ...... الداخلیّۃ فِی ثنایا ما سبق ...... امانۃ التعّامُلِ مع النّاس ورِّد اَمَانَاتِھِم اِلَیھِم، امانۃ المعاملات والودائع المادّیۃ و اَمانۃ النصیعۃ للّراعی والرَّعیۃ و امانۃ القیام علَی الاطفالِ الناشیۃِ و أَمانۃُ المحافظۃِ علیٰ فرماتِ الجماعۃ وامو الھا و ثغرھا ...... و سائِرمَا یحبوۃُ المنھج الرّبّانیّ مِنَ الواجباتِ والتکالیف فی کل مجالی الحیاۃِ علیٰ وَجْہِ الإجمالِ، فھُو مِن الأمانَاتِ الّتی یأمُرُ اللّٰہُ أَنْ تُؤَدّی، و یجملھَا النّصُ ھذا الإجمالِ۔

''اور ان امانات میں شامل ہیں ...... داخلی امانات جیسا کہ سابق بیان کے دوران میں عرض ہوا لوگوں کے معاملات باہمی ان کی طرف ان کی امانتوں کے لوٹائے جانے کا مقصد ہے لین دین اور برتاؤ کی امانت، مادی امانتیں اور حاکم و رعیت کی خیر خواہی کی امانت، بال بچے کی پرورش کا ذمہ لینے کی امانت، سوسائٹی کے جملہ ناموس، اموال اور حدود کے تحفظ کی امانت اور دوسری ہر شے جو خدائی لائحہ کی رو سے ان واجبات و فرائض کو شامل ہے جس کا تعلق مجملاً زندگی کے کسی بھی میدان عمل سے ہے، وہ ہر شے ان امانات میں سے جن کے ادا کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے، یہ آیت (تو

Marfat.com

دوالامانات) اسی مضمون کا اختصار واجمال ہے۔

واضح ہوا کہ "امانت" پوری زندگی کے ہر شعبے اور ہر عمل کو محیط ہے حضرت شہاب الدین سہروردی کچھ اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں وہ صوفیہ اصفیاء کی مجالست وصحبت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"......کہ حکمت بالغہ الٰہی بر مقتضائی مشیت ازلی چندیں خواص شریفہ و اسرار لطیفہ از آداب واخلاق واحوال و معارف در نفوس وقلوب بنی آدم تعین کردہ است وایشاں رابدان مستودع امانات خود گردانیدہ وصحبت راطریق استیفاء آں ساختہ تا بواسطہ مجالست و مصاحبت آں امانات باہل خود رسد، إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ.

"اللہ کی حکمت بالغہ نے مشیت ازلی کے اقتضاء کے مطابق بہت سی اعلیٰ خاصیتیں اور نازک ولطیف اسرار جن کا تعلق آداب اخلاق، احوال و معارف سے ہے بنی آدم کے نفوس وقلوب میں جمع کر دی ہیں اور انہیں اس طرح اپنی امانتوں کا ودیعت دار قرار دے رکھا ہے اور صحبت (اصفیا واز کیا کی صحبت) کو ان امانات کے بروئے کار آنے کا طریق بنایا ہے تا کہ مجالست اور صحبت کے باعث وہ امانات (کمال کو پہنچ کر) ان تک پہنچ جائیں جو ان کے اہل ہیں۔" إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ

اللہ نے ہر قوم میں پیغمبر بھیجے تا کہ وہ انسانوں کی تربیت اس طرح کریں کہ ان میں ودیعت کردہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں پروان چڑھ سکیں اور وہ اپنے حقوق وفرائض سے بخوبی آگاہ ہو کر اپنے اختیار وارادہ کو بہترین طریق سے کام میں لاسکیں۔ گویا بات یوم آفرینش کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ جب "الامانت" زمینوں، آسمانوں اور پہاڑوں کو پیش کی گئی مگر انہوں نے اس کے متحمل ہونے کی حامی نہ بھری، وہ اس سے ڈر گئے مگر آدمی نے اس بار کو اٹھا لیا، یقیناً آدمی بڑا ہی ظالم وجاہل ہے۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ

Marfat.com

اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۙ (۳۳/۷۲)

حضرت شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں رقمطراز ہیں۔

امانت سے مراد مکلف ہونے کی ذمہ داری ہے (اختیار و ارادہ کی متولیت) اس طرح پر کہ اطاعت اور نافرمانی احکام سے ثواب یا عذاب کا استحقاق ہو سکے اور آسمانوں اور زمین پر ان کے پیش کرنے کے معنی ہیں کہ ان استعدادوں کا اندازہ کیا گیا کہ ایسے کاموں کے کرنے یا نہ کرنے کا مادہ ان میں ہے یا نہیں ہے اور ان کے انکار کرنے سے یہ غرض ہے کہ ان کی طبیعت میں اس کام کی لیاقت اور استعداد نہ تھی اور یہ جو فرمایا کہ آدمی نے اس امانت کو برداشت کر لیا اس سے مراد یہ ہے کہ اس میں ان امور کی انجام دہی کی ذاتی صلاحیت تھی، میں کہتا ہوں اس معنی کے لحاظ سے گویا حکم سابق کی علت ہے اس لئے کہ ظالم اسی کو کہتے ہیں کہ جس میں انصاف وعدل کی قابلیت ہو، لیکن پھر بھی انصاف نہ کرے اور جہول اس کو کہتے ہیں کہ باوجود قابلیتوں کے ناواقف رہے، علاوہ آدم کے بعض چیزیں عالم اور عادل ہیں کہ ظلم اور جہل کا ان تک گذر نہیں ہے جیسے کہ فرشتے اور بعض چیزیں ایسی ہیں کہ نہ وہ عالم اور عادل ہیں اور نہ ان میں علم وعدل کا مادہ ہے جیسے چہار پائے...... مکلف ہونے کے قابل وہی چیز ہو سکتی ہے جس کا کمال بالقوہ ہو نہ کہ بالفعل،

انسان کی جملہ صلاحیتوں اور قابلیتوں کے کمال کا مظہر اتم حضور اکرمؐ کی ذات تھی یعنی انہوں نے "الامانت" کو بطریق احسن ان تک پہنچا دیا جو اس کے اہل تھے، چنانچہ وصال سے کچھ ہی مدت پہلے آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے اصحاب سامعین سے فرمایا:

"وَاَنْتُمْ تُسْأَلُوْنَ عَنِّی لِمَاذَا اَنْتُمْ قَائِلُوْنَ؟ قَالُوا نشهد اَنَّكَ قَدْ اَدَّيْتَ الْاَمَانَةَ و بَلَّغْتَ الرِّسالة و نَصَحْتَ، فقالَ رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلّم بِاَصْبَعِهٖ السَّبَابة يَرْفَعُهَا اِلَى السّماء وَيَنكُتُهَا الى الناس اَللّٰهُمَّ اَشْهَدْ، اَللّٰهُمَّ اشهَدْ، اَللّٰهمّ اشهَدْ.

اور اے لوگو تم سے (خدا حضور) میرے بارے میں پوچھا جائے گا، بتاؤ تم کیا جواب دو گے، لوگوں نے جواب دیا کہ ہم اس بات کی شہادت دیں گے کہ آپ نے امانت پہنچا دی اور آپ نے حق رسالت ادا فرما دیا اور ہماری خیر خواہی فرمائی۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے اپنی انگشت شہادت آسمان

108624

Marfat.com

کی جانب اٹھائی اور لوگوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تین مرتبہ ارشاد

فرمایا خدایا گواہ رہنا، خدایا گواہ رہنا خدایا گواہ رہنا۔

گویا رسول اللہ ﷺ نے وہ امانت اس امت کے سپرد فرمادی جسے خدا نے ''خیرامۃ'' قرار دیا ہے۔ سب سے بہتر امت، اس کیفیت کی مولانا حالی نے کیا خوب تصویر کشی فرمائی ہے:

جب امت کو سب مل چکی حق کی نعمت
ادا کر چکی فرض اپنا رسالت!!
رہی حق پہ باقی نہ بندوں کی حجت
نبیؐ نے کیا خلق سے قصد رحلت
تو اسلام کی وارث اک قوم چھوڑی
کہ دنیا میں جس کی مثالیں ہیں تھوڑی

مگر کیا آج یہ امت اپنا فرض ادا کر رہی ہے؟ کیا یہ اللہ کی امانت کا تحفظ اس طرح کر رہی ہے جس طرح اس کا حق تھا؟ آج باطل نظریات کا فروغ عام ہے، وہ نظریات جو آدم کی اعلیٰ صلاحیتوں کو مسخ کر رہے ہیں اور اس طرح ازلی امانت میں خیانت ہو رہی ہے۔ ہم حق بات کہتے وقت کبھی سرمایہ داری کے حامیوں سے ڈرتے ہیں کبھی اشتراکیت کے حامیوں سے لرزتے ہیں، گویا رسول اللہ ﷺ نے جب تن تنہا تبلیغ کا آغاز فرمایا تو کبھی اس دور کی ایک (سلطنت) کے سربراہ قیصر سے مشورہ لیتے تھے اور کبھی دوسری (ریاست) کے سربراہ کسریٰ سے مشورہ لیتے تھے۔ حاشا وکلا، قیامت، کے روز ہم حضور اکرم ﷺ کو کیا منہ دکھائیں گے۔ قرآن کا واضح انتباہ موجود ہے۔

"فَكَيْفَ اِذَا جِئنا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَجِئنا بِكَ عَلٰى هٰؤُلَآءِ شَهِيْداً

اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک ایک گواہ حاضر کریں گے اور ان لوگوں (امت اسلامیہ) پر آپ کو بہ طور گواہ پیش کریں گے۔

حضرت علامہ نے جبھی تو خدا کے حضور فریاد کی تھی

مکن رسوا حضور خواجہ مارا!!
حساب نا ز چشم او نہاں گیر!!

.....

Marfat.com

Marfat.com

حصّہ اوّل

علمِ مسلم کامل از سوزِ دل است

Marfat.com

Marfat.com

قرآنِ حکیم کا بارِ امانت

کائنات میں ہر شے حکمِ خداوندی کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ ہر ایک کے عمل کا اسلوب مقرر ہے اور ہر ایک اپنے طور وطرز کے مطابق مصروف ہے۔ ہر شے کا عمل اور ہر شے کی یہ مصروفیت چونکہ عین امرِ الٰہی کے اتباع میں ہے اس لیے ہر ایک عمل اس کی عبادت بھی ہے گویا ذرے کے حقیر ترین جز سے لے کر بڑے سے بڑے آفتاب تک جو وجود بھی ہے مصروفِ ذکرِ خدا ہے اور سرگرمِ عبادتِ الٰہی.....اس حقیقت کی طرف قرآن ہماری توجہ طلب کرتا ہے۔

ترجمہ ''کوئی شے ایسی نہیں جو حمد کے ساتھ تسبیح خدا میں مصروف نہ ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ تم ان کی تسبیح پہچانتے اور سمجھتے نہیں''۔

ہم اینٹ پتھر خشک لکڑی وغیرہ کو بے جان شے جانتے ہیں۔ قرآن کی رو سے ایک ذرہ بھی بے جان نہیں ہے۔ ہر ذرے میں حرکت مضمر ہے اور آج تو سائنس وہاں پہنچ گئی ہے جہاں ذرے کو ایک جیتا جاگتا وجود تسلیم کیے بغیر چارۂ کار ہی باقی نہیں رہتا۔ ہر شے تحلیل ہوتے ہوئے آخر حرکت یا برقیہ رہ جاتی ہے۔

علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں بجا فرمایا تھا کہ کائنات کا اَت اور سَت روح ہے اور ظاہر ہے کہ روح سے مراد جماد نہیں۔ سکون اور عدم حرکت نہیں بلکہ روح سے مراد ولولہ، تپش، بے سکونی اور اضطراب ہے۔ ہماری دنیا بظاہر بے جان ذرے سے شروع ہوتی ہے۔ ذرات ہی کا ٹھوس اجتماع زمین ہے، پہاڑ ہیں۔ اسی اجتماع میں ذرات سے نباتات یعنی ہر قسم کی گھاس، سبزیاں، جھاڑیاں، بیلیں اور درخت پھوٹتے ہیں۔ نباتات وحیوانات سے آگے آدمی کی منزل ہے۔

نباتی کائنات متحرک ہے مگر حس اور شعور سے عاری۔ حیواناتی دنیا حس اور شعور کی مالک ہے مگر اپنے باحس اور باشعور ہونے سے آگاہ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حیوانی دنیا خود آگاہ نہیں۔ حیوان اپنا تجزیہ نہیں کر سکتے۔ حیوان بااختیار نہیں۔ ہر نوع اپنی نوع کی حدود میں مقید ہے۔ کوئی نوع حیوان اپنی خصلت بدل کر دوسری نوع کی خصلت اختیار کرنے پر قادر نہیں۔ گیدڑ گیدڑ ہے۔ وہ

Marfat.com

گدھا نہیں بن سکتا۔ گدھا گدھا ہے وہ اونٹ نہیں بن سکتا۔ اونٹ اونٹ ہے وہ گھوڑا نہیں بن سکتا۔ نہ جسماً نہ طبعاً۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

غرض جو حیوان جہاں ہے اپنی نوع کے اعتبار سے قابلِ اعتماد ہے۔ وہ اپنی نوعی جبلت کے تابع ہے اور اسے یہ بھی شعور نہیں کہ وہ کسی قانونِ فطرت کے زیرِ فرمان جی رہا ہے۔ حیوان کی زندگی کو اس کی جبلت راہ بھی دکھاتی ہے، حوصلہ بھی دیتی ہے، پناہ بھی عطا کرتی ہے، ڈراتی بھی ہے کھلاتی پلاتی بھی ہے اور ان سے افزائشِ نسل بھی کراتی ہے۔ بظاہر آدمی بھی ایک حیوان ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہ دو پاؤں پر چلنے والا جانور ہے۔ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> ترجمہ ''اللہ نے تمام جاندار پانی سے پیدا کیے۔ ان میں وہ بھی ہیں جو پیٹ کے بل چلتے ہیں یعنی رینگتے ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جو دو پاؤں پر چلتے ہیں۔ اللہ جو چاہتا ہے خلق کرتا ہے۔ اللہ ہر شے پر بے حد قدرت رکھتا ہے''۔ (24/45)

اس آیۂ کریمہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ نے تخلیق کے اعتبار سے انسان کو بھی حیوانی انواع میں سے ایک نوع قرار دیا ہے یعنی دو پایہ کہا اور ظاہر ہے کہ انسان جب تک محض حیوانی سطح پر رہے وہ محض دو پایہ ہی ہوتا ہے۔ ہاں عام حیوان کا آغاز بھی اور انجام بھی حیوانیت ہے اور اس میں تربیت پا کر تجزیاتی دانش کا مالک بن جانے کی اہلیت و قابلیت فطرتاً موجود نہیں لیکن دو پایہ حیوان ایسا ہے کہ اس کا آغاز تو حیوان ہی کی طرح ہوتا ہے اور ابھی اوپر بیان ہوا ہے کہ تمام جانور اللہ نے پانی سے پیدا کیے۔ مگر دو پائے کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے وہ وہ اہلیتیں اور امکانات ودیعت کیے ہیں کہ اس کی آخری حد مقرر نہیں۔ آخری حد تو کہیں وہاں جا پہنچتی ہے جہاں سے آگے پھر کوئی حد نہیں رہتی۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ میں نے آدم کے پتلے میں اپنی روح پھونکی۔ اپنی روح پھونکنے کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ گویا خدا نے آدم کو خدائی اوصاف کا پرتو عطا کر دیا۔ اب واضح ہے کہ آدم مادہ بھی ہے اور روح بھی اور مادہ اور روح اس کے وجود میں الگ الگ خانوں میں مکین نہیں۔ تمام وجود میں روح اور مادہ اکٹھے ہی مقیم ہیں اور کارفرما بھی۔

یہ امر عیاں ہے کہ روح عالم بالا سے رابطہ رکھتی ہے اور مادہ عالم سفلی سے، جمادی اثر بھی،

Marfat.com

نباتی اثر بھی اور حیوانی اثر بھی۔ اگر کسی شخص کے وجود میں بدن روح پر حاوی ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ شخص عقل و دانش اور ارادہ و اختیار کی زندگی بسر نہیں کر رہا۔ وہ فطرت کے ان قوانین کے مطابق جی رہا ہے جن کے مطابق اینٹ، پتھر، بیلیں، پودے اور حیوانات کی جملہ انواع زندگی کا ثبوت دے رہی ہیں۔ ایسا ہر شخص گویا ابھی انسان بنا ہی نہیں اور اگر کبھی بنا تھا تو واپس نیچے کی سطحوں کی جانب لوٹ گیا ہے۔

انسان کے وجود میں خدائی روح کا ہونا گویا اعلان ہے اس بات کا کہ انسان کے اندر یہ اہلیت موجود ہے کہ وہ بعدِ خدا ساری خدائی سے برتر مخلوق ثابت ہو سکے۔ ہوائیں اسے عاجز نہ کر سکیں بلکہ وہ ہواؤں کو عاجز کر کے رکھ دے۔ ہواؤں کے کندھے پر سوار ہو کر اپنی برتری، فضیلت اور قوت کا ثبوت دے۔ وہ سمندروں کا سینہ چیر لے۔ وہ دھاتوں کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالے۔ وہ سورج کی شعاعوں کو سدھائے، گرفتار کرے اور اپنی خدمت میں لگا دے۔ وہ خود ان اشیاء سے آگاہ ہونے کے باعث اشیاء کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرے۔ ظاہر ہے فردِ آدم فطرت کے غیر متبدل بنیادی عناصر کی غیر متغیر خاصیت سے واقف ہونے کے باعث اختراعات عمل میں لا سکتا ہے۔ پتھر کو اپنی مرضی کے مطابق تراشنا اور کاٹنا، پتھر میں سے آگ نکالنا، دھاتوں سے ہتھیار ڈھالنا، ہتھیاروں سے دیگر اشیاء کو حسبِ ضرورت تشکیل دینا اور بنانا..... یہ قدرت اور یہ شوق، آدمی کی فطرت میں ہے۔ فطرت کے آئین سے آگاہی اور خواصِ اشیاء کا علم آدم کے ذوق اور ولولۂ اختراع کے اضافے کا سبب ہے۔ اگر لکڑی اور پانی کے مابین پائیدار فطری اور خاصیتی تعاون موجود نہ ہوتا تو آدمی درخت کا تنا بار بار گرا کر اور اس پر بیٹھ کر پانی عبور کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ اور اس حقیقت پر اعتماد کر کے کشتیاں نہ بناتا اور اگر لکڑی جب اس کا جی چاہتا، ڈوب جاتی اور پانی کا جب جی چاہتا لکڑی کو تراشے رکھنے کی اہلیت سے اپنے آپ کو فارغ کر لیتا تو کشتی بار بار نہ بنائی جاتی اور نہ پانی میں اتاری جاتی۔ کشتی کا بار بار بننا اور پانی میں اتارا جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ پانی کی فطرت بھی غیر متبدل ہے اور لکڑی کی بھی۔ دونوں قابلِ اعتماد ہیں۔ یہی عالم دنیا کی ہر شے کا ہے۔ ہر شے کے بنیادی خواص مقرر ہیں اور وہ اپنی معمولی اور عمومی حالت میں بھروسے کے لائق ہیں۔ اسی اعتماد کی بنیاد پر تمام طبی نسخے تشکیل پاتے ہیں۔ انجینئری اور ریاضی کے فارمولے عمل میں آتے ہیں۔ یہ واضح ہے کہ اشیاء کو آدمی اپنی ضرورت اور مرضی کے

Marfat.com

مطابق کام میں لاتا ہے۔ یہ اس کی قوتِ تسخیر کا ثبوت ہے۔ اس کی نیابتِ الٰہی کی سند ہے۔

آدم کے سوا نہ کسی میں خود آگاہی کا جوہر موجود ہے اور نہ غیر آگاہی کا امکان۔ یہ جوہر اور یہ امکان گویا آدمی کی فطرت میں ہے۔ یہ اللہ کا عظیم عطیہ ہے مگر اس عظیم عطیے کو کام میں لانے کے لیے آدم کا بیدار و آگاہ ہونا لازم ہے اگر یہ نہیں تو پھر جو درجہ دیگر مخلوقات کا وہی آدم کا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آدم کا مرحلۂ آغاز ہی اس کی فضیلت کا نشان نہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی فرد آدم بے سوچے سمجھے عمر گزار دے۔ گھاس کی سطح پر رہے، ہر ہوا کے حضور میں سر ہلائے اور بس! نہ ارادہ، نہ مرضی نہ اختیار۔ آدمی کی فضیلت اختیار کے ساتھ وابستہ ہے۔ اختیار کا ہتھیار عزم ہے اور واضح امر ہے کہ اپنی مرضی کو کام میں لانا۔ اختیار استعمال کرنا، عزم کو نافذ کر کے رہنا علامت ہے اس بات کی کہ آدمی کے مادی وجود پر اس کے روحانی حصے کا غلبہ و تسلط ہے۔ ایسے عالم میں وہ دو پایہ نہیں ہوتا جانور نہیں رہتا بلکہ جانور کی سطح سے بلند کوئی اور ہی وجود ہوتا ہے۔

اگر گھوڑے پر سواری مقصود ہو تو اسے لگام دینا ہوگی۔ اسی طرح ہر جبلی خواہش اور ذوق ولولہ اور شوق مقتضی ہے کہ اسے پابندِ حدود رکھا جائے۔ جبلت حیوان کے لیے واحد محرک ہے۔ وہ آدمی کے لیے بھی ہر حرکت کی اساس ہے لیکن حیوان کو اللہ تعالیٰ نے اختیار نہیں دیا۔ اس لیے اس کی جبلت کی حدود خود اللہ تعالیٰ ہی نے متعین کر دیں۔ حیوان اپنی جبلتوں میں محدود ہونے کے باعث اور اختیار و مرضی سے محروم ہونے کی وجہ سے کسی امر میں خالق کے حضور جوابدہ نہیں، اس کے سارے عمل کی زمام قانونِ قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن آدمی کے ضمن میں معاملہ یکسر مختلف ہے۔

آدمی کا صاحبِ اختیار و ارادہ ہونا ہی اس امر کا تقاضا بھی کرتا ہے کہ فطرت کے ان اصولوں سے آگاہ رہے جو اس کو انسان بننے میں مدد دیں اور ان کوائف سے بچے جو اسے انسان کی عظمت سے زوال آشنا کر دے۔ دنیا میں انسانی آبادی کی کثرت کثیرہ غیر ذمہ دارانہ زندگی بسر کرنے کی عادی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشرہ سخت قانون نافذ کرتا ہے۔ پولیس کا محکمہ اور عدالتیں قائم کرتا ہے۔ اسی طرح دیگر قانون نافذ کرنے والے ادارے استوار کرتا ہے۔ جیلیں بناتا ہے۔ پھانسیاں لٹکاتا ہے..... یہ انتباہ، گرفت اور سزا کا سارا عمل ظاہر کرتا ہے کہ آدمی میں ان جملہ امور سے بچنے کی بالعموم اہلیت موجود ہے جو امور معاشرے کے خلاف یا انسانیت کے خلاف جرم تصور کیے جاتے ہیں۔

Marfat.com

می شود از جبر پیدا اختیار

آدمی کیے کی سزا بھی پاتا ہے اور جزا بھی۔ اور جزا اور سزا اس لیے پاتا ہے کہ وہ اچھے کام کرنے اور برے کام نہ کرنے پر قادر ہے۔ یہ اختیار وارادہ خود آگاہی و غیر آگاہی اللہ تعالیٰ کا وصف ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی روح کے ساتھ یہ وصف آدم کے پتلے میں ودیعت کر دیا۔ دوسرے لفظوں میں اختیار وارادہ گویا اللہ کی امانت ہے جو اللہ تعالیٰ نے آدم اور صرف آدم کے سپرد کی۔

اے امین و از امانت بے خبر

قرآن کریم کا ارشاد ہے:

ترجمہ ''ہم نے امانت آسمانوں کے پیش کی۔ زمین کے سامنے رکھی۔ پہاڑوں کو دکھائی۔ سب نے اس کو قبول کرنے سے اعتراض کیا۔ منہ موڑ لیا۔ سب اس سے ڈر رے۔ آدمی نے اس امانت کو اٹھا لیا۔ یقیناً آدمی نے زیادتی کی اور بڑی نا آگاہی کا ثبوت دیا''۔ (33/72)

اللہ کی نیابت کی امانت کا بار کون اٹھائے۔ بلندیوں پستیوں اور ان کے مابین موجود کسی شے کو بھی حوصلہ نہ ہوا کہ بڑھ کر اس بار کو اٹھا لے۔ بات فقط اتنی تھی کہ آیا خدا ایک مخلوق کو براہِ راست اپنے ضابطے اور آئین کے تابع رکھے یا انہیں عقل و اختیار اور عزم وارادہ دے کے آئین اور ضابطے سمجھا دے۔ انسان کے بغیر ہر شے عقل وارادہ کو کام میں لائے بغیر خدا کی عطا کردہ جبلت اور حیثیت کے مطابق کارفرما ہے۔ جیسا کہ مقالے کے آغاز میں عرض ہوا تھا۔ مگر انسان کو نیکی اور بدی کا شعور دے دیا گیا۔ اسے نباتات اور حیوانات کی طرح مقید جبلت نہ دی۔ اسے آزاد اور بے حد قوی جبلتیں دے کر ساتھ ہی اُن جبلتوں کو قابو میں رکھنے کے لیے نہایت موزوں اور مناسب اوزار بھی دے دیے۔ یعنی آدمی کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ چاہے تو جبلتوں کا غلام ہو کر جیے اور چاہے تو جبلتوں کا حاکم ہو کر زندگی بسر کرے۔ جبلتیں انسان کی اساسی اور جوہری قوت ہیں مگر ظاہر ہے ہر قوت کا پابندِ حدود ہونا ضروری ہے۔ حدود کی یہ پابندی آدمی کے ضمن میں خود آدمی ہی کے اختیار میں دے دی گئی۔ یہ شعوری اور اختیاری پابندی ہی آدمی کی شان ہے اور یہی اللہ کی امانت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی کا صحیح معنوں میں آدمی بننا اللہ نے آدمی ہی کے

Marfat.com

ذمے ڈال دیا۔ باقی ہر شے کے وجود کی تکمیل اور ہستی کا اتمام اللہ نے فطرت کے حوالے کیا مگر آدمی کو فطرت کا غلام بنانے کے باوجود اختیار اور مرضی کی دولت سے نوازا۔ گویا لاثانی شان کا مالک بنا دیا۔ اختیار اور مرضی وہ سرشاری ہے جو کسی دوسرے وجود کو حاصل نہیں۔ اس اعتبار سے آدمی واقعی اللہ کے بعد بہترینِ خلائق ہے مگر ساتھ ہی متنبہ کر دیا کہ ہم نے جو فطرت آدمی کو دی اس کی تربیت کا ذمہ دار بھی آدمی خود ہے۔ اگر اس نے اس بہترین قوت کے ساتھ پیدا ہونے والے بہترین وجود کو جو روح اور مادہ کے امتزاج کا حسین مظہر ہے نقصان پہنچایا تو سزا ملے گی۔ ہم نے اسے بہترین اہلیتیں اور امکانات عطا کیے ہیں۔ اگر وہ اہلیتیں اور وہ امکانات اپنی اعلیٰ معیار اور اعلیٰ شان تک نہ پہنچے تو سزا دی جائے گی۔ اس شرط کے ساتھ ارادہ و اختیار قبول کرنا انسان کے لیے واقعی مشقت طلب مسئلہ تھا۔

آدم مادے سے تخلیق ہوا۔ قدرتی بات ہے کہ ایک مدت تک وہ نباتی زندگی گزارنے پر مجبور ہے اور اس کے بعد شعور کے بالغ ہونے تک حیوانی سطح پر رہنے پر مجبور۔ ظاہر ہے کہ انسان جب تک اور جس قدر مٹی سے قریب رہتا ہے اس کو سہولت رہتی ہے۔ گھاس زیادہ آرام میں ہے۔ بیلوں کو نسبتاً بے آرام ہونا پڑتا ہے۔ درختوں کا اور بھی زور لگتا ہے۔ جانور کو مزید مشقت اٹھانا ہوتی ہے۔ اس کو اپنی بقا کے لیے حرکت کرتے رہنا پڑتی ہے۔ آدمی کی ہستی اس سے بھی زیادہ محنت و عزیمت کی طالب ہے۔ اسے حیوانی سطح سے اوپر ابھرنے کے لیے خاصا زور صرف کرنا پڑتا ہے۔ اس کے وجود کا مادی جوہر اسے مادی اشیاء کی ہوس میں مبتلا کر کے نیچے کو گھسیٹتا ہے اور روح جو نور کا ذرہ ہے اسے اوپر کو اٹھاتی ہے۔ یہ کشمکش اس کے روحانی اتار چڑھاؤ کی کیفیت کے عمومی تسلسل کا سبب ہے۔

اگر یہ کشمکش جاری رہے تو جب بھی بنی آدم آدمی ہی کے زمرے میں شمار ہوگا اس لیے کہ یہ کشمکش ثبوت ہے اس بات کا کہ آدمی نے بدن کی وحشت کے حضور میں ہتھیار نہیں ڈالے۔ اس کو حیوان اسی دم کہا جائے گا جب وہ اپنے مادی وجود کے حضور میں گردن ڈال دے اور اس کی روح اس کے بدن کی مغلوب ہو کر رہ جائے۔ قرآن کریم اس ضمن میں مثال دے کر یہ بات سمجھاتا ہے:

ترجمہ ''اے رسولؐ ان لوگوں کو اس شخص کا واقعہ سنا دے جس تک ہم

Marfat.com

نے اپنی آیات پہنچائیں مگر وہ ان سے کٹ کر اور ہٹ کر الگ ہو کر کھڑا ہوا، اس پر شیطان نے اسے اپنے پیچھے لگا لیا۔ لہٰذا وہ گمراہوں میں سے ہو کر رہ گیا۔ اگر ہمیں اپنی مرضی نافذ کرنا ہوتی تو ہم اسے ان آیات کی بدولت اوپر کو اٹھا لے جاتے۔ مگر وہ تو زمین ہی سے چپکا رہا''۔

واضح ہے کہ بالاستقلال رفتہ رفتہ روح کو تقویت دینا اور اوپر کو اٹھتے چلے جانا آسان کام نہیں۔ خدائے آدم بھی جانتا تھا کہ اس نے آدم کو کس امتحان میں ڈالا ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

ترجمہ ''اے انسان تو خدا کے رخ بڑی ہی مشقت اٹھائے گا اور جب جا کر کہیں اس تک پہنچے گا''۔ (84/6)

اسی سورہ کی آیت 19 میں ہے:

''تو ضرور ایک حالت سے دوسری حالت کو چڑھتا چلا جائے گا''۔

یہ ساری محنت و مشقت اس جوہرِ اختیار کا نتیجہ ہے۔ نہ انسان اختیار کی امانت قبول کرتا نہ یہ ذمہ داری اس پر عائد ہوتی۔ ظاہر ہے کہ مسئولیت بقدرِ اختیار ہے .....بیل کو بیل، درخت کو درخت، بلی کو بلی اور اونٹ کو اونٹ خود فطرت بنا دیتی ہے اس کے وجود کی تکمیل دستِ فطرت میں ہے یعنی انسان کے سوا ہر وجود کی طبعی تکمیل اس وجود کی اپنی مرضی اور پسند و اختیار کے تابع نہیں ہے مگر انسان کو سچ مچ انسان بنانا خود انسان ہی کے ذمہ ڈال دیا گیا ہے۔ ہاں یہ جدا بات ہے کہ انسان کو عقل تجزیہ کاری بھی دے دی گئی اور دانش وجدانی بھی، عزم بھی اور ارادہ بھی، اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان کو وحی کا نور ہدایت بھی بخش دیا گیا تا کہ انسان ان جملہ وسائل سے کام لے کر اپنے آپ کو سچ مچ آدمی بنا سکے۔ تعمیری عناصر سب ''خیر'' ہیں تخریبی عناصر سب ''شر'' ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ خیر و شر کیا ہے۔ خیر و شر حقیقت ہے اور ہر حقیقت کا خالق خدا ہے۔ یہاں مختصراً یہ عرض کیا جائے گا کہ ہر وہ شے جو آدمی کی روح کو مادّے کی غلامی سے نکال کر اس کو تکمیل تک پہنچانے میں مدد دے وہ ''خیر'' ہے اور ہر وہ شے جو روح کو مادّے کے سامنے کمزور اور عاجز اور مغلوب کر دے وہ ''شر'' ہے۔ اللہ نے بلندی کی طرف سفر کرنے کے امکانِ قوی سے آدمی کو بخوبی مسلح کیا ہے۔ وہ ان قویٰ سے کام نہ لے تو اس کا اپنا قصور، یہی باعث ہے کہ قرآن

Marfat.com

کہتا ہے خیر میری طرف سے ہے مگر شر تمہارا اپنا اکتساب ہے۔

شر کا اکتسابی ہونا اس معنٰی میں ہے کہ آدمی جب بھی نیچے کو جاتا ہے اسے پتہ ہوتا ہے کہ وہ کیا ارتکاب کر رہا ہے اور اس ارتکاب کے خلاف متنبہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آدمی کے اندر نادم اور شرمسار کرنے والی اہلیت بھی ودیعت کر رکھی ہے۔ اس اہلیت کو نفس لوامہ کہتے ہیں۔ جب کوئی غلط کام سرزد ہوتا ہے تو کوئی شے آدمی کے اندر سے کچوکے لگاتی ہے اور وہ بقدر صورتِ حال کم یا زیادہ اذیت محسوس کرتا ہے۔ گویا اللہ نے سرزنش کا تازیانہ بھی آدمی کی ہستی میں شامل کر رکھا ہے۔ اس کے باوصف مسلسل غلط کام ہوتا رہے تو پھر وہ کون کر رہا ہوتا ہے؟ اور اگر وہ غلط کام آدمی خود اپنے ارادہ و اختیار سے نہیں کر رہا تو پھر اندر سے لعن طعن کرنے والی حقیقت کیا ہے؟..... یہ سب کچھ مسئولیت ہی کی علامت ہے۔

ذمہ داری فرد کی رو سے خالص انفرادی ہے۔ خدائے تعالیٰ کا واضح اعلان ہے کہ کوئی جان کسی دوسری جان کا بار اٹھانے کی نہیں..... اس اعتبار سے جسے اجتماعی ذمہ داری کہا جاتا ہے وہ بھی درحقیقت انفرادی ذمہ داری ہے۔ ظاہر ہے کہ اجتماعی کمال اور اجتماعی زوال، بندوں ہی کے کمال وزوال کا نام ہے۔ جس معاشرے میں اکثریت غلط بندوں کی ہو وہ معاشرہ اجتماعی زوال سے دوچار ہو جاتا ہے اور اسی طرح جس معاشرے میں کثرتِ کثیرہ بھلے لوگوں کی ہو وہ معاشرہ اجتماعی طور پر کمال سے ہمکنار ہوتا ہے مگر پھر بھی معاشرہ ایک تصویر ہے۔ ایک نصب العین ہے، ایک نظریہ ہے، ایک تصویرِ خیالی ہے۔ اصل اور ٹھوس حقیقت فرد ہے فرد ہی سے معاشرے کا آغاز ہوتا ہے اور فرد ہی پر معاشرے کی انتہا ہوتی ہے۔ بقول حضرت علامہ:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

ہاں ایک امر واضح ہے کہ بُروں کی اکثریت اچھوں کی اقلیت کو بھی لے ڈوبتی ہے۔ وہ یوں کہ قوموں کو سزا جب بھی ملتی ہے اجتماعی ملتی ہے۔ جبھی تو حضرت علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

تاہم یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ فرد صحیح معنوں میں فردِ آدم معاشرے ہی میں بنتا ہے۔

Marfat.com

وہ شے جسے اخلاق یا کردار یا بشریت یا پابندیٔ آئین کہتے ہیں وہ معاشرے ہی میں پروان چڑھتی ہے۔ اگر آدم محض اکیلا ہے جنگل یا غار میں رہتا ہے کسی دوسرے فردِ آدم سے کوئی ربط ہی نہیں رکھتا تو اس کا اخلاق کیا، اس کا کردار کیا؟ اس کا پابندِ آئین و دستور ہونا کیا؟ اس کی انسانیت کیا؟ انسانیت تو وہاں جلوہ گر ہوتی ہے یا موضوعِ بحث بنتی ہے جہاں انسان کو دوسرے انسانوں سے لین دین کا موقع ملے، جہاں ہمسائیگی اور رفاقت عمل میں آئے، جہاں فرائض و حقوق کا معاملہ اٹھے ..... جہاں دوسروں سے معاملہ ہی نہ ہو وہاں امانت کیا، دیانت کیا، سچائی کیا، ایثار کیا، جہاد کیا شہادت کیا..... مطلب یہ کہ فرد اگر اوصاف کا مالک ہے تو وہ اوصاف پنہاں رہتے ہیں۔ وہ امکانات خوابیدہ رہتے ہیں۔ ان اوصاف کا بروئے کار آنا اور بیدار ہونا صرف اجتماعی اور معاشرتی زندگی ہی کے باعث ممکن ہے۔ اس اعتبار سے آدمی واقعی معاشرتی حیوان ہے، جسے معاشرہ موقع مہیا کرتا ہے کہ رفتہ رفتہ حقیقی معنوں میں انسان بن جائے یا یہ کہ کم از کم اس راہ پر پڑ جائے جو راہِ انسانیت ہے۔ باوصف اس کے کہ آدمی کو معاشرہ ہی آدمی بناتا ہے۔ تاہم ذمہ داری ہر فرد کی اپنی ہے۔ معاشرہ ٹھوس وجود نہیں نہ اس کی گردن نہ کان، نہ سر نہ پیر، چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے

''قیامت کے دن خدا کے حضور میں ہر فرد اکیلا ہی پہنچے گا''۔

ہر ایک کا اپنے اور فقط اپنے ہی اعمال کا ذمہ دار ہونا واضح کر دیتا ہے کہ از روئے قرآن کوئی بھی شخص کسی دوسرے کے گناہوں کا بار نہ اٹھائے گا اور نہ سزا بھگتے گا۔ از روئے اسلام کوئی ازلی گناہ آدم کے گلے میں نہیں پڑا ہوا۔ از روئے اسلام ہر انسان پاک پیدا ہوتا ہے۔ ماں باپ کے گناہوں کی سزا اولاد اور اسی طرح اولاد کے گناہوں کی سزا والدین کو نہیں ملے گی۔ اگر والدین تربیتِ اولاد کے باب میں کوتاہی کرتے ہیں تو یہ ان کی انفرادی خطا ہے جس کے لیے وہ جوابدہ ہیں لیکن اولاد کی شعوری اور دانستہ خطاؤں کے وہ ہرگز ذمہ دار قرار نہیں دیے جائیں گے۔

بالکل اسی طرح کسی حاکم یا صاحب قوت کی حکومت یا قوت کے خوف یا دباؤ سے ایسے اعمال سرانجام دینا جو مستوجب سزا ہوں، ضرور سزا دلائیں گے۔ کسی بڑے کا خوف یا لحاظ، خدا کے خوف اور خوشنودی سے زیادہ یا برابر قابل لحاظ نہیں۔ اہل ایمان کے لیے حکم فقط اللہ کا ہے۔ قرآن حکیم میں آتا ہے کہ قیامت کے روز مجرمین کہیں گے کہ ہمارے بڑوں، عظام نے ہمیں غلط راہوں پر بالجبر ڈال دیا تھا..... یہ اور اسی طرح کا کوئی اور عذر مسموع نہ ہوگا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

Marfat.com

کی حدیث ہے:

آگاہ رہو کہ اسلام کی چکی گردش میں آچکی ہے۔ پس تم بھی کتاب کے ہمراہ گردش میں رہنا۔ آگاہ رہو کہ جلد ہی حکومت کی راہ اور ہو گی اور قرآن کی اور، مگر تم قرآن کو نہ چھوڑنا۔ آگاہ رہو کہ تم پر ایسے حاکم بھی حکومت کریں گے جو اپنے لیے فیصلوں کے معیار اور قائم کریں گے اور تمہارے لیے اور، اگر تم ان کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں گمراہ کر دیں گے اور اگر تم سرکشی اختیار کرو گے تو تمہیں مار ڈالیں گے۔ اس پر اصحابؓ نے دریافت کیا کہ ایسے عالم میں ہم کیا کریں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، وہی کچھ کرو جو اصحابِ عیسیٰؑ نے کیا تھا۔ انہیں آروں سے چیرا گیا۔ انہیں سولی دی گئی۔ اللہ کی اطاعت میں مرجانا اللہ کا سرکش ہو کر جیتے رہنے سے بہتر ہے''۔

مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بنو آدم کو دانش دی، شعور دیا، اس کی ہمت و حیثیت کی حد تک اختیار بھی دیا تا کہ وہ اچھائی اور برائی میں تمیز کر سکے اور پھر اچھائی اپنا لے اور برائی کو رد کر دے۔

مگر حق تعالیٰ نے عقل و فہم دے کر بنو آدم کو خود اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ خدا خالق ہے لہٰذا وہ جانتا ہے کہ بنو آدم کو رہبری کی ضرورت ہے۔ لہٰذا وحی کی ہدایت اور پیغمبروں کی سیرت چراغِ راہ رہی۔ آخر تمام تر وحی قرآن کی صورت میں مکمل ہوئی اور تمام انبیاء کی سیرتیں نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ میں اتمام کو پہنچیں۔ اب یہ لفظی قرآن اور عملی قرآن تا قیامت مصدرِ ہدایت رہیں گے ..... یہ سب کچھ اس لیے کہ بنو آدم کو خیر و شر کی شناخت میں سہولت رہے ..... تاہم یہ اختیار بھی بنو آدم کا اپنا ہے کہ وہ خیر کی راہ چن لے یا شر کی۔

ہدایت اور گمراہی عیاں ہو چکی۔ لائحہِ حیات اختیار کرنے کے بارے میں کوئی جبر نہیں یعنی اختیار و انتخاب بنو آدم کا اپنا ہے۔ یہی ذمہ داری ہے، یہی امانت ہے۔

Marfat.com

اسلام غلبے کا دین ہے

کارخانۂ قدرت کے اندر، از روئے قرآن، انسان کا مقام ہر شے سے بلند ہے، بلکہ خدا نے اپنی کائنات کے اندر اپنے خلیفہ ہونے کا شرف بخشا ہے جبھی تو اسے قرآن کریم نے بار بار مشاہدہ و مطالعۂ کائنات کی تلقین فرمائی ہے تا کہ وہ اپنے میدانِ عمل اور اپنی قلمرو سے بخوبی آگاہ ہو، ساتھ ہی انسان کو یہ بھی ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے آپ سے بھی واقف ہو۔ اگر وہ خود اپنی شناخت نہیں کرے گا اور اپنی صلاحیتوں کو نہیں پہچانے گا تو وہ ماحول پر غالب اور قادر کیونکر ہوگا۔ پھر وہ خدا کی خلافت کا حق کیونکر ادا کرے گا..... مگر وہ اپنے آپ سے آگاہ جبھی ہو سکتا ہے کہ قرآن میں بیان کردہ اپنے مقام کا علم حاصل کرے اور خدا سے اپنے تعلق کی حیثیت بخوبی جان جائے۔ اس کا خالق ہی اسے بتا سکتا ہے کہ وہ کیا ہے،۔ وہ کن بلندیوں کا مالک ہے، وہ کن پستیوں سے دوچار رہتا ہے اور ان بلندیوں اور پستیوں کے مابین اس کی راہِ فتح و غلبہ کیونکر کھلتی ہے..... یہ مشاہدۂ کائنات جب واقعی مشاہدہ بن جائے تو بے اختیار زبان سے نکلتا ہے کہ واہ مولا تو نے یہ کارگاہ فطرت محض تماشا نہیں بنائی۔ یہ محض بے بنیاد رونق کا میلا اور مناظر کا جمگھٹا نہیں ہے،..... نیز یہ کائنات یہ سب کچھ تیری ہی سطوت اور تیرے ہی غالب قانون و آئین کے تابع ہے..... دین کا معنی محض عبادات نہیں ..... عبادات دین کا فقط ایک شعبہ ہیں۔ یوں کہہ لیجئے کہ دین اسلوبِ حیات ہے، مگر سوال یہ ہے کہ آدمی کے لیے کسی خاص اسلوبِ حیات کی ضرورت کیوں ہے؟ آدمی کو اللہ نے دل و نظر سے نوازا، عقل و شعور سے مالا مال کیا، قوت متخیلہ ارزانی کی، عزم دیا، ارادہ بخشا، غلط اور صحیح، گناہ اور ثواب نیز ایمان و کفر کے مابین تمیز کرنے کے جوہر سے سرمایہ دار کیا، یہ ساری قوتیں اور صلاحیتیں اسے ہر دیگر مخلوق سے متمیز اور ممتاز کر دیتی ہیں .....حیوانات کو خداوند تعالیٰ نے ان کی نوعی فطرت کے مطابق جبلتوں کا پابند کر دیا ہے، ہر نوع حیوانی کی حدود متعین ہیں، اور اس کے مطابق اس کی جبلی قوتیں بھی، مگر اس کے برعکس آدمی کی اہلیتوں کا کوئی اندازہ ہی نہیں۔

Marfat.com

آدمی کا آغاز بھی حیوانی سطح ہی سے ہوتا ہے۔اس کی پیدائش اور پھر پرورش کا آغاز بڑی بے بسی کی کیفیت کا منظر پیش کرتا ہے۔اکثر حیوان جسمانی طور پر آدمی سے بہت جلد قوت پکڑ لیتے ہیں اور بھاگ دوڑ شروع کر دیتے ہیں۔اسی طرح جسمانی غذا کے ضمن میں بھی دیگر زندہ مخلوقات آدم زاد کے مقابل بہت جلد خود مختار ہو جاتی ہیں۔بعض انواع کے بچے پیدا ہونے کے ساتھ ہی اپنی خوراک کے لیے حرکت کرنے لگ جاتے ہیں اور فطرت ان کی رہنمائی کرتی ہے۔مرغی کا بچہ دانے کی طرف بھاگتا ہے، گائے، بھینس کا بچہ ماں کے تھنوں کی جانب رخ کرتا ہے، حال یہ ہوتا ہے کہ وہ ابھی اٹھ سکنے کے قابل نہیں ہوتا مگر اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا رزق کہاں ہے، اسے یہ بات کس نے بتا دی؟

جانور کے مقابل آدمی کے بچے کی تربیت پر بہت زیادہ قوت صرف ہوتی ہے، اسے باشعور ہوتے دیر لگتی ہے..... جانور بالغ بھی نسبتاً جلد ہو جاتا ہے۔آدمی کو سنِ بلوغت تک پہنچنے کے لیے مقابلتاً زیادہ عرصہ درکار ہوتا ہے، لیکن حیوان جسماً اور جبلتاً بالغ ہو جانے کے بعد اور اپنی نوع کی حد اور سطح پر رک جاتا ہے۔نسلاً بعد نسل ہر حیوان کے ساتھ تقریباً یہی ہوتا ہے آیا ہے، وہ اپنی مقرر اور معین جبلتی وسعت اور احاطے کے اندر ہی رہ سکتا ہے۔اس کے برعکس آدمی جب تک جیتا رہے اس کی عقلی اہلیت تربیت یاب رہتی ہے، آدمی کی پوشیدہ اہلیتوں کی کوئی حد مقرر نہیں۔اس کی اختراع کاری اور ایجاد پسندی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔اسے نئی نئی بھلی اور بری باتیں سوجھتی رہتی ہیں۔حیوان کی طرح آدمی محض ماحول کے تابع بھی نہیں ہوتا۔یہ ماحول کا مقابلہ کرتا ہے۔ماحول پر فتح پانے کی کوشش جاری رکھتا ہے، یہ خوراک میں بھی تنوّع پیدا کرتا رہا ہے۔اس کا ذوق رنگ رنگ کے ذائقے اختراع کرتا رہتا ہے۔یہ لباس میں بھی تنوّع پیدا کرتا رہا ہے۔اس کا ذوق یہاں بھی گوناگوں جدتوں کے جلوے دکھاتا رہا ہے۔یہ گھروں اور بستیوں کی تعمیر میں بھی ذہانت و فطانت سے کام لے کر بوقلموں تبدیلیاں عمل میں لاتا رہا ہے۔اس نے پہاڑ چیرے، سرنگیں بنائیں، اس نے کشتیاں بنائیں، جہاز تعمیر کیے اور دریاؤں اور سمندروں کے سینوں پر مونگ دلی، دریاؤں سے مچھلیاں چھین لیں، سمندروں سے مچھلیاں بھی چھین لیں اور موتی بھی..... اور ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہے کہ آدمی جس قدر قوتِ تعمیر کا مالک ہے اسی قدر تخریب پر بھی قادر ہے۔جس قدر بناتا ہے اسی قدر بگاڑتا بھی ہے۔اس کی جوہری قوت جسے حمیت اور غیرت کہتے ہیں جب معکوس

Marfat.com

ہوکر جوش میں آتی ہے تو تعمیرات کو ڈھا دیتی ہے، فصلوں کو اجاڑ دیتی ہے، انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے..... ساتھ ہی یہ امر بھی ہر دم زیرِ نظر رہنا چاہیے کہ آدمی نسلاً بعد نسل فکری اور عقلی اعتبار سے ترقی کرتا رہا۔ اس کی اختراع کاری میں، اس کے ذوقِ تعمیر اور شوقِ تخریب میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس نے اپنے مفاد میں ہتھیار اور اوزار بنائے۔ اوزاروں سے کام لیا، ہتھیاروں کو استعمال کیا، اس طرح اپنی وجودی قوتوں میں عملی وسعت پیدا کی، وہ ہاتھ سے کیا کچھ کر سکتا ہے، مثبت معنوں میں بھی، منفی معنوں میں بھی، اندازہ حیرت ناک ہے۔ مگر جب خالی ہاتھ نے کام نہ دیا تو اس نے ہاتھ کی قوت اور اہلیت اوزار اختراع کر کے بڑھالی اور جب اپنے پاؤں نے رفتار میں شوق کے مطابق ساتھ نہ دیا تو اس نے تیز رفتار جانوروں پر قبضہ کر لیا، گھوڑوں کو سدھایا، اونٹوں کو لدّو نکالا ہے۔ اسی طرح جو بوجھ نہ اٹھایا جا سکتا اس کے لیے گدھے، گھوڑے، بیل، اونٹ اور ہاتھی سے کام لیا۔ کشتیوں اور جہازوں سے کام لیا۔ یہ ساری اختراعیں اس کی جسمانی توسیعیں ہیں۔ اس طرح اس نے دسترس بڑھالی، اپنی رسائی میں بھی اضافہ کر لیا۔ یعنی رفتار بڑھالی۔

آج آدمی اختراع کاری میں کہاں کہاں پہنچ چکا ہے اور پہنچ رہا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ آج یہ بجلی جیسی بے پناہ قوت کو تابع فرمان بنائے ہوئے ہے۔ یہ سمندروں کو کھنگال رہا ہے۔ یہ دریاؤں کے رخ موڑ رہا ہے۔ یہ پہاڑوں کے سینے ہی نہیں چھید رہا اس پر بھی قادر ہے کہ انہیں بھک سے اڑا دے۔ اس نے وہ مکان اور محل بھی بنائے ہیں جن کو جہاں چاہے جا کے نصب کرے۔ یہ خانہ بدوشوں کی جھونپڑیاں نہیں، یہ باقاعدہ شبستان ہیں..... آدمی کی حمیت اور غیرت اور ذوقِ حاکمیت نے اس کو مکّے سے کام لینا سکھایا، پھر اس نے مکّے کی رسائی اور اثر میں اضافہ کیا۔ ڈنڈا پکڑا، ڈنڈے کو تلوار بنایا۔ پھر نیزے کی شکل دی، حتیٰ کہ آدمی اور حیوان کے شکار کی خاطر تیر بنائے۔ تیر نے بندوق کی شکل اختیار کی، توپ بنی، توپ نے ایک طرف ٹینک کی شکل پالی اور دوسری طرف دور مار میزائیلوں کی ..... بات بڑھتے بڑھتے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم تک پہنچی..... یہ سب مکّے کی توسیع ہے۔ پارسائی یعنی پاؤں کی رفتار نے گھوڑے سے بڑھ کر ریل کے انجن اور کار اور پھر ہوائی جہاز اور اب ہوائی جہاز بھی وہ جو چشم زدن میں فضاؤں کو چیر جائیں اور چاند کے مناظر کے حضور جا کے آداب عرض کریں..... اگر مکّے کو اخلاق کے تابع ہونا چاہیے تو لازم

Marfat.com

ہے کہ ہائیڈروجن بم بھی کسی اخلاق کے تابع ہو۔ایسی بے پناہ قوتوں والی مخلوق کو بے آداب تو نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔اگر آدمی خود بے قابو جانوروں کے لیے رسیاں اور کھونٹے یا لگامیں اور نکیلیں اور پنجرے وغیرہ تیار کرتا ہے تا کہ ان کی رفتار یا ضرر رسانی کو حدود میں رکھا جاسکے۔تو کیا اسے یہ ضروری نہیں معلوم ہوتا ہے کہ آدم کو بھی اپنی وحشت کی حد بندی کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت ہر حیوانی وحشت کی حد بندی کی ضرورت کے مقابلے میں شدید تر ہے۔آدمی کی ہر اہلیت کا مثبت پہلو اس کی تربیت کی دلیل ہے اور ہر منفی پہلو اس کی حیوانیت کی علامت، وہ جب تک تربیت یاب رہے اس میں یہ اتار چڑھاؤ جاری رہتا ہے، کبھی وہ انسان ہوتا ہے بڑا ہمدرد اور ایثار پیشہ، کبھی اچانک وہ حیوانیت کی طرف لوٹ جاتا ہے اور نہایت ہی وحشی رویہ اختیار کر لیتا ہے۔یہی عالم انسانی معاشروں کا ہے۔کبھی وہ سکھ اور سلامتی کی آماجگاہیں ہوتے ہیں اور کبھی نفرت اور تباہ کاری کے تربیت کدے۔

لہٰذا ضرورت تھی کہ ایسی بے پناہ قوتوں کی مالک مخلوق کی تیز روی کو بھی کوئی اخلاقی اور اصولی لگام دی جاتی اور اس کی وحشت کو بھی کوئی تازیانہ دکھایا جاتا یا اس کے لیے کوئی پنجرہ یا باڑہ تعمیر ہوتا۔ہم اس لگام یا رسی یا پنجرے اور باڑے کو قاعدہ، ضابطہ اور آئین کہہ سکتے ہیں۔یہ اصطلاحیں محض وہ ذرائع اور اسالیب ہیں جن کے حوالے سے آدم کو بے راہ اور بے اعتدال ہونے سے روکا جاتا ہے۔بحیثیت آدمی، آدمی کی ترقی جبھی ممکن ہے کہ اس کی راہ میں رکاوٹیں نہ ہوں، اور ظاہر ہے کہ بحیثیت آدم جب ہم ترقی کہتے ہیں تو مراد آدمی کی عقلی اور روحانی ترقی ہوتی ہے اور چونکہ آدمی حیوانی سطح سے ابھر کر اوپر کو آتا ہے لہٰذا حیوانی عواطف اس کی تعمیر میں ایک تخریبی عنصر کی طرح ہر دم موجود رہتے ہیں۔وہ ذرا غافل ہو تو حیوانی سطح کو لوٹ جاتا ہے۔غصہ، حرص، ہوس، ذوق حکمرانی، ذوق ملکیت، جب بھی ذرا بے قابو ہو تو وہ نیچے کو اتر جاتا ہے اور اس وقت اس میں اور ایک جنگلی وحشی جانور میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ہم ذرا غور کریں تو احساس ہوتا ہے کہ آخر حوالاتیں اور جیلیں اور پھانسیاں کیا ہیں؟ یہ علامت ہیں آدمی کی وحشت و بربریت کے جو ہر کی وقتاً فوقتاً نمود اور امکان کی۔

آدمی کو معتدل رکھنے کے لیے اسے ایسی عادات اور ایسے خصائل کا مالک بنانا ضروری تھا کہ وہ آدمی کی حیثیت سے بحال رہے اور بحال ہی نہ رہے، آگے بڑھے، اور اس کے وحشت کی جانب

Marfat.com

لوٹنے کے مواقع گھٹتے جائیں۔ایسے خصائل اورایسے عادات وآداب کوہم اخلاق کہہ لیتے ہیں۔ اخلاق گویا آدم کی صحیح تربیت کے لیے مقرر کردہ حدیں ہیں،تا کہ ان میں محدود رہ کرآدمی متوازن رہ سکے۔فرد کی رو سے بھی اور معاشرے کے اعتبار سے بھی، سزائیں تو اسی اعتدال پرور طریق اورقاعدے کی خلاف ورزی کی روک تھام کا ذریعہ ہیں۔اس سے واضح ہوا کہ سزا نفرت کی علامت نہیں،سزا مجموعا محبت کی علامت ہے۔فرد کے لیے بھی معاشرے کے لیے بھی،سزا کا مقصد اصلاح ہے اوراسے قواعد کی زیادہ سنگین خلاف ورزی کے ضمن میں زیادہ سنگین بھی بنادیا جاتا ہے۔مثلاً انسانی جان بلا ارادہ بلا جواز لے لینا،اس امر کی کھلی چھٹی یااس اقدام کی کم سزاانسانی جانوں کی قیمت ہی ختم کردے گی۔اسی طرح کوئی ایسا فتنہ جوکسی معاشرے کوفساد، بے چینی اور بربادی کی نذر کردے،تقاضا کرتا ہے کہ فتنہ گرکوسنگین ترین سزادی جائے تا کہ معاشرہ سکھ میں رہے۔

جب سے انسانی معاشرے وجود میں آئے ہیں بلکہ جب سے ایک انسان کودوسرے انسان سے واسطہ پڑا ہے آداب،اخلاق،ضابطہ اور قاعدہ بھی وجود میں آ گیا۔انسان کا تصور محض ایک فرد کی حیثیت سے کیا ہی نہیں جاسکتا۔وہ فرد بھی معاشرے ہی میں رہ کر بنتا ہے۔مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا انسان اپنی جملہ عقلی اور فکری قوتوں سے آگاہ ہے۔کیا وہ واقعی جانتا ہے کہ وہ کن کن روحانی بلندیوں تک پرواز کرسکتا ہے؟ کیا وہ واقعی آگاہ ہے کہ اس کی ابتدائی حیوانیت اسے کن کن پستیوں کی جانب گھسیٹ کے لے جاسکتی ہے؟

جواب واضح ہے کہ آدم اس پر قادر نہیں،آدم اپنا خالق نہیں،تو پھر اس کا خالق ہی جانتا ہے کہ اس کو کن ذرائع اوراسالیب کا پابند بنا کر راہِ اعتدال پر رکھا جاسکتا ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرمِ بے حساب کے باعث ہر معاشرے میں وقتاً فوقتاً ہادی اور پیغمبر مبعوث کیے جوخالق کی جانب سے ہدایات لے کرآتے رہے، ہر زمانے اور ہر معاشرے کی امکانی کارکردگی کے پیش نظر ضابطے نازل ہوتے رہے اوراخلاق سامنے آتے رہے۔ہر پیغمبر اپنے دور کا اوراپنے معاشرے کا بہترین انسان تھا اس لیے کہ وہ متعلق دور اور متعلق معاشرے میں خدا کی وحی کی تفسیر رہا۔وحی لفظوں میں تھی،معنی اعمال کی صورت میں جلوہ گر رہے۔تا آنکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دور آ گیا۔یہ وہ دور تھا جب اولادِ آدم مجموعا اس مرحلے پر پہنچ گئی تھی جسے سنِ بلوغ کہتے ہیں۔لاکھوں سالوں کی تربیت اورترقی نے آدم کی دانش کواب اس قابل بنا دیا تھا کہ اسے ایک مکمل ضابطے

Marfat.com

کا مالک بنا دیا جائے اور ساتھ اس مکمل ضابطے کی ایک عملی تصویر اور تفسیر بھی بہم پہنچا دی جائے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ہے۔

حضور نبی اکرمؐ کا ارشادِ گرامی ہے ادّبنی ربّی فاحسن ادبی. ۔۔۔مجھے میرے مولا نے آداب سکھائے، اور مجھے میرے مولا نے بہترین آداب سکھائے۔۔۔تو وہ آداب، وہ اسالیب، وہ طریقے اور اعمال جن کو ہم مجموعاً دین کہیں گے وہ الوہی تعلیم ہے جو خالقِ کائنات اور خالقِ اولاد آدم نے وضع کی ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض ہوا آدم خود اپنا خالق نہیں، لہٰذا آدمی کو خود آگاہی کے ضمن میں اپنی معلومات اور ذرائع معلومات پر نہ انحصار کرنا چاہیے اور نہ ان پر مغرور ہونا چاہیے۔اس لیے اولادِ آدم کے حق میں بہترین اسلوبِ حیات وہی ہے جو خدا نے اولادِ آدم کے لیے تخلیق کیا ہے۔ اور عیاں ہے کہ جس طرح خالق کائنات کی مرضی کائنات پر غالب ہے، اسی طرح اس کا قانون اور اس کا ضابطہ بھی غالب ہے۔اور اس کا ضابطہ دینِ اسلام ہے۔پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ دینِ اسلام مغلوب ہو جائے؟

اپنا ایمان یہ ہے کہ انسانی معاشروں میں آئین کا آغاز وحی ہی سے ہوا بلکہ اخلاق و آئین کا تصور ہی وحی نے دیا۔ ورنہ اخلاق اور آئین کو قبول کرنے کی اہلیت سے آدم آگاہ بھی کہاں تھا اور ہو بھی کیسے سکتا تھا۔مگر جوں جوں تربیت ہوتی گئی اور شعور بڑھتا گیا آدمی کے وجود میں ودیعت کردہ ذوقِ خودمختاری زیادہ سے زیادہ بیتاب رہنے لگا۔حکمرانی اور فرمانروائی کا جوہر بھی تو اللہ ہی نے عطا فرمایا تھا۔لیکن آدم غافل ہو ہو کر بار بار خدا کو بھول بھول جاتا رہا اور کوشش کی کہ اپنی مرضی کا آئین، اپنی ضرورتوں کے مطابق بناتا رہے۔تاہم واضح ہے کہ کوئی انسانی آئین ٹھیک طور پر متوازن نہ ہو سکتا تھا۔آدم کی فکری کاوش خود اپنے اور اپنے ابنائے جنس کے بارے میں کہاں تک معیاری ہو سکتی تھی۔نتیجہ یہ کہ ہر معاشرے نے اپنے اپنے قانون بنائے جو بعض اوقات دوسرے معاشروں کے قوانین سے مختلف تھے بلکہ متصادم تھے۔راہِ اعتدال کو بحال کرنے کی خاطر پھر وحی آئی اور کجی کو درست کرنے کا شعور بیدار کر دیا جاتا رہا۔

مگر آدمی عادات مشکل سے بدلتا ہے۔چنانچہ وہ وحی لانے والوں کی مخالفت کرتا رہا۔وہ پیغمبروں کو اذیت دیتا رہا بلکہ قتل تک کرتا رہا۔اور اگر وحی قبول بھی کر لی تو پھر اپنی جبلی حیوانیت کے

Marfat.com

مطابق رفتہ رفتہ وحی کو بھی مسخ کر کے ڈھال لیتا رہا اور پھر جب بھی اصلاح کی گئی اس نے اپنے آئین اور اپنی وضع کو بدلنے سے انکار کر دیا۔ یہود نے بھی اسی ضد اور غرور کی بنا پر انکار کیا اور نصاریٰ نے بھی۔ دونوں نے وحی کی اصل روح کو مسخ کر دیا اور اس کی حقیقی تعلیمات سے روگردانی کر کے معاشرتی ضوابط کو کہیں سود خوری کا ذریعہ بنا لیا اور کہیں وحی کے عطا کردہ اسلوبِ حیات کو محض عبادات تک محدود کر کے باقی زندگی کے قواعد و ضوابط قیصروں اور شہنشاہوں کے سپرد کر دیے۔

واضح ہے کہ ہر وحی اس لیے نازل ہوئی کہ آدمی کو بہتر سے بہتر آدمی بننے کا اسلوب سمجھایا جائے اور اسے خود اپنے ہاتھوں ضرر اٹھانے سے بچایا جائے۔ بالفاظِ دیگر اسے حیوانی سطح پر اترنے سے روکے رکھا جائے۔ انسانی معاشرے اپنے افراد کی غفلت اور ہوس کی محکومی کے باعث بار بار نیچے کو اترتے رہے۔ نتیجہ تباہی اور بربادی، خونریزی و خونخواری کی صورت میں جلوہ گر ہوتا رہا۔ اس کا تدارک اسی طرح ممکن ہے کہ خدائی احکام کی روشنی میں اسالیبِ حیات وضع ہوں، مراد ہے دینِ خدا نافذ ہو۔

چونکہ آج انسان کے پاس انسان کو تباہ کرنے کے وسائل بہت ہی زیادہ مہلک ہیں اس لیے لازم ہے کہ انسان کو پہلے سے بہت زیادہ تلقینِ احتیاط کی جائے۔ آرتھر جورس (Arthur Juris) اپنے مقالے سائنس اور اخلاقی ذمہ داری میں اس امر پر شدید زور دیتے ہیں اور حل یہی تجویز کرتے ہیں کہ آدمی کی تربیت خدائی آداب کے مطابق ہو۔ انوارِ وحی کی روشنی ہی میں وہ دستور بن سکتا ہے جو آدم کو خود اس کی تخریب کاری سے بچا سکتا ہے۔ پیٹر گرین (Peter Green) اپنی کتاب ''صحیح طرزِ عمل کے کٹھن معاملات'' (Problems of Right Conduct) میں لکھتے ہیں کہ ناتربیت یافتہ انسان، اخلاق و آداب اور عظمتِ آدم کے تصور سے ناآگاہ انسان کے ہاتھ میں ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم جیسے مہلک ہتھیار تھما دینا ایسا ہے جیسا کسی نادان اور بدتربیت دس سالہ بچے کو بارودی چھڑی دے دینا۔

ہمارے زمانے کے معروف قانون دان ڈاکٹر Paton لکھتے ہیں کہ ایک مثالی نظامِ قانون میں کون سے مفادات کا تحفظ ضروری ہے؟ یہ ایک اقدار کا سوال ہے جس میں فلسفۂ قانون کو اپنا کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ فطری قانون (Natural Law) کا مسئلہ ہے۔ لیکن اس سوال کا جواب ہم جتنا فلسفے سے حاصل کرنا چاہتے ہیں اتنا ہی فلسفے سے اس کا جواب ملنا

Marfat.com

مشکل ہے کیونکہ ابھی تک اقدار کا کوئی متفقہ پیمانہ نہیں مل سکا۔ واقعہ یہ ہے کہ صرف مذہب ایسی چیز ہے کہ جس میں ایسی بنیاد مل سکتی ہے لیکن مذہب کے حقائق کو اعتقاد یا وجدان کے ذریعے تسلیم کرنا ضروری ہے نہ کہ خالص منطقی دلائل کے زور پر۔ (Juriprudence 111 Ed.) پھر ظاہر ہے کہ یورپ نے فلسفۂ اخلاق کو بھی عمل کے بجائے محض فکری باریک بینی اور دلیل بازی تک محدود رکھا۔ وحی کے لائے ہوئے آداب اور احکام کو اعتقاد اور وجدان کی رو سے تسلیم کرنا لازم ہے۔ محض اپنے عقلی استدلال سے آدمی خدائی استدلال تک نہیں پہنچ سکتا۔ باقی بہر حال حکم ہے کہ آدم، جہان میں جو کچھ ہے اس کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کرے تا کہ وہ اپنا مقام محسوس کر سکے۔ وہ عملِ تسخیر پر کاربند رہ سکے اور حقائقِ اشیا تک رسائی حاصل کر سکے مگر خود اپنی حقیقت سے آگاہی کا درس وحی سے لے اور ظاہر ہے کامل ترین وحی قرآن ہے اور وہ آخری وحی ہے۔ کامل ترین سیرت حضورؐ کی سیرت ہے جو کامل ترین وحی کی کامل ترین اور بہترین تفسیر ہے لہٰذا اولادِ آدم کے بنائے ہوئے ہر ضابطے پر وہی ضابطہ غالب آئے گا جو قرآن وسنت کا عطیہ ہے۔ قدرتی امر ہے کہ آدمی جتنا بھی پڑھ لکھ جائے اس کے عقلی عوامل میں سب سے بڑا عامل ۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کا جذبہ اور امنگ ہوتا ہے۔ وہ انفرادی بھی ہوگا اور اجتماعی بھی۔ اس لیے محض عقل پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا اور موجودہ سائنسی ترقیوں کے عطا کردہ وسائل اور ان کے پیدا کردہ مسائل کو فقط انسانی دانش و شعور کی مدد سے حل نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر فرائڈ مین کہتے ہیں کہ تعقل تو محض جذبات و خواہشات کے ادنیٰ فرمانبردار ہوتے ہیں۔ خواہش سپردِ عقل ہوئی بن گئی دلیل۔ کون سی خواہش ہے جس کی امداد کے لیے عقلِ انسانی دلیل نہ گھڑ لیتی ہو۔

چنانچہ ضابطہ، قاعدہ، قانون، آئین، اسلوبِ حیات یعنی دین وہی کارآمد ترین، لہٰذا غالب ترین ہوگا جو آدم ساز ہو، نہ محض سرمایہ شکن اور سرمایہ کار۔ وہ دین جو آدمی کو ہر لحظہ آدمی کی حیثیت سے اپنا جائزہ لینے کی تلقین کرتا رہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے **من استوی یوماہ فھو مبغوض ومن کان یومہ خیراً من یومہ فھو محروم۔**

ہر انسانی ذہن کا اختراع کردہ ضابطہ غیر متوازن ہے لہٰذا ناپائیدار، اس میں کلیت پسندی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ ہو بھی تب جبکہ آدم کی نظر محیط ہو۔ ہر شے کا اپنے سمیت احاطہ کر سکے۔ وہ احاطہ خدا ہی کی نگاہ کرتی ہے جو خبیر ہے اور علیم۔ اس لیے حکم اسی کا۔ مگر وہ حکم قرآن کی رو سے اور آنحضورؐ کے توسط سے۔

Marfat.com

انکارِ خدا، خودشناسی سے محرومی

آدمی جسم بھی ہے اور جان بھی، جسم نظر آتا ہے، چھوا جاسکتا ہے۔ ہلایا، تولا اور ناپا جاسکتا ہے۔ مگر جان کو جس سے مراد نہ جانے کیا ہے حواس خمسہ ظاہرہ کی مدد سے محسوس نہیں کیا جاسکتا، یعنی اسے چھوا، دیکھا، سونگھا، سنا، تولا اور ناپا نہیں جاسکتا۔ اس کا رنگ نہیں بتایا جاسکتا وغیرہ۔

موٹر چلتی ہے، اس کے پرزے، نشستیں، پہیے، کمانیاں، ہینڈل، بریکیں، پٹرول یہ اور وہ سب کچھ ظاہر ہے۔ مجسم ہے۔ لہٰذا بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ لیکن وہ چیز جو موٹر کو دھکا دے رہی ہے، وہ قوت جو اسے چلا رہی ہے وہ حواس خمسہ کی گرفت میں نہیں لائی جاسکتی۔ تاہم یہ عیاں ہے کہ اس کے ہونے کا انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ آدمی اپنے بارے میں بھی جانتا ہے کہ کوئی شے ہے جو اسے چلائے ہوئے ہے، جو اسے متحرک رکھتی ہے۔ اس کی ہستی اسے معلوم ہے کہ اس کے جسمانی وجود ہی پر مبنی نہیں۔ وہ جلائے اور چلائے رکھنے والی شے نہ رہے تو ڈھانچہ بکھر جاتا ہے اور ذروں میں تبدیل ہو کر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ وہ قوت محرکہ جان ہے جو نظر نہیں آتی۔ مگر جس کے ہونے کا اقرار بہر حال لابُد ہے اس لیے کہ وہ ہے۔

زمین، چاند، سورج، تارے، سیارے، ارب ہا ارب بلکہ کھرب ہا کھرب اثیری وجود ہماری زمین سے چھوٹے بھی اور کروڑوں گنا بڑے بھی، لاکھوں کے باہمی فاصلوں کا کوئی اندازہ ہی نہیں، اتنی بے پناہ دوری ہے کہ تا حال لاکھوں کی روشنی ایک دوسرے تک نہیں جاتی اور وہ سب وسیع اثیر (آسمانی بلندیوں) میں مضبوطی سے قائم بھی ہیں اور رواں دواں بھی، کوئی وجود اپنے مدار سے بال برابر ادھر ادھر نہیں ہوسکتا، ان میں سے کسی کو کوئی ظاہری سہارا میسر نہیں جو اسے تھامے ہوئے ہو مگر ایک مقناطیسی قوت، جذبِ باہم کا باعث ہے اور وہ قوت کس قدر نپی تلی ہے۔ کتنی بے پناہ ہے، تخمینہ ممکن نہیں۔ لیکن وہ بے پناہ مقناطیسی قوت نظر نہیں آتی۔ ہمارے حواسِ ظاہری کی گرفت سے باہر ہے، تاہم وہ ہے، ہمارے وجدان میں موجود ہے، وہ ظاہر نہیں، غیب ہے۔ مگر اس کے ہونے سے انکار ممکن نہیں۔

Marfat.com

کیا آدمی بتا سکتا ہے کہ جب وہ کہتا ہے ''میں'' یا ''میرا'' تو یہ لفظ کون کہتا ہے۔ وہ کہے گا میرا دل، اچھا بھئی دل کو میرا کہنے والا کون ہے؟ ہوسکتا ہے کہا جائے۔ میری روح؟ بھئی تو میری روح کہنے والا کون ہے؟ میرا دماغ، حتیٰ کہ میرا جسم، میری جان، کہنے والا کون ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ وہ جو کہہ رہا ہے وہ روح نہیں، جان نہیں، جسم نہیں، دل نہیں، دماغ نہیں اس لیے کہ روح اپنے آپ کو میری روح اور جان اپنے آپ کو میری جان تو نہیں کہہ سکتی، وہ حقیقت کیا ہے جو اس سب کچھ کے ساتھ نسبت اور وہ بھی ایک طرح سے مالکانہ نسبت کا دعویٰ کرتی ہے۔ یہ میرا کہنے والی حقیقت یہ ''انا'' گرفت میں نہیں آسکتی یہ ہے اور بالکل ہے۔ انکار کیسے ممکن ہے؟ مگر کوئی ہے جو بتا سکے ''میں'' اور ''میرا'' کون کہتا ہے۔ آدمی کی رسائی اگر اپنی ذات کی حقیقت تک ہو جائے تو پھر خدا جانے وہ کیا ہو جائے؟

پھر اگر آدمی اپنی ہستی کی اصل تک نہیں پہنچ سکتا تو وہ اس ہستی کا احاطہ کیونکر کرسکتا ہے، جس کا از روئے وحی یہ دعویٰ ہے کہ شعور حیات رکھنے والے، اختیار وارادہ کے مالک، ہر رنگ اور حیثیت کے انسان میرے ہیں۔ زمین و آسمان میرے ہیں، جن و ملائکہ میرے ہیں، آگ، ہوا، پانی، مٹی میرے ہیں، جماد، نبات اور حیوان میرے ہیں، ساری بلندیاں اور پستیاں میری ہیں، سارے زمانے میرے ہیں، ہر ظاہر اور باطن میرا ہے، ہر شے میرے حکم کے تابع ہے، ہر شے میرے حضور میں سجدہ ریز بھی ہے اور تسبیح خواں بھی، ہر شے میری چاکری اور عبادت میں مصروف ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آدم زاد ان کی چاکری، تسبیح اور عبادت کو سمجھتے نہیں۔

ظاہر ہے کہ اگر چہ انسانی ''انا''، انسانی حواسِ ظاہری کی رسائی سے ماوراء ہے تاہم اس حقیقت کے ہونے سے انکار ممکن نہیں، تو پھر ساری حقیقتوں کی حقیقت اور ہر ''انا'' کے خالق ''انائے مطلق'' کے ہونے سے انکار کیونکر ممکن ہے؟ اور یہ ہے ایمان بالغیب، اس ہستی مطلق و تعالیٰ کا اقرار جو وجدان میں ہے مگر حواس کے بس کی بات نہیں۔

قرآن نے سورۃ بقرہ کے آغاز ہی میں واضح کر دیا ہے کہ قرآن ہر شک اور اشتباہ سے بالا کتاب ہدایت ہے جو جملہ وحیوں کا ات، تت اور ست ہے۔ مگر یہ کتاب راہبر اور ہادی ہے اہل تقویٰ کی یعنی خدا سے ڈرنے والوں، ہر بدی سے اپنے آپ کو بچانے والوں کی اور قرآنی زبان میں اہل تقویٰ وہی ہیں جنہوں نے خدا کو دیکھے بغیر مانا، جو خدا پر ایمان بالغیب لائے اور وہی ہیں

Marfat.com

جونماز قائم کرتے ہیں اور اللہ کے عطا کردہ رزق میں سے خرچ کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس سے راہ خدا میں خرچ کرنا مراد ہے۔ ذالک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین الذین یومنون بالغیب ویقیمون الصلوٰۃ ومما رزقنھم ینفقون۔ نیز وہ وہی لوگ ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اس پر جو اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر اتارا گیا اور اس پر جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل اتارا گیا اور وہ آخرت پر بھی بھرپور یقین رکھتے ہیں۔ والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالآخرۃ ھم یوقنون۔

ایک بات واضح ہے کہ ہر وہ شے جو سامنے ہے یا گرفت میں ہے وہ تو معلوم ہے یعنی ہمارے علم کا حصہ ہے، اس کا تسلیم کرنا ایک بدیہی امر کا تسلیم کرنا ہے۔ مگر جسے ایمان کہتے ہیں وہ تو ہے ہی ان دیکھے ماننے کا نام۔۔ قابلِ اعتماد قاصد کی بناء پر مان لینا، کسی صادق اور امین شاہد کی شہادت کو قبول کر کے ایمان لے آنا، بہرحال اگر ہم غور کریں تو ایمان کا سارا سلسلہ مربوط ہی غیب سے ہے اور سب سے بڑا غیب وہی ہے جو درحقیقت سب سے بڑا حاضر ہے۔ ساری حقیقتوں کا سرچشمہ مگر ہمارے مدرکات سے وراء الوارء ہے۔ پھر غیب و حاضر کے درجات بھی ہیں۔ ایک آدمی کی نظر چند سو گز تک جاتی ہے اور ایک آدمی بہت دور تک دیکھ سکتا ہے۔ اس طرح ایک کا دائرۂ نظرِ حضور و شہود سکڑ گیا اور ایک کا وسیع ہو گیا۔ ایک کا شہود دوسرے کا غیب ہو گیا۔ مراد ہے ایک کی نظر وہاں تک پہنچی جہاں تک دوسرے کی نہ پہنچی، جیسے دوربین والا شخص وہ کچھ دیکھے جو وہ نہ دیکھ سکے جس کے پاس دوربین نہ ہو۔ اسی طرح اندرونی اہلیت کے درجات ہیں۔ ایک شخص کی بصیرت کی رسائی دور دور تک ہے۔ وجدان بیدار تر ہے لہٰذا اس پر وہ کچھ عیاں ہے جو کمتر بصیرت و وجدان رکھنے والے سے پوشیدہ ہے۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی آدمی اپنے اندر کے نور پارے کو جو اللہ نے اپنی روح کے پرتو کے بطور اس کے سینے میں ودیعت کیا ہے، تربیت دے لیتا ہے۔ اس کی تقویت میں اضافہ کر لیتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے لیے دور دور تک کے غیوب، عین حقائق بن جاتے ہیں۔ وہ بہت کچھ دیکھ رہا ہوتا ہے، اس کے شہود کا حلقہ بعض اوقات یوں پھیلتا ہے کہ زمان و مکان کی ساری سرحدیں ناپید ہو جاتی ہیں۔ نہ فاصلے رہتے ہیں اور نہ سمت، مگر یہ بات عقل کے مادی حسیات پر مبنی دانش کے بس کی بات نہیں۔ خدا جانے حضرت علامہ اقبال نے جذب و مستی کی کس کیفیت میں فرمایا تھا:

Marfat.com

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری !

نہ ہے زماں نہ مکاں، لا الٰہ الا اللہ !

اورظاہر ہے کہ ہرپیغمبر اپنے دور کا فائق ترین انسان تھا، جس کی وجدانی و باطنی اہلیتیں دوسروں سے کامل تر تھیں۔ لہٰذا پیغمبر کی نظر، فکر، سماعت اور بصیرت کا حلقہ بہت ہی وسیع ہوتا ہے۔ مادی اوزار اور ہتھیار آدمی کی بصری اور سمعی اہلیت کو بڑھا سکتے ہیں مگر باطنی اور وجدانی امکان کو تربیت نہیں دے سکتے۔ کمتر اہلیت والے، اگر وہ ہٹ دھرم اور ٹیڑھے نہ ہوں، مراد ہے سلیم الطبع ہوں، تو ہر برتر تربیت والے سے فیض پاسکتے ہیں۔ خصوصاً پیغمبر سے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ ہرآدمی عموماً اپنی اپنی حدِ نظر اوراپنی دانش وبصیرت کی رسائی کو ہی آخری حدودِ ادراک جانتا ہے۔ لہٰذا اپنے سے برتر کوفوراً دروغ گو کہہ دیتا ہے اوراس کی ہر وہ بات جواس کے ذہن سے اونچی ہو، اسے کذب کہہ کر رد کر دیتا ہے۔ ہر بے بصر، صاحبِ بصیرت کا دشمن ہے۔ پھر اگر پیغمبروں کی ہر دور میں دنیا مست اہلِ غرور نے بہ تشدد مخالفت کی تو یہ بالکل طبعی امر تھا۔

وحی کی بتائی ہوئی باتوں کے باب میں وہ لوگ جو مادی تحقیقات پر نازاں رہے حقِ مخالفت ادا کرتے رہے۔ اس لیے کہ وحی نے وہ کچھ جتا دینا تھا جس تک سائنس پہنچ نہیں پائی تھی۔ آج تک بہت سے معاملات ہیں جو موجودہ سائنس کے بس میں نہیں۔ لہٰذا سائنس وحی کی تکذیب اور بطلان کرتی ہے۔ مگر وہ سائنسدان جو ایمان کی دولت سے قدرے سرمایہ دار ہیں، انہوں نے برملا تسلیم کیا کہ وحی کا وہ اور وہ ارشاد ثابت ہو چکا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سائنس کو وحی کی فلاں حقیقت تک پہنچنے میں دیر لگی ہے۔ لہٰذا وحی کی بیان کردہ دیگر باتوں کو محض اس لیے کہ ابھی سائنس وہاں تک نہیں پہنچی رد نہ کر دو۔ سابق حقائقِ وحی کے علمی اثبات کے بعد اب تو اہل علم کے لیے ایمان بالغیب نسبتاً آسان ہے اس لیے کہ دلائل و براہین اب زیادہ واضح ہیں۔ ظاہر ہے کہ وحی سے یہاں مراد قرآن ہے اوراس کی صداقت کو اب سائنسدان بھی (مگر سلیم الطبع سائنسدان) تسلیم کرنے لگ گئے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اس دور میں قرآن کا مخاطب سائنس دان ہی محسوس ہوتا ہے۔ لیکن یہ بحث طویل ہے۔

تاہم، سائنسدان خواہ کسی بھی مقام اور مرتبے کا مالک ہو، پیغمبر کے درجے کا صاحب دانش و نظر تو نہیں ہوسکتا۔ علم وسیع ہو کر بھی محدود ہے۔ لہٰذا ایمان بالغیب کے بغیر چارہ نہیں۔ رسول کریم

Marfat.com

صلی اللہ علیہ وسلم کامل ترین رسول ہیں اور اس اعتبار سے برترین انسان ہیں۔نورِ مطلق کی عطا کردہ جس ضیاء کے جذب کی اہلیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکھتے تھے وہ کسی دوسرے کے بس کی نہ تھی۔ آئندہ کا سوال ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسان اور خدا کے مابین آخری وسیلہ اور برترین وسیلہ ہیں۔اس لیے اگر قرآن کی زبان سے حضور اکرم صلی اللہ علی وسلم حیات بعد الموت کی خبر دیں تو ہم ایمان لائے ہیں کہ حیات بعد الموت ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سزا و جزائے عمل ہے۔ہم ایمان لاتے ہیں کہ ہے ہم نے قادر مطلق کو نہیں دیکھا حضور نبیؐ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو امینوں کے سرتاج ہیں اور صادقوں کے سردار فرمایا ہے کہ خدا ہے اور وہی خالق ہے وہی رب ہے وہی مالک یوم قیامت ہے۔ہم نے آمنا صدقنا کہا۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے: وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔ ''تمہیں جو علم دیا گیا ہے وہ تو بہت ہی قلیل ہے''۔آدمی اپنے مادی وسائل اور ظاہری حواس کی مدد سے خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے، اس کا علم بہرحال مخلوق کا علم ہے اور وہ محض مخلوقات کے بارے میں ہے اور پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ مخلوقات میں سے بھی کتنی مخلوقات کا علم!۔۔یہی ننھی سی دنیا جس میں انسان فی الحال آباد ہے۔خدا جانے کیا کیا کچھ چھپائے ہوئے ہے؟ اگر آدمی کو خود اپنی آواز، اپنی سانس اور اپنے وجود کی تہوں کا علم نہیں تو پھر آدمی اپنے علم پر مغرور کیوں ہے؟ جو جتنا باشعور ہو، لازم ہے کہ وہ مدرسۂ خداوندی کا اتنا ہی زیادہ بارغبت تلمیذ بنے اور علم کو اپنے ایمان سے تقویت دے۔ایمان سے وجدان کا حلقہ وسیع ہوگا جس کے مقابل مادی وسائل کے ذریعے حاصل کردہ علم کا حلقہ نہایت ہی محدود ہے اور نسبتاً ہمیشہ محدود ہی رہے گا۔

پھر یہ کہ خدا پر ایمان لائے بغیر آدم کو خود اپنے مقام و مرتبہ سے بھی تو آگاہی حاصل نہیں ہوتی۔قرآن ہی بتاتا ہے۔الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السمٰوات وما فی الارض ''کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ زمین میں اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسے اللہ نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے، تمہارے مطیع بنا دیا ہے''۔گویا خالق کائنات نے آدم کو آگاہ کر دیا ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے اس کو یوں بنایا اور ڈھالا گیا ہے کہ وہ آدم کا معاون اور خادم ہو کر رہے۔چاند، سورج اور تاروں کی گردش، تابش اور نور، موسموں کا تغیر و تبدل، ہواؤں کی ہر سمت سے اور ہر سمت کو آمد و رفت، بادلوں کا ظہور اور بارشوں کا نزول، رنگ رنگ کی اشیائے خورد و نوش کی تخلیق حتیٰ کہ سمندروں اور دریاؤں میں

Marfat.com

تازہ گوشت، سجاوٹ کے لیے ملبوسات کا سامان، سونا، چاندی، موتی، جواہر، سواری اور سفر کے لیے ہر طرح کے وسائل..... کیا اس کائنات میں خود آدمی نے ایک ذرہ بھی پیدا کر کے شامل کیا؟ کیا وہ ایک مکھی کا ایک پر اور چیونٹی کی ایک ٹانگ تک ایجاد کرنے یعنی وجود میں لانے کے قابل ہے؟ جواب واضح ہے، خالق ایک ہی ہے کائن کون ایک ہی ہے۔ وھوالخلاّق العلیم۔

اس سب کچھ کے باوصف اگر آدم خدا پر ایمان نہ لائے اور اس کے ذکر سے غافل ہو تو پھر اس سے بڑا کافرِ نعمت کون ہوگا؟ حضرت سعدیؒ نے کیا خوب کہا تھا:

آب وباد ومہ و خورشید و فلک درکارند!
تاتونا نے بکف آری و بغفلت نخوری!!!
ہمہ ازبہر تو سرگشتہ و فرمانبردار!
شرطِ انصاف نباشد کہ تو فرمان نبری!

مطلب ہے پانی ہوا، چاند، سورج اور آسمان وغیرہ مصروف کار ہیں تا کہ تیری روزی کا اہتمام کریں اور تا کہ جب تو اس روزی سے بہرہ یاب ہو تو خدا کی یاد سے غافل نہ ہو رہے۔ دوسرے شعر میں مزید وضاحت کر دی کہ کائنات میں جو کچھ ہے تیری خاطر حکم بردار اور سرگرداں ہے۔ پھر کیا اسے انصاف قرار دیا جائے گا کہ تو ہی حکم بردار نہ ہو۔

خدا پر ایمان انسان کو خود اس کی عظمت سے آگاہ کرتا ہے۔ ایمان اسے بتاتا ہے کہ خدا کے بعد تو ہی تو ہے اس لیے کہ تو خلیفہ و نائب خدا ہے۔ جو کچھ تیرے پاس ہے تو اس کا مالک ہے۔ دولت کا مالک تو ہے۔ دولت تیری مالک نہیں۔ تمام مادی وجاہتیں تیری مملوک ہیں تو ان کا مملوک نہیں۔ تو فقط ایک ذات باری تعالیٰ کا مملوک ہے۔ یہ احساس بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔ بے نیازی عطا کرتا ہے۔ دل کی شہنشاہی سے نوازتا ہے۔ بندے کو خدا کے رنگ میں رنگے جانے کی اہلیت سے سرمایہ دار رکھتا ہے اور خدا کا ارشاد ہے کہ دیکھو اللہ کا رنگ، اللہ کے رنگ سے بہتر رنگ کس کا ہے (صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ)۔

پھر جب خدا سے ایمان کا رابطہ کمزور پڑتا ہے یا ٹوٹ جاتا ہے یا سرے سے قائم ہی نہیں ہوتا تو آدمی عالم واشیاء عالم کا شہنشاہ نہیں رہتا۔ وہ اسباب و وسائل حیات کو جو اس کے مملوک ہوتے ہیں، اپنا مالک تصور کرنے لگتا ہے۔ وہ فانی اشیاء کا بندہ اور غلام ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی مادہ

Marfat.com

پرستی ہے جو آدم کے روحانی اور معنوی ارتقاء کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ اللہ پر ایمان دل کی بادشاہی، اللہ کا انکار مادی اشیا فانی کی غلامی، حیوانی سطح، ہوس کی بندگی اور شکم اول، شکم آخر:

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامان موت!
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم؟

گویا خدا پر ایمان اور خدا سے رابطہ آدم کی تعمیر کا واحد ذریعہ ہے۔ خدا کے تعلق کے بغیر اس کی خودی اس پر واضح نہیں ہوتی۔ حضرت غوث الاعظم جیلانیؒ فرماتے ہیں: الذین لایعبدون اللہ لایدرون لم خلقوا..... جو لوگ خدا کی عبودیت کا اقرار نہیں کرتے وہ تو یہ بھی جاننے پر قادر نہیں ہوتے کہ وہ پیدا کیوں کیے گئے۔

قرآن کا ارشاد ہے: نسوا اللّٰہ فانسا ھم انفسھم. ''انہوں نے خدا کو بھلایا تو خدا نے ان کا یہ حال کر دیا کہ وہ اپنے آپ سے بھی گئے، انہیں اپنا آپ بھی پتہ نہ رہا''۔ وہ خود آگاہی کی دولت سے محروم ہو گئے۔ جس کا مطلب ہے آدمی کا انکارِ خدا، عرفانِ ذات اور خود شناسی سے محرومی ہے۔ یہ شکستِ خودی ہے۔ حضرت علامہ اقبال فرماتے ہیں:

ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

خدائے احد پر ایمان سے محرومی کے باعث جب آدمی خاک کا غلام ہو کر رہ جائے تو پھر وہ آفاقی نظر کیونکر پیدا کرے۔ پھر وہ رنگ، نسل، علاقائیت وغیرہ کے اندھے تعصبات کی سطح سے اوپر کیونکر اٹھے۔ جب آدمی اپنی قدر نہ پہچانے تو دوسروں کی جان کی کیا قیمت لگائے! پھر افراد افراد کو اور اقوام اقوام کو کیوں نہ کھائیں؟ خودکشی اور اقدامِ قتل کا دور دورہ کیوں نہ ہو؟ یہ سب مادہ پرستی کے مظاہر ہیں۔ یہ سب محرومی اور انتہائی ضعفِ ایمان کی علامات ہیں؟ پھر وہ جو اپنے آپ کو قرآن والے، رسول صلی اللہ علیہ وسلم والے، ایمان والے کہتے ہیں وہ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر از رہِ خلوص سوچیں تو سہی کہ وہ ہوس کے بندے یعنی مادہ پرست ہیں یا ہر مادی غلامی سے آزاد..... ہر شے کو جان سمیت خدا کی امانت جاننے والے، خدا کے فقیر ہیں:

جو بھی اس کے فقیر ہوتے ہیں
آدمی بے نظیر ہوتے ہیں

Marfat.com

توحید اور وحدتِ اُمت

یک شو و توحید را مشہود کُن
غائبش را از عمل موجود کُن

اسلامی معاشرہ جن اصولوں پر استوار ہوا وہ کسی خاص قوم کے آداب سے ماخوذ نہ تھے۔ وہ کسی خاص قبیلے کی رسموں کا مجموعہ نہ تھے۔ وہ ایسے اصول تھے جو رنگ، نسل، جغرافیہ یا کسی حلقے یا حد کے پابند نہ تھے۔ وہ سیدھے سادے اصول تھے جو خالقِ کائنات نے اشرف المخلوقات کی رہبری کے لیے اپنی کامل ترین صورت میں اپنے آخری نبی اور رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارے تھے۔ تاکہ اشرف المخلوقات ان پر عمل پیرا ہو کر واقعی اشرف و اعلیٰ ہو سکے۔ قرآن حکیم نے دین اسلام کو جبراً نافذ کرنے کی ہدایت نہیں فرمائی۔ جو اس دین کے اصولوں کو اپنائے گا اس کا اپنا فائدہ ہوگا، جو روگرداں ہوگا اس کا اپنا نقصان ہوگا۔

ان اصولوں کا محور توحید و رسالت پر ایمان تھا۔ ایک خدا کے ماننے والے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری پیغمبر مان کر ہی ہدایت کی راہ پر ایک دوسرے کے رفیق و معاون ہو سکتے تھے۔ گویا یہ معاشرہ ایک اصولی برادری اور بھائی چارہ تھا جس میں کسی خاص وطن کے افراد یا کسی خاص نسل کے اشخاص کو برتری حاصل نہ تھی۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حبشی تھے اور صحابۂ کبار انہیں سیدنا بلال کہہ کے پکارا کرتے تھے۔ بالخصوص حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔ ابوجہل و ابولہب قریش میں سے ہونے کے باوصف اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقرباء میں سے ہونے کے باوجود مردود رہے۔

اس اصولی برادری نے ہجرت کے روپ میں وطن کو قلب و ذہن سے نکال دیا۔ فتح مکہ کے بعد بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ اپنے مولد کو اپنا وطن نہ بنایا۔ یہاں تک کہ حج کے موقع پر حضرت سعد بن وقاص بیمار ہو گئے اور دیگر اہلِ مدینہ کے ہمراہ واپس جانے کے قابل نہ رہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے دعائے صحت فرمائی اور رخصت ہونے سے قبل یہ وصیت

Marfat.com

بھی فرمائی کہ اگر سعد وفات پا جائیں تو انہیں مکہ سے باہر چند کوس مدینہ کی طرف فلاں راستے پر دفن کیا جائے۔اس لیے کہ سعد نے ہجرت کرنے والوں کے ہمراہ مکہ سے ہجرت اختیار کر لی تھی۔۔

وطن کے ساتھ ساتھ دوسرا سب سے اہم رشتہ خون کا ہے۔اسلام اصولی بھائی چارہ تھا۔اس میں شریک ہونے والوں میں مکہ کے رؤسا اور ان کے فرزند ہی نہ تھے بلکہ غریب الوطن مسافر اور غلام بھی تھے۔باپ مسلمان تھا بیٹا مشرک، بہن مسلمان تھی بھائی مشرک، خاوند مسلمان تھا اور بیوی مشرکہ، خون کو چھوڑ کر اہلِ ایمان نے اپنی جدا اخوت قائم کر لی تھی۔مدینہ شریف کے انصار جنہیں مکہ کے قریش حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اسلام کی بنائی ہوئی برادری میں شامل ہو کر خونی رشتہ داری سے قریب تر ہو گئے۔

اس اصولی برادری کو اپنی واضح ترین شکل وصورت میں غزوۂ بدر نے جلوہ گر کیا۔اس غزوہ میں اصول نے خون کو تلوار سے باضابطہ طور پر کاٹ کر پھینک دیا۔وہ لوگ جو عرب کی عصبیت سے آگاہ ہیں جانتے ہیں کہ عرب بیس بیس پشت اوپر جا کے ملنے والوں کو بھی چچیرے بھائی ہی کہا کرتے تھے اور اپنے کسی عزیز کا خون رائیگاں نہیں جانے دیتے تھے۔اُن عربوں نے اسلام قبول کیا تو خون کو خود بھی کاٹ ڈالا اور انصار کے ہاتھوں بھی کٹوا دیا۔لہٰذا روح کو فوقیت ہے یا خون کو؟ اعزہ کو اہمیت حاصل ہے یا برادرانِ اسلام کو؟ اس سوال کا غزوۂ بدر نے واضح ترین جواب دے دیا۔اس بھائی چارے کی روح ایک عرصہ قائم رہی مگر جیسا کہ ہوتا ہے

ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

مطلب یہ کہ خلافت کا مرکز کمزور ہونے لگا۔سب سے زیادہ سیاسی دھکا اس وقت لگا جب اُموی اقتدار کے خاتمے اور عباسی اقتدار کے آغاز کے ساتھ ہی سیاسی وحدت تقسیم ہونے لگ گئی اور پھر رفتہ رفتہ عالم یہ ہو گیا کہ اسلامی علاقوں میں پائی جانے والی مختار اور نیم مختار ریاستیں شمار سے باہر ہو گئیں۔

مگر اس ظاہری سیاسی تقسیم سے دھوکا ہرگز نہ کھانا چاہیے۔تاریخِ تمدن وتشریعِ اسلام گواہ ہے کہ اس ملت کا سوادِ اعظم ہمیشہ ایک ملت رہا ہے۔علاقے مادی مظاہر تھے، عقائد روحانی عناصر تھے۔علاقے بٹ سکتے تھے مگر روح غیر منقسم رہی۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ مسلمانوں کا دینی انداز جو ایک خاص تہذیب کا مؤسس تھا اپنے اثرات ہر مسلمان قوم و ملک کی جانب روانہ کرتا رہا۔

Marfat.com

مدارس اور یونیورسٹیاں تمام مسلمانوں کے لیے مشترک تھیں۔کوئی کاشغر والا فسطاط میں تعلیم حاصل کرتا تو اسے کوئی نہ روکتا۔اساتذہ ساری ملت کے اساتذہ تھے۔وہ کسی بھی خاک سے نمودار ہو کر کسی بھی اسلامی ملک میں اعلیٰ سے اعلیٰ علمی اور قضائی بلکہ انتظامی منصب بھی حاصل کر سکتے تھے۔

مسلمانوں کے تجارتی قافلے چین کے شمال سے لے کر بلکہ بقول ابن بطوطہ وہاں سے لے کر جہاں سال بھر برف جمی رہتی تھی مراکش تک جاتے تھے اور وہاں سے کشتیوں کے ذریعے اندلس کی راہ لیتے تھے۔مراکش و مصر سے افریقہ کے اندرون میں قوافل چلتے تھے۔یہ قوافل محض تجارتی قوافل نہ تھے۔یہ حقیقتاً تہذیبی، ثقافتی، علمی اور دینی وفود تھے۔یہ قوافل خالی خام یا تیار عام مالِ تجارت ہی نہیں بلکہ خطاطی، نقاشی، جلد سازی وغیرہ کے نمونے بھی لے کر چلتے تھے۔عمارتوں کے خاکے ہمراہ ہوتے تھے۔اہلِ علم اور اہلِ دیں کی کہانیاں ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔تصنیفات ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچتی رہتی تھیں۔آج اہلِ مغرب حیران ہیں کہ مسلمانوں نے ازمنہ وسطیٰ میں باہم ربط کیونکر قائم رکھا۔یہ لوگ کیونکر آگاہ رہتے تھے کہ کس علم میں سب سے زیادہ مستند اور فائق عالم کہاں ہے۔کس علم میں کون سی کتاب معتبر ہے۔اہلِ یورپ ہمارے تجارتی قوافل کی تہذیبی اور دینی اہمیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ترکستان کے امراء مصر کے علماء کی موعودہ تصانیف ریزرو کروا لیتے تھے۔عراق و شام و خراسان والے اندلسی مصنفین کی کتب کے اولین نسخے اپنے لیے مخصوص کرا لیتے تھے اور منہ مانگا معاوضہ دیتے تھے۔ہر شہر میں کاتب و خطاط موجود تھے۔کتابیں نقل در نقل ہوتی اور پھیلتی چلی جاتی تھیں۔لکھنے والا مراکشی و اُندلسی ہوتا تھا اور حواشی کوئی ترک صغدی یا کاشغری یا کاشانی مرتب کر رہا ہوتا تھا۔

ان تجارتی قوافل سے بھی برتر جو چیز ملت کو روحانی اور تہذیبی طور پر ایک ملت بنائے ہوئے تھی وہ بیت اللہ شریف کی مرکزیت تھی۔اس مرکز پر دنیا کے ہر گوشے سے مسلمان فریضۂ حج ادا کرتے تھے۔کسی ایک مقام کو ایسی مرکزی حیثیت کسی بھی دین میں حاصل نہیں۔یہاں پہنچ کر ہر نسل اور ہر علاقے کے افراد ایک برادری بن جاتے تھے۔چنانچہ ان کا عمل بین الاقوامی اور بین الاسلامی ہوتا تھا۔ان کی تحریروں سے آفاقیت کی بو آتی تھی۔یہاں فقط گلستانِ سعدی کا حوالہ ہی کافی ہے۔حضرت سعدی کا دور طوائف الملوکی کا دور تھا۔عالمِ اسلام میں خصوصاً مشرقِ وسطیٰ اور ایران و خراسان میں عالم یہ تھا کہ تقریباً ہر دو بڑے شہروں کے بعد سلطنت کسی اور کی تھی۔اس

Marfat.com

کے باوصف شیخ سعدی کی گلستان میں جو قصے مندرج ہیں، جن مجالس کا تذکرہ ہے اور جن افراد کی تصاویر پیش کی گئی ہیں، وہ نیل کے ساحل سے لے کر کاشغر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ حضرت سعدی ہر جگہ سکھ اور چین میں تھے۔ گویا یہ سارا علاقہ جو ہزاروں مربع میل لمبا چوڑا ہے ایک ہی وطن تھا۔ سوال یہ ہے کہ سیاسی حد بندیوں نے ملت کو کب تقسیم کیا تھا۔ سیاسی حد بندیاں زیادہ سے زیادہ انتظامی وحدتیں قرار دی جاسکتی ہیں اور بس۔

تاریخ اسلام کا ایک عجیب وغریب پہلو یہ ہے کہ جس مردِ مسلمان نے جہاں بھی سر نکالا اور عظمت حاصل کی، خواہ کسی بھی میدان میں ..... سوادِ اعظم نے اس سے اثر قبول کیا، خواہ وہ شخص فلسفی تھا، طبیب تھا، صوفی تھا، محدث ومفسر تھا، قاری تھا، فقیہہ تھا، مورخ تھا، سیاح تھا، بادشاہ تھا اور وزیر تھا..... یہاں اسماء نہیں گنواتا اس لیے کہ کون کون سے مسلّمی گنوائے جائیں۔ اس گئے گزرے دور کی مثال لے لیجئے۔ محمد علی کلے امریکہ کے نیگرو ہیں۔ انہوں نے باکسنگ میں نام پیدا کیا ہے۔ چنانچہ عالم یہ ہے کہ ہر اسلامی ملک میں ان کی فتح پر خوشی منائی جاتی ہے۔ مسلمان مرد وزن مسرور ہوتے ہیں۔ مبارکباد کے تار دیتے ہیں۔ اور ان کے ہر ابتلا پر اظہارِ تشویش کرتے ہیں۔ محمد علی کلے نہ مصر کے باشندے ہیں نہ انڈونیشیا کے، نہ ایران کے نہ ترکی کے، آخر یہ کون سی چیز ہے جو اس گئے گزرے دور میں بھی ہمیں دوسری قوموں سے جدا کیے ہوئے ہے۔ نپولین پر تو آج تک کوئی روسی یا انگریز فخر نہ کر سکا مگر صلاح الدین ایوبی اور موسیٰ بن نصیر تمام عالمِ اسلام کے ہیرو ہیں۔ ان کے بھی جن پر وہ حملہ آور ہوئے تھے۔

مسلمانوں کو ایک ملت بنائے رکھنے میں عربی زبان کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ تمام علمی اور تہذیبی اور دینی مسائل پر عربی زبان ہی میں اظہار خیال کیا جاتا تھا۔ صدیوں تک یہی حالت رہی۔ مصر سے لے کر مراکش تک غیر عرب علاقے عرب بن گئے۔ اندلس عرب بن گیا۔ سوڈان، صومالیہ، موریتانیہ عرب بن گئے۔ اور مشرقی علاقوں میں اُموی اقتدار کے خلاف اگر ردِ عمل اس قدر شدید نہ ہوتا تو یہاں بھی ویسی ہی نہیں تو اس سے خاصی حد تک ملتی جلتی حالت جلوہ گر ہوتی۔ اس کے باوصف عربی نے مشرق میں آریائی رسم الخط بدل دیے۔ فارسی اُردو کا رسم الخط عربی ہے۔ کمالی عہد سے قبل کا ترکی خط بھی عربی ہی تھا اور عالم یہ تھا کہ غیر عربی زبان میں اسلامی کتب علمی بھی عرب اور دوسری زبان والے مسلمانوں کے لیے سمجھنا مشکل نہ تھیں۔ اس لیے کہ علوم کے سرچشمے مشترک

Marfat.com

تھے اور تمام علمی، فلسفیانہ، صوفیانہ اور فقیہانہ اصطلاحات کا اشتراک غیر عربی کتب کو بھی بیگانہ نہ ہونے دیتا تھا۔

لیکن کسی چیز کی قدر اسی وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ چھن جاتی ہے۔ چنانچہ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں مسلمان ریاستیں فرنگیوں کی غلام ہونا شروع ہوئیں تو باہمی رابطے کٹ گئے۔ بیسویں صدی کے ربع اول تک یہ دوری مکمل ہوگئی۔ جب فرنگیوں نے پاسپورٹ نافذ کیے اور تجارتی قوافل کا سلسلہ ختم ہوگیا تو مسلمانوں کو پتہ چلا کہ وہ ایک ملت تھے اور اب بٹ گئے ہیں یا یہ کہ بانٹ دیے گئے ہیں۔ چنانچہ ملا جمال الدین افغانی پہلے اہم شخص ہیں جنہوں نے ملت کے اس احساسِ کرب کو ''پین اسلامزم'' کے نعرے میں نمایاں کیا اور مسلمانوں کی ایک جمعیت قائم کی جس کا صدر مقام مکہ تھا۔ اُس جمعیت کا نام اُم القریٰ تھا۔

یہ احساس کہ ہم بٹ گئے یا بانٹ دیے گئے اس وقت اور بھی شدید ہوگیا جب فرنگیوں کی مسلط کردہ زبانوں کے باعث ہم غیر عرب لوگ اپنی اپنی زبانوں سے بھی کسی حد تک اور بڑی حد تک عربی زبان سے کٹ گئے۔ چنانچہ اب ہر اسلامی ملک کی جدید علمی اصطلاحیں اُسی ملک میں سمجھی جاسکتی ہیں۔ ذہنی اشتراک ختم ہوتا جارہا ہے۔ یہ نہایت خطرناک بات ہے۔ حالت یہ ہے کہ خود ہمارے عرب بھائی بہت سی علمی اصطلاحات کو افرنگی زبانوں سے لفظی ترجمہ کرکے قبول کرنے لگ گئے ہیں اور وہ یہ تکلیف نہیں کرتے کہ اپنے یہاں کی قدیم اصطلاحات تلاش کریں یا ان کی روشنی میں نئی اصطلاحات وضع کریں۔ نتیجتاً ذہنی بُعد میں اضافہ ہورہا ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ ہر غیر عرب اسلامی ملک میں عربی کو زیادہ سے زیادہ مروج کیا جائے اس لیے کہ وہی قرآن کی زبان ہے۔ وہی رسولِ خدا کی زبان ہے اور وہی بے حد و بے حساب علمی ذخیرۂ مشترک کی زبان ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مختلف اسلامی ممالک کے علمی اور تحقیقی اداروں کے مابین کسی نہ کسی طرح کا اشتراک نہایت ضروری ہے تاکہ علمی اصطلاحات ایک سی رہیں اور ذہنی قرب ازسرِ نو اجاگر ہوسکے۔

اس گئے گزرے دور میں بھی حق یہ ہے کہ ہر اسلامی ملک کے عوام دوسرے اسلامی ممالک کے عوام سے دور نہیں۔ رشتۂ دین مضبوط ترین رشتہ ہے۔ دین روح ہے اور لطیف شے ہے۔ وہ ہر بندی سے بلند ہے۔ رنگ، خون، وطن مادی معاملہ ہے۔ ان دو عناصر کا امتزاج ضروری ہے۔

Marfat.com

اگر مادہ مسلط ہو گیا تو ملبہ ملبے کی طرف لوٹ جائے گا اور ہر علاقے کے مسلمان اپنی دھرتی کی پوجا کرنے لگ جائیں گے۔ دین مسلط رہے تو تمام عالمِ اسلام ایک وطن ہے۔ دین کو برتر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر اسلامی ملک میں کام کرنے والی خالصتاً اسلامی جمعیتیں جو ملت کے تصور پر ایمان رکھتی ہیں باہم مربوط ہوں۔ مؤتمر عالمِ اسلامی کی طرح بہت سے ادارے چاہئیں جو ملّی تصور کا احیاء کریں۔ اسی مقصد کے تحت یہ ہمارا ادارہ وجود میں آیا ہے۔

اگر ہم وحدت کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھتے تو ہمیں بیت المقدس سے محروم نہ ہونا پڑتا۔ بیت المقدس جو ہمارا پہلا قبلہ تھا۔ جہاں انبیاء علیہم السلام کے مزارات ہیں۔ جہاں مسجد عمرؓ ہے۔ جہاں حضرت بلالؓ کا روضہ مبارکہ ہے۔ ملت اب بھی اگر ایک نہ ہوتی تو تمام اسلامی ممالک میں عربوں کی ہزیمت پر سوگ نہ منایا جاتا۔ حتیٰ کہ ایران اور ترکی نے بھی برملا عربوں کا ساتھ دیا حالانکہ بعض عرب ریاستوں نے انہیں بری طرح چڑا رکھا تھا۔ مگر اس رشتۂ اتحاد کو قوی تر کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ تقریباً ہر اسلامی ملک کا غیروں سے بھی کوئی نہ کوئی مسئلہ الجھا ہوا ہے اور اپنوں سے بھی۔ اگر ہمارے اتحادی رشتے مضبوط تر ہوں تو غیروں سے عزت مندانہ تصفیے کرائے جاسکتے ہیں اور باہمی جھگڑے بھی مصالحت کی فضا میں طے پاسکتے ہیں۔ کشمیر خار رگِ جاں ہے۔ اریٹریا کے مسلمان حبشہ کے ستم کا شکار ہیں۔ آج نائجیریا کے اتحاد کا معاملہ ''ادیس ابابا'' میں طے ہو رہا ہے جہاں مسلم کش حکومت برسرِ کار ہے۔ یہ ایک ملتِ مشرکہ و کافرہ کی دسیسہ کاری ہے جس کے خلاف ہمیں متحد اُصف آرا ہونا ہے۔ نائیجریا کے دو سپوت جو عالمِ اسلام کے لیے مجتمعاً لائقِ فخر تھے غیروں کی سازش کا شکار ہو گئے۔ وہ دو سپوت سر ابوبکر تفاوا اور احمد و بیلو تھے۔ ان کے جانے سے وہ ملک اہلِ اسلام کے ہاتھ سے نکل گیا جو افریقہ کا سب سے بڑا اسلامی ملک تھا۔ مسلمانوں نے ان دو بزرگوں کی جانکاہ موت کا کوئی قابل لحاظ نوٹس نہیں لیا۔ یہ اجتماعی اور ملّی جرم ہے۔ تو اب کیا اسرائیل، بھارت، یونان، امریکہ، برطانیہ اور دیگر استعمار پسند ممالک کی ستمرانی جو مختلف اسلامی ممالک کے خلاف عمل پیرا ہے ہمیں کسی مشترک خطرے کا احساس نہیں دلاتی؟ کیا مشترک خطرہ بھی ہمیں رشتۂ اشتراک و اخوت میں نہیں پرو سکتا؟

معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ حرم خیز

Marfat.com

بعثتِ نبوی اور روحانی انقلاب

قرآن اگر آدمی کے دل میں اترے تو حق یہ ہے کہ اس کا رویہ ہی اور سے اور ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال نے قرآن ہی کے بارے میں کہا تھا:

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود!
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود!

جب قرآن جان میں داخل ہوتا ہے تو جان وہ نہیں رہتی جو پہلے ہو۔ وہ کچھ اور ہی شے بن جاتی ہے اور جب جان میں تبدیلی در آئے تو پورا جہاں بدل جاتا ہے۔ اس لیے کہ کائنات میں ہمارا موقف اور ہماری پسند و ناپسند ہمارے رویے پر منحصر ہے۔ جب سرے سے موقف ہی میں انقلاب آ گیا تو ماحول پر پڑنے والی نظر بھی بدل گئی۔ اس لیے اشیا اس طرح نہ دکھائی دیں جس طرح دکھائی دیا کرتی تھیں۔

قرآن کریم کی دعوت یہ ہے کہ بندہ خدا کو پہچانے، خدا کو مانے اور پھر خدا کے احکام پر عمل کرے۔ خدا نے جن امور سے دور رہنے کا حکم دیا ہے ان سے دور رہے۔ اس طرح آدمی دنیا کے معاملات پر نظر ڈالتا ہے تو اس اعتبار سے کہ کون سا معاملہ خدا کی خوشنودی کا باعث ہوگا اور کون سا معاملہ خدا کی ناخوشنودی کا سبب بنے گا۔ گویا معاملات کے باب میں حلال و حرام کا معیار داخل ہو گیا۔ پسند و ناپسند آدمی کی اپنی نہ رہی۔ قرآن کے عطا کردہ معیار نے پسند و ناپسند کا زاویہ ہی بدل دیا۔ قرآن نے حقوق و فرائض بھی واضح کر دیے۔ اس طرح ہر آدمی کی حدودِ عمل بھی معین ہو گئیں۔ آدمی کا حق یہ بھی ہے اور وہ بھی۔ مگر اِس اور اُس حد تک، اس سے زیادہ نہ یہ نہ وہ۔ اسی طرح آدمی پر کچھ فرض بھی عائد ہوتے ہیں اور ان میں بھی معیار حسن و خوبی قرآن پیدا کرتا ہے۔

انسانی طبیعتوں کے اندر انقلابی ردعمل کا بہت بڑا محرک تقویٰ ہے۔ تقویٰ کے عمومی معانی ہیں خوفِ خدا، پرہیز گاری، بدی اور بدکاری سے پرہیز۔ اسوۂ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حتی الامکان زیادہ پیروی حتیٰ کہ کامل پیروی کا مرحلہ آ جائے۔ غضب الٰہی اور اپنے مابین

Marfat.com

اوٹ پیدا کر لینا۔ ہر اس شے سے بچنا جو سزا کا ہدف اور مستوجب بنا دے۔ رزق حرام سے پرہیز، اپنی حلال کی کمائی میں سے اہلِ حاجت پر خوش دلی کے ساتھ انفاق، حق کی پاسداری کے لیے ہر دم تیاری وغیرہ۔

مگر سیدھی سی بات ہے کہ خدا کے غضب سے بچنے اور خدا کی رضا حاصل کرنے کی خواہش اسی دل میں پیدا ہوگی جو خدا پر ایمان رکھتا ہو، جو قرآن کو خدا کی کامل ترین اور آخری کتاب ہدایت مانتا ہو اور جو از روئے دل اقرار کرتا ہو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ کے کامل ترین رسول ہیں اس لیے آپ کی لائی ہوئی ہدایت مکمل ترین اور بہترین ہدایت ہے۔ اب نہ اور کوئی ہدایت نازل ہوگی اور نہ کوئی رسول مبعوث ہوگا۔ واضح رہے کہ اگر کسی آنے والے کی توقع برقرار رہے تو ہدایت جو میسر آئی ہے اس کے ضمن میں آدمی قدرے بے پرواہ سا ہو جاتا ہے۔ فرض کرنے لگتا ہے کہ ابھی کوئی اور ہدایت نازل ہوگی۔ ابھی کوئی اور ہادی آئے گا جو موجودہ وحی کی کمزوریاں دور کر دے گا اور اس وحی پر مبنی طریق عمل میں رنگ جدید بھر دے گا لہٰذا جب تک وحی کے کامل ترین ہونے کا یقین نہ ہو اور جب تک ہادی برحق نبی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے اکمل ہونے پر اطمینان کامل نہ ہو نہ اتباع کامل ہو سکتا ہے اور نہ تقویٰ معیاری۔

یہاں سے یہ بات بھی نکلی ہے کہ سابق امتوں کے افراد میں سے کسی کا بھی معیار ایمان و تقویٰ اس درجے کا ہو ہی نہ سکتا تھا جس درجہ ایمان وتقویٰ پر پہنچنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے افرادِ امت کے لیے ممکن ہے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن نے روحوں میں داخل ہو کر روں روں کے اندر جو ردعمل پیدا کیا اس نے آدمی کو ایک نئے شعور اور نئی نظر سے نوازا۔ لہٰذا مومن کے نزدیک بڑا وہ قرار پایا جو خدا کے فرمودات کی روشنی میں بڑا نظر آیا۔، خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے: انّ اکرمکم عنداللّٰہ اتقٰکم. خدا کے حضور امت میں معزز ترین وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ قرآن دل میں نہ اترا ہو تو معزز وہ ہوتا ہے جو زوردار قبیلے والا ہو۔ زور والا ہو، جو طاقت کے بل بوتے پر غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط منوا سکتا ہو، اور جس کے پاس دولت کی فراوانی ہو، خواہ وہ حرام کی ہی کمائی ہو۔ اگر قرآنی معیار پیش نظر نہ ہو تو صاحب زر بڑا ہی معزز فرد ہوتا ہے۔ دولت کی بدولت اچھے سے اچھا محلِ سکونت تیار سکتا ہے۔ بہتر سے بہتر سواریوں میں سوار ہو کر شان دکھا سکتا ہے۔ بڑوں کی بڑی شاندار ضیافتیں کر سکتا ہے۔ دولت کے بل پر انتظام بحال رکھنے والی اسامیوں پر

Marfat.com

فائز عہدے داروں کو متاثر کرسکتا ہے۔ لہٰذا اس کا ظلم ظلم نہیں رہتا۔ اس کی زیادتی زیادتی نہیں رہتی۔ بالفاظ دیگر گویا مجلسی زندگی میں قانون اور ضابطہ فقط بے زور اور بے زر کے لیے ہی واجب الاحترام رہ جاتا ہے اور وہی اس کی گرفت میں بھی آ سکتا ہے۔ مگر قرآن جو ضابطہ عطا کرتا ہے اور اس کی تعلیم جو رویہ پیدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ خوفِ خدا سب سے بڑا اصول اور سب سے بڑی دانش وحکمت ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی ارشاد ہے اور اسی دانش وحکمت میں عزت پوشیدہ ہے۔

دعوتِ قرآنی نے جہاں جہاں دلوں کو بدلا وہاں وہاں اچھائی وہ نہ رہی جسے کنبہ یا قبیلہ یا سردارِ قبیلہ اچھا کہے اچھائی وہ نہ رہی جسے حاکم اچھا کہے۔ اچھائی وہ قرار پائی جسے خدا اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اچھائی کہیں۔ بالفاظِ دیگر معیار کسی بھی فرد کی مرضی پر منحصر نہ رہے خواہ وہ کسی بھی قوت ومنصب کا مالک ہو۔ اسی انداز میں برائی وہ نہ رہی جسے کوئی قبیلہ یا اربابِ حکم برائی قرار دیں بلکہ برائی وہ ہے جسے خدا اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے برائی قرار دیا ہو۔ یوں اگر دیکھیں تو قرآن کریم نے انسانی معاشرے کی مرضی سے نیکی و بدی، بلندی اور پستی، حلال اور حرام، عزت اور ذلت کے معیارات ہی چھین لئے۔ ان کی جگہ وہ معیار دیے جو سب کے لیے ہوں۔ مراد یہ کہ قرآن نے انسانی معاشرے کو اصول عطا فرمائے۔ ان اصولوں کے ساتھ تعاون خیر ہے اور ان اصولوں کی مخالفت شر ہے۔ خیر سے یہ تعاون قرآن کی زبان میں برّ ہے یعنی نیکی، بھلائی۔ دوسروں کے لیے بہتری کی خواہش۔ دوسروں کے لیے ایثار، مطلب یہ ہوا کہ اگر قرآن دلوں میں اترے تو انسانی افراد اور معاشرے اعلیٰ اخلاقی زندگی گزارنے کے لائق ہو سکتے ہیں۔ تمام قبائلی، نسلی، وطنی اور جغرافیائی امتیازات اور تعصّبات ختم ہو سکتے ہیں۔ جہاں قبائلی زندگی کا طریق رواج پذیر ہو اور قرآنی اصول پیش نظر نہ ہوں، قرآن پر ایمان ویقین کی دولت میسر نہ ہو، وہاں افراد قبیلہ کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ ہر وہ امر جو اپنے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے وہی درست ہے۔ اپنے قبیلے کے افراد کی غلطی کسی دوسرے قبیلے کے باب میں، کوئی غلطی نہیں۔ دوسروں کے ضمن میں اس کے ظلم کوئی ظلم نہیں۔ اپنے قبیلے کے مقابل دوسروں کا حق کوئی حق نہیں ہے۔ اس احساس کو ابن خلدون کی زبان میں عصبیت کہتے ہیں۔ اسی کا دوسرا روپ تعصب ہے اور ظاہر ہے کہ تعصب آج بھی کارفرما ہے۔ اور بظاہر بڑی مہذب اور متمدن اقوام میں کارفرما ہے۔ ایک جرمن کے نزدیک کسی جرمن کی

Marfat.com

کسی بھی دیگر قوم کے کسی فرد کے حق میں زیادتی کوئی زیادتی نہیں۔ غیروں کے باب میں انگریز قوم کی ہر تعدی اور ظلم انگریز کی نظر میں عین انصاف۔

آج جنوبی افریقہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جنوبی افریقہ کے گورے افراد کے نزدیک ان کا گورا ہونا ان کو حق دیتا ہے کہ کالوں کو انسان ہی نہ جانیں۔ لہٰذا جنوبی افریقہ کے گورے افراد کے تعصب یا عصبیت کی نگاہ میں کالے لوگوں کی شبانہ روز عمل میں آنے والی تباہی کوئی زیادتی نہیں۔ یہ عصبیت یا تعصب کی ایک مثال ہے۔ اور قرآن تو دلوں میں یہ انقلاب پیدا کرنے آیا تھا کہ کسی گورے کو کالے پر کسی کالے کو گورے پر اگر ترجیح حاصل ہے تو اس کا انحصار محض اس کے کالے یا گورے ہونے پر نہیں بلکہ اس کے نیک عمل ہونے پر ہے۔ اس کا انحصار برے اعمال سے بچنے پر ہے۔ اس اعلیٰ اصول کے جزو جان بن جانے کا نام قرآنی دعوت کا پیدا کردہ انقلاب قرار پایا اور قرار پائے گا۔

اس طرح اگر ہم دیکھیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ اگر قرآنی انقلاب دلوں میں رونما ہو تو عام انسان اپنے قبیلے اور نسل کی سطح سے بلند ہو کر روحانی اور اصولی برادری کا رکن بن سکتا ہے۔ اور انسان کو خدا نے اس امر پر قادر ہونے کی اہلیت سے نوازا ہے۔ انسان جب تک حیوانی سطح پر رہتا ہے وہ حیوانوں کی طرح اپنے پیٹ اور اپنے ریوڑ سے محبت کرتا ہے۔ بالعموم اپنی ہی جنس کے مجمع میں خوش رہتا ہے۔ اگر خدائی احکام جزو جان نہ بنیں تو انسان حیوانی سطح سے کمتر ہی بلند ہو سکتے ہیں۔ خواہ بظاہر وہ کتنی ہی متمدن زندگی کیوں نہ گزارتے ہوں۔ مگر جونہی گروہی، یا قبائلی یا نسلی مسئلہ سامنے آتا ہے ان کی حسِ حیوانی، جو روحانی قوت سے محروم ہوتی ہے، مزاج پر مسلط ہو جاتی ہے۔

قرآن کریم نے اہل عرب کو قبائلی عصبیتوں کی زہرناکی سے نجات دے کر ایک اصولی اور روحانی زندگی بسر کرنے کے قابل بنا دیا۔ چنانچہ اللہ نے اہل عرب کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا کہ یہ تم لوگوں پر اللہ کی رحمت تھی کہ تم ہدایت یاب ہوئے۔ تم تو اپنی قبلِ اسلام کی زندگی کے باعث تباہی کے بھاڑ تک پہنچ چکے تھے۔ اللہ کی رحمت نے تمہیں اس صورت حال سے نجات دی اور تم لوگ اس قبائلی زندگی اور عصبیت کی کوتاہ نظری اور خونخواری سے بلند ہو کر بھائی بھائی بن گئے۔ یہ بھائی بھائی بننا روحانی بھائی چارہ تھا۔ یہ روحانی اخوت تھی اور ظاہر ہے کہ روحانی اخوت وہی ہوتی

Marfat.com

ہے جس میں سب انسان انسان ہونے کی حیثیت سے برابر ہوں۔ حقوق کے باب میں بھی اور فرائض کے ضمن میں بھی۔ اللہ کا یہ فضل و کرم واقعی عظیم فضل و کرم تھا جس نے قبائل کو امت بنا دیا۔ جس نے دشمنوں کو یہی نہیں کہ دشمن نہ رہنے دیا، الٹا انہیں بھائی بھائی بنا دیا اور بھائی چارہ بھی وہ جو خونی اور مادی نہ تھا جس کو اپنی اغراض متغیر کر دیتی ہیں اور نفسانی اغراض کے غلبے کے باعث یہ رشتہ ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ خونی عداوت میں بدل جاتا ہے لیکن یہ روحانی رشتہ اگر واقعی کہیں استوار ہو تو وہ حرص اور غرض پر استوار نہیں ہوتا۔ اس رشتے میں اگر اتار چڑھاؤ رونما ہوگا تو اس کی بنا اصولی اور روحانی ہوگی۔ یہ خالی ہوس اور غرض کی کارفرمائی نہ ہوگی۔

عیاں ہے کہ جس معاشرے میں اصول نافذ نہ ہوں وہاں افراتفری در آتی ہے اس لیے خصوصاً جہاں اصول وحی کی روشنی میں مرتب اور نافذ نہ ہوں وہاں اصول اور اس کے ضابطے موم کی ناک سے زیادہ پائیدار نہیں ہوتے اور ظاہر ہے کہ موم کو ذرا سی آنچ ہر پیکر میں ڈھل جانے کا اہل بنا دیتی ہے، وہ اصول اور ضابطے بڑوں اور زور والوں کے لیے نہیں ہوتے۔ فاطمہ بنی مخزوم سے سرقہ سرزد ہوا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سفارشیں پہنچیں حتیٰ کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ خادمِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض اکابر قریش کے کہنے پر درگزر کی سفارش کی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب مبارک یہ تھا کہ تم لوگوں سے قبل جو امتیں برباد ہوئی ہیں وہ اسی لیے برباد ہوئی ہیں کہ ان کے یہاں چھوٹوں کو جرم کی سزا دی جاتی تھی اور بڑے ارتکابِ جرم کرتے تو ان سے درگزر کی جاتی تھی۔ واضح ہے کہ مجرم فقط مجرم ہے اس کی کوئی اور کچھ بھی حیثیت ہو خواہ وہ قریب ترین رشتہ داروں ہی میں سے کیوں نہ ہو۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

''انصاف کرو، انصاف عمل میں لانا تقویٰ کے قریب ترین عمل ہے''۔

خدا کے حضور معزز بنا دینے والی خصلت یعنی تقویٰ کا عدل گستری سے قریب ترین رابطہ ہے۔ اس لیے کہ عدل ہی پر سوسائٹی کا توازن منحصر ہے۔ عدل نہ ہو تو افراتفری اور بے آئینی بڑی سے بڑی اور مضبوط سے مضبوط سوسائٹی کو کھا جاتی ہے۔ اسی لیے قرآن کریم کا ارشاد ہے:

''بات کرو تو انصاف کی بات کرو خواہ معاملہ کسی قریبی رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو''۔

Marfat.com

عملِ انصاف خونی رشتے کی پاسداری سے تو دور کر دیتا ہے مگر خدا کے قریب ترین پہنچا دیتا ہے اس لیے کہ اگر انصاف عمل میں نہ آئے تو خدائی نظام کیسے نافذ ہو اور عالم انسانیت سکھ کا سانس کیونکر لے؟ اور پھر آدمی کو صحیح معنوں میں آدمی بننے کے لیے مناسب ماحول کیونکر میسر آسکے؟

ظاہر ہے کہ جب تک خدا پر کامل بھروسا نہ ہو اور ایمان کی حقانیت کے باب میں کامل اطمینان نہ ہو اس وقت تک نہ حق کہنا کسی کے لیے ممکن ہے اور نہ حق نافذ کرنا۔ مختلف خوف اور مختلف وسوسے انصاف اور اصول کی ترویج و تنفیذ کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں چنانچہ خدا کا ارشاد ہے:

''اگر تم سچے مومن ہو تو پھر لوگوں سے نہ ڈرو فقط مجھ سے ڈرو''۔

اسی طرح قرآن کریم کا ارشاد ہے:

''جو لوگ ہماری نازل کردہ کتاب میں شامل احکام کی روشنی میں حکم صادر نہیں کرتے اور اس طرح عدل کو کام میں نہیں لاتے وہ تو سراسر کافر ہیں''۔

دوسری جگہ یہی الفاظ دہرائے گئے اور آخر میں ارشاد فرمایا:

''وہ تو بڑے ظالم اور حدود شکن لوگ ہیں''۔

تیسری جگہ یہی الفاظ ارشاد ہوئے اور آخر میں فرمایا:

''وہ تو بڑے فاسق ہیں، مراد ہے بدعمل اور عہد شکن لوگ''۔

غرض قرآن دلوں میں اس قسم کا انقلاب بپا کرنا چاہتا ہے جو آدمی کو اصولی بنا کر اور حیوانی سطح سے اٹھا کر انسانی درجے پر فائز کر دے اور اس کے لیے لازم ہے کہ ہر شخص اپنی ذمہ داری پہچانے اور قبول کرے۔ نیز یہ کہ جس معاشرے میں یہ خدائی عدل و انصاف نافذ ہو اور جہاں لوگ سکھ کا سانس لے رہے ہوں اس معاشرے کو اسلام سے محروم یا اسلام پر ایقان سے محروم گروہوں اور معاشروں سے محفوظ رکھنے کے لیے ہر دم چوکس رہنا بھی ضروری ہے اور بوقت ضرورت جان و مال کی ہر طرح سے قربانی کر گزرنا لازمی ہے۔ یہ فرد کی انفرادی ذمہ داری بھی ہے اور اجتماعی بھی، اس کیفیت اور صورت کا نام جہاد ہے۔ قرآن نے قبائلی لڑائیوں اور گروہی خصومتوں سے بلند کر کے مسلمانوں کو ایک امت بنایا یا امت بننے کا بلند اصول پیش کیا۔ اب امت

Marfat.com

کو وجود میں لانے کے لیے راہ ہموار کرنا اور اس راہ میں ہر طرح قربانی دینا اور پھر اس امت اور معاشرے کو محفوظ رکھنے کے لیے سر بکف رہنا لازم ہے۔ قرآن کریم میں آیا ہے کہ ہر قوت اور ہر سامان جس پر بھی تم قادر ہو بہم پہنچاؤ۔ گھوڑوں پر زینیں کسے رکھو تا کہ خدا کے دشمن اور تمہارے دشمن ڈرے اور سہمے رہیں۔ تمہارے دشمن اور خدا کے دشمن کچھ تو وہ ہیں جن کو تم جانتے ہو اور کچھ وہ جن کو تم نہیں جانتے مگر ہم جانتے ہیں۔

واضح ہے کہ پوشیدہ دشمن وہ منافق اور بد طینت لوگ ہوتے ہیں جو ایک معاشرے کا حصہ ہونے کے باوصف اس معاشرے کے نقصان و زوال کے درپے رہتے ہیں۔ قرآن ایسے افراد اور گروہوں کے خلاف بھی جہاد کا حکم دیتا ہے گویا لڑائی کنبے، قبیلے یا نسل کی لڑائی نہ رہی یہ اصولی اور اخلاقی لڑائی بن گئی۔ لہٰذا جہاد قرار پائی۔

یہ امر پیش نظر رہنا چاہیے کہ قرآن کی روشنی میں با اصول زندگی بسر کرنا ہر مسلم فرد کا فرض ہے مگر ہر فرد کی ذمہ دری اس باب میں اس کے اختیار کے دائرے اور درجے کے مطابق بڑھ جاتی ہے۔ حضور نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ ''تم میں سے ہر ایک گلے کا نگہبان ہے اور اپنے گلے کے ضمن میں خدا کے حضور جواب دہ ہے۔'' باپ اور ماں اور بڑے بھائی بہن کنبے کی حدود میں، سردار قبیلہ، قبیلے کی حدود میں، افسر اپنے درجہ اقتدار کی حدود میں، اور اسی طرح درجہ بدرجہ۔۔۔ پھر جو فرد کسی سوسائٹی میں سب سے زیادہ با اختیار ہوتا ہے اس پر قرآن سب سے زیادہ ذمہ داری عائد کرتا ہے۔ اس کے اختیار کا مفاد محض اس کے افراد قبیلہ یا دیگر عزیزوں کو نہیں پہنچنا چاہیے۔ اسی طرح اس کو محض اپنے مخالفوں ہی کے لیے تعزیری ضابطے کام میں نہیں لانا چاہئیں۔ ہاں اسلامی معاشرے کے بیرونی اور اندرونی دشمنوں کے ضمن میں ہر آدمی پر جہاد فرض ہے۔ مگر بقدر اختیار اور حسب اقتدار یہ ذمہ داری بھی کم و بیش ہوتی رہتی ہے۔ کسی پر جہاد کی ذمہ داری براہ راست ہے اور کسی کی بالواسطہ اور سب سے زیادہ ذمہ داری اور خدا کے حضور جواب دہ سربراہِ معاشرہ ہے۔ یہ اس کا فرض ہے کہ معاشرے کو خارجی اور داخلی فتنوں سے بچائے رکھے۔ لہٰذا اس کے لیے کوئی دم فراغت کا نہیں ہوتا نہ ہونا چاہیے۔ اور یہاں بھی قرآن تقاضا کرتا ہے کہ اگر کوئی فرد اسلامی معاشرے کو برباد کرنے کے درپے ہو تو خواہ کتنا ہی عزیز کیوں نہ ہو کسی رعایت کا حق دار نہیں۔ ''خواہ تمہارے والدین اور حقیقی بھائی ہی کیوں نہ ہوں اگر وہ ایمان کا دامن چھوڑ کر کفر کا دامن پکڑ

Marfat.com

لیں تو انہیں عزیز نہ جانو"۔

قرآن حکیم تقویٰ، عدل گستری اور جہاد کے ضمن میں مرد مومن سے یہاں تک تقاضا کرتا ہے کہ دنیا کے کسی بھی معاشرے میں اگر ظلم و زیادتی ہو، وہاں مرد عورتیں اور بچے مبتلائے عذاب ہوں، حکومت تعدی اور ستمگری پر تُل رہی ہو اور وہاں کی رعایا اللہ سے کسی حامی و ناصر کے بھیجنے کی التجا کر رہی ہو تو مسلم معاشرے کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس معاشرے کے احوال سدھارنے کی خاطر جہاد کرے۔ خدا کا آخری پیغام اور آخری دستور اسی امت کے پاس ہے لہٰذا اسی امت کا فرض ہے کہ اس پیغام کو عام کرے اور اس دستور کو نافذ کرے۔ یوں دیکھیں تو قرآن کریم مرد مومن کو پورے عالم انسانیت کا قائد بھی بنا دیتا ہے اور پاسبان بھی۔ ذرا دیکھیے تو سہی قرآن اسی فرد بشر کو جو خاک کا پتلا ہے انقلاب روحانی سے ہمکنار کر کے کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔

Marfat.com

علامہ اقبال اور اجتہاد

حدیث: دوسرا آئینی ماخذ

اسلامی فقہاء کے یہاں دوسرا آئینی ماخذ حدیث ہے۔ حضرت علامہ نے گولڈ زیہر کا حوالہ دیا ہے جس کے خیال میں مجموعہ احادیث، مجموعی طور پر نا قابلِ اعتبار ہے۔ مگر ایک اور مفکر کی زبانی بتایا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں جو مجموعہ ہائے احادیث معتبر ٹھہرائے جاتے ہیں ان کا زیادہ حصہ فی الواقع اسلام کے ظہور اور ابتدائی نشو ونما کی حقیقی تاریخ ہے۔ علامہ نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے فقہی احادیث سے کم کام لیا ہے انہوں نے اسے بھی ارتقاءِ فقہ کی ایک صورت قرار دیا ہے۔ انہوں نے امام ابوحنیفہ کی تائید بھی کی ہے۔ اس لیے کہ بہر حال وہ اہل سنت ہی کے ایک امام ہیں۔ مگر ساتھ ہی مزاجی توازن پسندی کے تقاضے کے زیر اثر زور دے کر یہ بھی تحریر کر دیا ہے:

''بایں ہمہ یاد رکھنا چاہیے کہ سب سے بڑی خدمت جو محدثین نے شریعت اسلامیہ کی سرانجام دی ہے یہ ہے کہ انہوں نے مجرد غور وفکر کے رجحان کو روکا اور اس کے بجائے ہر مسئلے کی الگ تھلگ شکل اور انفرادی حیثیت پر زور دیا ہے۔ لہٰذا احادیث کا مطالعہ اگر اور زیادہ گہری نظر سے کیا جائے اور ہم ان کا استعمال یہ سمجھتے ہوئے کریں کہ وہ کیا روح تھی جس کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احکامِ قرآنی کی تعبیر فرمائی۔ تو اس سے ان قوانین کی حیاتی قدر و قیمت کے فہم میں اور بھی آسانی ہوگی جو قرآن پاک نے قانون کے متعلق قائم کیے ہیں''۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت علامہ کے نزدیک ارتقائے فقہ کے باب میں حدیث کا کیا رتبہ ہے۔ بعض احباب یہاں تک کہہ گزرتے ہیں کہ حضرت علامہ حدیث کے معاملے میں بس مولوی کے ڈر سے رعایت برتتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حدیث کے ضمن میں بھی حضرت علامہ کی اعتدالی فطرت وخصلت بخوبی نمایاں ہے۔ نہ تائید میں غلونہ تردید میں، نہ سارا مجموعہ

Marfat.com

احادیث قابلِ قبول اور نہ سرے سے حدیث کے ایک مفید ماخذ فقہ ہونے سے انکار اور یہ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ حضرت علامہ تو ماضی کے ثمر اور ثمرے کو نگاہ میں رکھتے ہوئے آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ بقول محمد تقی امینی:

''حدیث کی حجیت اور اس سے فقہ کے استنباط میں کسی فقیہہ نے کلام نہیں کیا۔ البتہ اس کے قبول کرنے کے طریقوں میں اختلاف ہوا ہے اور ہر فقیہہ نے اپنے اپنے معیار کے مطابق اس کے ضابطے اور طریقے مقرر کیے ہیں''۔

رہا اجماع تو اس ضمن میں ڈاکٹر صبحی محمصانی کی تجدید و تعریف یہ ہے:

''کسی حکم شرعی پر کسی زمانے میں مسلمان مجتہدین کا متفق ہو جانا اجماع کہلاتا ہے''۔

آگے چل کر ڈاکٹر محمصانی لکھتے ہیں:

''مگر امام حنبل اور داؤد ظاہری کے نزدیک اجماع خاص صحابہ کا اجماع ہے، کسی اور کا نہیں''۔

حنابلہ کے باب میں N-J-Coulson بھی ڈاکٹر محمصانی کے موید ہیں۔

حضرات خلفائے راشدین میں سے ہر ایک کی مجلس شوریٰ تھی جس کو آج کی اسمبلی سے کسی حد تک مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اجماع کے بارے میں حضرت علامہ نے یہ اظہار کیا ہے کہ یہ ماخذ اسلام کے تصورات میں سب سے اہم ہے۔ اس ضمن میں اہم اور زوردار نظری بحثیں بھی ہوئیں مگر آگے چل کے یہ مباحثی مجلس شوریٰ کسی ادارے کا روپ نہ دھار سکیں۔ حضرت علامہ نے اس کا سبب مطلق العنان حکومتوں کا ظہور پذیر ہونا قرار دیا۔ ایسی مباحثی مجالس خود مختار حکام و سلاطین کے مفاد کے خلاف ہوتیں۔ اس مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے آگے چل کے حضرت علامہ وضاحت کرتے ہیں اور اس وضاحت میں ہمیں سیرت کی ایک لے صاف محسوس ہو رہی ہے:

''بلاد اسلامیہ میں جمہوری روح کا نشوونما اور قانون ساز مجالس کا یہ تدریجی قیام ایک بڑا ترقی کا قدم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مذاہب اربعہ کے نمائندے جو سردست فرداً فرداً اجتہاد کا حق رکھتے ہیں اپنا یہ حق مجالس

Marfat.com

تشریعی کو منتقل کر دیں گے۔ یوں بھی مسلمان چونکہ فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اس لیے ممکن بھی ہے تو اجماع ہی ایک شکل۔ مزید برآں غیر علماء بھی جو ان امور میں بڑی گہری نظر رکھتے ہیں اس میں حصہ لے سکیں گے۔ میرے نزدیک یہی ایک طریقہ ہے جس سے کام لے کر ہم زندگی کی اس روح کو جو ہمارے نظامات فقہ میں خوابیدہ ہے از سر نو بیدار کر سکتے ہیں، یونہی اس کے اندر ایک ارتقائی نقطۂ نظر پیدا ہوگا"۔

مجالس تشریعی کے توسط سے رو پذیر ہونے والے اجماع کو حضرت علامہ کے یہاں خصوصی اہمیت اس لیے حاصل ہے کہ اس طریق سے مختلف ملکوں کے اہل نظر و قانون کے باہم قریب آ جانے کی امید ہوگی۔ لہٰذا انفرادی بلکہ فرقہ دارانہ اجتہاد کے بجائے اگر مجالس تشریعی میں کسی مسئلے کی چھان پھٹک ہو جائے تو اس میں وہ لوگ بھی جو علمائے فقہ تو نہیں مگر زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق ہونے کی بنا پر اپنے تجربات کی روشنی میں رائے دینے پر قادر ہوں گے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا فیصلہ بھی قرآنی روح سے متصادم نہیں ہونا چاہیے۔ مجالس تشریعی ۔۔۔۔ قرآنی روح ہی کو بروئے کار لائیں گی مگر مختلف زاویہ ہائے نظر اور گوناگوں تجارب کی عطا کردہ بصیرتوں کا ایک جگہ جمع ہو جانا فرحت بخش تصور ہے۔

اور ہمیں یہ بات بہر حال نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ حضرت علامہ جب یہ مباحث پیش کر رہے تھے اس وقت ترکی اور سعودی عرب کو چھوڑ کر باقی سب مسلم ممالک یا تو غلام تھے یا زیر انتداب تھے۔ حضرت علامہ کا اپنا وطن انگریزوں کا غلام تھا اور انہوں نے اسی مقالہ میں اظہار بھی کیا ہے کہ برصغیر میں نئی اجتہادی کوششیں کیونکر بروئے کار آئیں گی جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ مراد یہ ہے کہ حضرت علامہ کا جس وطن سے تعلق تھا وہ غلام تھا۔ عالم اسلام کے ممالک کی کثرت کثیرہ غلام تھی اور حضرت علامہ کی روشن امیدی اور عزم بالجزم کا عالم یہ ہے کہ وہ فقہ اسلامی میں اجتہاد کی ضرورت پر اس قدر زور دے رہے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت علامہ کی نظریں عالم اسلام کے ضمن میں اس یقین سے سرشار تھیں کہ بس چاکری کے بندھن اور غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے ہی والی ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ آنے والے دور کے لیے تیاری کریں او راپنی معاشرت کے جملہ امور کو اسلام کے دائمی اصولوں کے مطابق نئی روش، نئی صورت اور نئی قوت

Marfat.com

دینے کے عزم سے ابتدائی کام کر رکھیں۔ حضرت غالب نے خدا جانے حسرت وشکست کے لب و لہجہ میں شعر ذیل کہا تھا یا امید وعزم کے استحکام کی تصویر کھینچی تھی مگر میں اس شعر کو حضرت علامہ کے خوش امید بلکہ پُر امید دل کا ترجمان مانتا ہوں اور قرار دیتا ہوں کہ حضرت علامہ بھی جن حالات اور احوال میں کام کر رہے تھے اس ساری کیفیت کی، غالب کا یہ شعر خوب صورت ترجمانی کرتا ہے:

مثال ہے مری کوشش کی یہ کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

ہاں اجماع امت کے باب میں حضرت علامہ نے اس امر پر بھی بحث کی ہے کہ آیا اجماع قرآن کا بھی ناسخ ہے۔ علامہ وضاحت کرتے ہیں، کسی اسلامی مجلس میں یہ سوال اٹھانا غیر ضروری ہے مگر ایک مغربی نقاد کی غلط بیانی کے باعث کچھ کہنا پڑا۔ اس مغربی نقاد نے بغیر کوئی سند پیش کیے ہوئے یہ لکھ دیا ہے کہ احناف اور معتزلہ کے نزدیک اجماع، قرآن کا بھی ناسخ ہے۔ حضرت علامہ نے بالصراحت اور دعوے کے لب ولہجہ میں کہا ہے کہ اسلامی فقہ میں اس قسم کی غلط بیانی کی تائید میں کوئی ادنیٰ سی مثال بھی پیش نہیں کی جاسکتی۔ واضح ہے کہ اجماع خواہ کیسے ہی عقلا کا ہو شریعت پر حاوی نہیں ہوسکتا۔ اجماع کے سلسلے میں مولانا ثناءاللہ امرتسری رقم طراز ہیں:

''خدا نے شریعت کو جمعیت آراء سے قائم نہیں کیا'' اور پھر اسی ذیل میں اسی صفحے پر اضافہ کرتے ہیں: ''اجماع جو اجتماع آراء کا نام ہے کتاب اللہ، سنت رسول اللہ کو منسوخ نہیں کرسکتا۔ پس اتباع اجماع اپنی ذات میں واجبات شرعی میں سے نہیں''۔

رہا اجماع صحابہ اور اس کی حجیت تو علامہ کی تصریح یہ ہے کہ

''ہم ایک امر واقعی اور امر قانونی میں فرق کریں۔ مثلاً اس مسئلے میں کہ آخری دو سورتیں معوذتان قرآن پاک کا جزو ہیں یا نہیں اور جس کے متعلق صحابہ کا بالاتفاق یہ فیصلہ ہے کہ یہ سورتیں جزو قرآن ہیں، ہمارے لیے ان کا اجماع حجت ہے کیونکہ یہ صرف صحابہ تھے جو اس امر واقعی کو ٹھیک ٹھیک جانتے تھے،۔ بصورت دیگر یہ مسئلہ تعبیر وترجمانی کا ہوگا لہٰذا ہم کرخی کی طرز پر یہ کہنے کی جرأت کرسکتے ہیں کہ اس صورت میں صحابہ کا اجماع

Marfat.com

ہمارے لیے حجت نہیں۔ کرخی کہتا ہے کہ صحابہ کا طریق انہی باتوں میں حجت ہے جن میں قیاس سے کام نہیں چلتا۔ جن معاملات میں قیاس سے کام لیا جاسکتا ہے ان میں ہم انہیں حجت نہیں ٹھہرائیں گے"۔

جیسا کہ پہلے اشارہ ہوا حضرت علامہ نے دور حاضر کے نقادوں کی روشنی میں اجماع کا حق ایک طرف ہر اسلامی ملک کی پارلیمنٹ کو دیا ہے لیکن وہ اس خطرے سے بخوبی واقف تھے کہ عام مجالس قانون ساز کے رکن وہ بھی ہوں گے جو بالعموم فقہ کی نزاکتوں سے آگاہ نہ ہوں گے۔ اس کا علاج ایران نے 1912 میں یہ کیا کہ ایک مجلس علماء کی بنیاد رکھی تا کہ وہ پارلیمنٹ کی قانون سازی پر نظر رکھے۔ مگر علامہ کو علماء کی اس مجلس سے بھی کھٹکا محسوس ہوتا ہے اور اس طریقِ کار کو بھی پُر خطر قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ ایران کی مثال کو اگر سبھی ممالک سامنے رکھیں تو بھی یہ زیادہ مدت کے لیے نہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ موقت بندوبست کے طور پر وہ کسی مجلس علماء کے خلاف نہیں تاہم ایک دائمی ادارے کے طور پر اس کا قیام لازم ولابد نہیں جانتے۔ گمان یہ ہے کہ حضرت علامہ علماء کو پارلیمنٹ کے خلاف فیصلہ کن ووٹ کی حیثیت نہیں دینا چاہتے۔ وہ پارلیمنٹ کی نگرانی یا رہنمائی بھی چاہتے ہیں مگر علماء کے ویٹو سے بھی متحذر ہیں۔ ممکن ہے وہ علماء کی اکثریت کو فقہ میں اجتہاد کا قائل نہ جانتے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے وہ علماء کے نزاع باہم سے بھی گھبراتے ہوں۔ بہر حال علامہ کی وضع احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح کا تناسب وتوافق چاہتے ہیں کوئی عدم توازن انہیں گوارا نہیں۔ تاہم جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ علامہ یہ تجویز ضرور فرماتے ہیں کہ مجلس قانون ساز میں علماء کو بطور ایک مفید جزو کے شامل کیا جائے اور علماء کو بھی تلقین کی ہے کہ وہ کھلے مباحثے کی مدد سے بھی اور تبادلہ آراء کی اجازت دے کر بھی حق رہنمائی ادا کریں۔

Marfat.com

تصوف اور پیروئ سنت

اِدھر تصوف کا کلمہ کان تک پہنچا اور اُدھر فضائے ذہن میں ترکِ دنیا اور رہبانیت کے مضامین تیرنے لگے۔ پھر چونکہ ترک دنیا اور رہبانیت اسلامی روح کے خلاف ہیں۔ فوراً یہ منتج ہوا کہ تصوف کا اسلام کے احاطے اور ضابطے میں کوئی مقام نہیں۔ مزید براں ہمارے بعض مفکرین نے اسباب زوال امت پر بحث کرتے ہوئے تصوف کو اس طرح آڑے ہاتھوں لیا ہے کہ تصوف کے مثبت عناصر ذہنوں کے اوراق سے محو ہو کر رہ گئے ہیں۔

اسلام کے دورِ زوال میں اسبابِ زوال تلاش کرنا ایک نہایت تحقیق طلب مسئلہ ہے لیکن اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جملہ اخلاص کے باوصف اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے دامنِ اعتدال ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور موضوع بحث عمل وردِ عمل کی تشریحات اور افراط وتفریط کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ تو واضح ہے کہ ہر تعمیر میں تخریب کا در آنا ناگزیر ہے اس لیے کہ کائنات میں جہاں پیدائش، نمو اور فرسودگی ہر لحظہ ایک دوسرے کے تعاقب میں مصروف ہیں ہر تعمیر کا حق ہے کہ نذرِ تخریب ہو اور ہر تخریب کا حق ہے کہ تہیہِ تعمیر سے مالا مال ہو۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو اسلامی معاشرہ بھی اصول عروج وزوال سے بچ نہ سکتا تھا۔ وہ ضوابط جو اسلامی معاشرے کے قیام اور قوت کا اساسی سبب تھے اپنی جگہ ہزار محکم واستوار سہی مگر ان ضوابط پر ایمان وایقان کے مدارج میں تو بہر حال تغیر رونما ہوتا رہا۔ بہر کیف جب میں اسلامی تاریخ میں تصوف کی روداد دیکھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ یہ جوہر چند در چند امت کی تقویت کا باعث بنا رہا۔ اس نے امت کی روحانی، اخلاقی اور اعتقادی عمارت کو صدیوں محکم رکھا اور اہلِ سیاست وارباب اقتدار کی جملہ انتشار خیز سرگرمیوں کے باوصف امت کے قلوب کو متحد رکھا۔ چنانچہ میں کچھ اس رجحان کا مالک ہوں کہ تصوف باعثِ زوالِ امت نہ تھا بلکہ وہ تو ایک قوت بخش عنصر تھا جو امت کے اجتماعی زوال کے سیلِ بے رواں کی زد میں آ گیا۔ علامہ اقبال جب یہ کہتے ہیں:

Marfat.com

تمدن تصوف شریعت کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

تو اس سے دورِ زوال کے اُن عناصر پر حرف گیری کرتے ہیں جو زوال کی زد میں آئے ہوئے تھے، ورنہ وہ یہ کیوں کہتے کہ:

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا حمیت میں فرد

اگر کسی چیز کا ماضی اچھا تھا اور حال خراب ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ چیز خود اپنی ذات میں خراب نہیں، بلکہ انقلاباتِ زمانہ کے ہاتھوں خراب ہوئی۔

ایک مسئلہ یقیناً غور طلب ہے اور وہ یہ کہ حضرات الصوفیہ جو آسمانِ ملت کے روشن ستارے ہیں کیا اسلام کی روح سے ناواقف تھے؟ آیا وہ یہ نہ جانتے تھے کہ اُن کا طریق طریقِ سنت کے ساتھ موافقت نہیں رکھتا؟ اس ضمن میں یہ انکشاف بہت دلچسپ ہے کہ جب ہم حضرات الصوفیہ کے احوال وسوانح دیکھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ وہ سارے کے سارے چوٹی کے عالم تھے۔ زبان و ادب، تفسیر وحدیث اور فقہ واصول و معاملات میں طاق تھے۔ ان میں کے کثیر التعداد اصحاب اپنے اپنے عہد اور علاقہ کے شیخ الاسلام تھے اور انتقال کے بعد بھی ہمیشہ اسی خطاب سے یاد کیے جاتے رہے۔ ان صوفیہ کی تعداد بھی کم نہیں جن کے نام کا سابقہ ''قاضی'' تھا۔ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری لکھتے ہیں:

''طریقۂ تصوف را اصل قوی وثمر دار است۔ قومیت وفرعی شمرد جملہ مشائخ ایشان از اہل علم بودہ اند و جملہ مریداں را برآموختن علم باعث بودند و بر مداومت کردن بران ایشان راحریص داشتہ اند۔

(طریقۂ تصوف کی جڑ مضبوط اور ثمر بخش ہے۔ اس طریقے کے سارے مشائخ اہلِ علم میں سے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے جملہ مریدوں کے حصولِ علم کا سبب تھے اور مریدوں کو ہمیشہ حصولِ علم کی خاطر کوشاں رہنے کی ترغیب دیتے تھے)

تصوف کا تسمیہ کب شروع ہوا اور پہلا صوفی کون تھا۔ اس امر سے بحث مقصود نہیں۔ درحقیقت تصوف ایک عمل کا نام تھا اور ایک رویے کا تشخص تھا۔ وہ عمل اور وہ رویہ تزکیہ نفس کی

Marfat.com

ریاضت تھا اور تزکیہ نفس سے آگاہی کے بغیر ممکن نہ ہوتا چنانچہ اگر غور کریں تو اسلام میں اس رویے کا مصدر و سرچشمہ غارِ حرا قرار پاتا ہے۔ جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عزلت گزیں ہوتے تھے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ آنحضورؐ:

در شبستانِ حرم خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

حضرات الصوفیہ کی خلوت گزینی بھی موقت اور عارضی ہوتی تھی۔ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ارشاد: ''تفقہ ثم اعتزل'' (خوب علم حاصل کر اور پھر عزلت میں چلا جا) پر کاربند تھے۔ چنانچہ جب یہ بزرگ تنہائی میں مطالعہ ذات اور تزکیہ نفس کی منزل طے کر لیتے تھے تو مجسم ہدایت بن کر برآمد ہوتے تھے۔ حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی کا ارشاد ہے:

''حققوا الاسلام حتی تصلوا الی الایمان ثم حققوا الایمان حتی تصلوا الی الایقان فحینئذٍ ترون مالم تروہ من قبل الیقین یریکم الاشیاء کما ھی علیٰ صورتھا یصیر الخبر عاینۃ''۔ ''تم اسلام کو سچ مچ کا اسلام بناؤ تا کہ ایمان تک رسائی حاصل کر سکو۔ پھر ایمان کو سچ مچ کا ایمان بناؤ تا کہ یقین تک رسائی حاصل کر سکو۔ اس عالم میں تم وہ کچھ دیکھو گے جو کچھ یقین سے قبل نہ دیکھا تھا۔ یقین تمہیں صورت اشیا اس طرح دکھائے گا جس طرح کہ وہ اشیا ہیں۔ یوں اطلاعی بات آنکھوں دیکھی بات بن جائے گی''۔

قرآن کریم میں آتا ہے:

''عرب بادیہ نشین کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ اے رسولؐ! ان سے کہہ دیجئے کہ حقیقتاً تم ایمان نہیں لائے۔ البتہ تمہیں یہ کہنا چاہیے کہ تم نے اسلام قبول کر لیا۔ اس لیے کہ ایمان تو ابھی تمہارے قلوب میں داخل ہی نہیں ہوا''۔

اس طرح گویا خود قرآن نے بھی منزلیں مقرر کر دی ہیں:

ایک قبول اسلام اور ایک ایمان کا دل میں اترنا۔ یعنی ایک مسلمان ہونا اور ایک مومن ہونا۔

Marfat.com

اسی نہج پر حضرات الصوفیہ علوم ظاہری حاصل کر لینے کے بعد عزلت گزیں ہو جاتے تھے تا کہ ان علوم کو دل میں اتاریں اور وہ علوم محض سرمایۂ دماغ نہ رہیں بلکہ متاعِ جان بن جائیں۔ اس لیے کہ مدرسی اور ظاہری علوم سے معلومات میں تو اضافہ ہو جاتا ہے اور ذہن کو بھی جلا نصیب ہو جاتی ہے۔ مگر اس سارے معلوماتی مواد کو یک جان کرنے کی خاطر خلوت کی ضرورت ہے تا کہ اس میں تنظیم وارد ہو۔ جیسے علامہ اقبال لکھتے ہیں:

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

اسی ضمن میں حضرت غوث الاعظم کا قول ہے:

گونگا پن تیرا وطیرہ ہونا چاہیے۔ گمنامی تیرا لباس ہونا چاہیے اور لوگوں سے کنارہ کشی تیرا مقصود ہونا چاہیے۔ اگر بس چلے کہ تو سرنگ کھود کر اس میں روپوش ہو جائے تو ہو جا اور اسی طرح رہ تا آنکہ تیرا ایمان شباب کو پہنچ جائے اور تیرے ایقان کا قدم مضبوط ہو جائے اور تیرے صدق کو پرِ پرواز میسر آ جائے۔ اور تیرے دل کی آنکھیں وا ہو جائیں ..... جب ایسا ہو جائے تو پھر تو گفتگو کے لیے لب کھول، گمنامی کا لباس اتار پھینک۔ لوگوں سے کنارہ کشی ترک کر دے اور سرنگ سے نکل کر لوگوں میں جا رہ۔ اس لیے کہ اب تو ان کے لیے دوا بن چکا ہو گا اور اب خود تیری ذات کو کسی ضرر کا اندیشہ نہ ہو گا۔

تو واضح ہوا کہ حضرات الصوفیہ کا کچھ مدت کے لیے خلق خدا سے بھاگنا، خلق خدا ہی کی خاطر تھا تا کہ وہ پہلے خود اپنے قلب کا تزکیہ کر لیں اور بیرونی مؤثرات کی جانب سے پہنچنے والے ہر خطرے سے آزاد ہو جائیں اور پھر لوگوں کی روحانی بیماریوں کا مداوا بنیں۔

حضرت بایزید بسطامی کے پاس ایک شخص آیا اور آ کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ آپ نے پوچھا:

''مالک! (کیا بات ہے)؟

اس نے جواب دیا: ''اریدمرضعا نظیفا اصلی بہ'' (میں کسی صاف جگہ کی تلاش میں ہوں جہاں نماز ادا کروں)

Marfat.com

انہوں نے فرمایا: طہر قلبک وصل حیث شئت (دل کو پاک کر لے، پھر
جہاں چاہے نماز ادا کر)

اس حقیقت کا اعادہ ضروری ہے کہ تصوف ایک عمل اور رویے کا تشخص تھا جو رسولِ خدا کے ساتھ ہی آغاز پذیر ہو گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سب کچھ جلوت میں میسر آ جاتا تھا جو بعد میں آنے والوں کو خلوت میں بھی بمشکل سے ہاتھ آتا تھا۔ اس لیے کہ از روئے قرآن اُن اصحاب کرامؓ کا تزکیۂ نفس تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے ہو رہا تھا۔ قرآن میں بار بار آتا ہے:

''ویزکّیھم ویعلّمھم الکتٰب والحکمۃ''۔ ''اور رسولؐ ان کا تزکیہ کرتے ہیں اور انہیں کتاب (قرآن) کا علم بھی عطا کرتے ہیں اور حکمت سے بھی مالا مال فرماتے ہیں''۔

موجودہ دور کے مسلم محقق، ادیب اور فیلسوف سید حسین نصر تصوف کی تاریخ کے ضمن میں بیان کرتے ہیں:

''تاریخ تصوف کے بارے میں کوئی صحیح بات نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ از روئے جوہر تصوف کی کوئی تاریخ نہیں۔ تاہم چونکہ تصوف نے ہر زمانے میں اپنے اصول و قواعد اس زبان میں بیان کیے ہیں جو اس دور کے ذہنی اور نفسیاتی کوائف سے مطابقت نہیں رکھتی تھی اور چونکہ کئی صدیوں کے دوران میں بغیر تصوف کے کئی مکتب ظہور میں آ گئے جو ہر نوع کی اولادِ آدم کے حوائج پر مبنی ہوتے تھے۔ اس لیے ہر دور کی روایتِ تصوف کے خصوصی امتیازات کے بارے میں ہی بات کی جا سکتی ہے۔ مثلاً صدر اول کے زاہدوں اور قرآن کے قاریوں اور حدیث کے رایوں کے ضمن میں گفتگو کی جا سکتی ہے جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو عہدِ اصحاب کے فوراً بعد کی نسل کے لیے زندہ و محفوظ رکھا اور جن میں سے کثیر التعداد بزرگوں کو اسلام کے صدر اول کے اولیاء میں شمار کیا جاتا ہے''۔

Marfat.com

ماحصل یہ کہ سید حسین نصر صدر اول کے زاہدوں قرآن کے قاریوں اور حدیث کے راویوں میں پائے جانے والے ان صوفی بزرگوں کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو بحفاظت اگلی نسل تک پہنچایا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان بزرگوں میں کثیر تعداد ان کی تھی جن کو صدر اول کے اولیاء میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ ان بزرگوں کا آغاز کار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا تحفظ ہی تھا۔ نیز یہ کہ وہ صحابہ کے معاصر لوگ تھے۔

حضرت قشیری آغاز تصوف کے بارے میں لکھتے ہیں:

''تمہیں معلوم ہو خدا تم پر رحم کرے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں کے بزرگوں نے اپنے زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے سوا علم یا اور کسی نام کو اپنے لیے پسند نہیں کیا۔ اس لیے کہ ان کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی اور فضیلت نہ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ انہیں صحابہ کہا گیا۔ جب دوسرے زمانہ کے لوگ آئے تو صحابہ کی صحبت میں رہنے والوں کو تابعین کہا گیا۔ انہوں نے اس نام کو نہایت ہی شرف والا سمجھا۔ پھر اُن کے بعد کے لوگوں کو اتباع التابعین کہا گیا۔ اس کے بعد لوگوں میں اختلاف پیدا ہوا اور جدا جدا مراتب پیدا ہو گئے۔ چنانچہ ان خاص قسم کے لوگوں کو جنہیں دینی امور کے ساتھ لگاؤ تھا، زاہد عابد کہنے لگے، پھر بدعتیں رونما ہونے لگیں۔ ہر فرقہ مدعی بن بیٹھا کہ ان میں ''زاہد'' پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اہل سنت میں سے ان خاص لوگوں نے جنہوں نے اپنے انفاس کو اللہ کے لیے وقف کر دیا اور اپنے دلوں کو غفلت کے طاری ہونے سے محفوظ رکھا، اپنے لیے ایک الگ نام ''تصوف'' رکھ لیا۔ ان بزرگوں کے لیے یہ نام دوسری (صدی) ہجری سے پہلے مشہور ہو چکا تھا۔''

گویا حضرت قشیری کے نزدیک تصوف کا کلمہ تزکیۂ نفس کے باب میں ہر دم محتاط رہنے والوں کے نام کے طور پر دوسری صدی سے قبل شروع ہو چکا تھا۔ دوسری صدی سے قبل تو پہلی ہی صدی تھی اور پہلی صدی کے آخری چہارم تک ابھی کئی اصحاب حیات تھے۔ فقر و تصوف پر قلم

Marfat.com

اٹھانے والے بعض دیگر بزرگوں کی طرح حضرت علی الہجویری بھی اس سلسلے کو صحابہ کبائر سے شروع کرتے ہیں۔ ازاں بعد ائمہ اہلبیت کو شامل کرتے ہیں۔ پھر تابعین اور پھر اتباع تابعین کو۔ اس طرح گویا حضرت ابوبکرؓ سے بات شروع ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اصحابِ رسولؐ کے لیے صحبتِ رسولؐ کی رعایت سے ''صاحب'' (جمع صحابہ واصحاب) سے زیادہ معزز ومحترم کوئی لقب نہ ہوسکتا تھا۔ اسی طرح ان کے بعد والوں کو تابعین اور ان کے بعد والوں کو اتباع تابعین کہلانے سے زیادہ فخر اور کسی امر میں نظر نہ آتا تھا۔ مطلب یہ کہ نام ''تصوف'' بعد میں رونما ہوا، ورنہ رویہ، عمل اور اسلوب عہد صحابہ میں موجود تھا۔ یوں اگر دیکھیں تو بڑے مقدس ومحترم اسماء کی ایک کہکشاں نظروں میں چمک جاتی ہے مثلاً حضرت اویس قرنی، حضرت امام زین العابدین، امام محمد باقر، امام جعفر صادق، حضرت خواجہ حسن بصری، حضرت ابو ہاشم، ابو حازم مکی، حضرت رابعہ بصری، حضرت سفیان ثوری، حضرت سعید بن المسیب، حضرت فضیل بن عیاض، حضرت ابراہیم ادھم، حضرت بشر بن الحارث الحافی، حضرت مالک بن دینار، حضرت عبداللہ بن مبارک، حضرت داؤد طائی، حضرت شفیق البلخی، حضرت حارث محاسبی، حضرت جنید بغدادی، حضرت بایزید بسطامی، حضرت ذوالنون مصری، حضرت ابوسعید بن ابی الخیر، حضرت علی الہجویری، حضرت خواجہ معین الدین چشتی، حضرت شہاب الدین سہروردی، حضرت ابنِ عربی، حضرت خواجہ بختیار کاکی، حضرت شیخ سید عبدالقادر الجیلانی، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی، حضرت بہاء الدین نقشبند، حضرت خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکر، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء، حضرت مجدد الف ثانی وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ رحمتہ واسعتہ۔

یہ سب لوگ قرآن، حدیث، فقہ، زبان، ادب وغیرہ کے ماہر عالم تھے۔ یہ لوگ تارک الدنیا نہ تھے۔ پہلے ان سب نے علم حاصل کیا تھا اور پھر اس علم کو جزوِ جاں بنایا تھا۔ یعنی انہوں نے ''تفقه ثم اعتزل'' (خوب علم حاصل کر اور پھر عزلت میں چلا جا) پر عمل کیا تھا اور ازاں بعد لوگوں کے لیے نور وہدایت کے پیکر بن کر مصروفِ تربیت رہے تھے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض ملنگ لوگ تھے، مگر ان کے احوال دیکھتے ہیں تو کچھ اور ہی معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت حسن بصری کو لیجئے۔ ان کے بارے میں خواجہ فریدالدین عطار کہتے ہیں: ''آں کعبۂ عمل وعلم''۔ اور حضرت داتا گنج بخش کہتے ہیں: ''لطیف الاشارۃ بودہ است اندر علم ومعاملت''۔ اسی طرح سے درج ذیل صوفیہ کرام

Marfat.com

کے بارے میں داتا گنج بخش فرماتے ہیں:

''حضرت عبداللہ بن مبارک المروزی۔ عال بجملۂ احوال واقوال و اسباب طریقت وشریعت واندروقت خودامام وقت بود۔حضرت بشر بن الحارث الحافی : بعلم اصول وفروع عالم بود۔ حضرت ابوسلیمان ابن عبدالرحمٰن الدارنی : ''عالم بود بعلم وقت''۔حضرت ابوعبداللہ الحارث المحاسبی: ''عالم بود باصول وفروع ومرجع ہمہ اہل علم دروقت بود۔حضرت ابوالحسن سری السقطی : عالم بجملۂ علوم''۔حضرت معروف بن فیروز الکرخی: ''معروف بود (بتصوف)ومذکور بہ ورع انابت ..... واندرفنون علم مقتدائے قوم بودہ ست''۔

حضرت ابراہیم بن ادھم، فضیل بن عیاض، داؤد طائی اور بشر الحافی فقہ اور دیگر علوم میں امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں سے تھے اور ابوسفیان ثوری ان چار میں سے تھے جن میں سے کسی ایک کو ابوجعفر المنصور قاضی تعینات کرنا چاہتا تھا۔ باقی تین یہ تھے : امام ابوحنیفہ، مسعر بن کدام اور شریح۔ گویا ابوسفیان ثوری ورع، تقویٰ اور تفقہ میں امام حنیفہ کے ہمتا تھے۔

حضرت شفیق البلخی کے بارے میں خواجہ فریدالدین عطار کا یہ قول ملاحظہ فرمایئے:

''درانواع علوم کامل بودوتصانیف بسیار دارد''

یہی نہیں کہ یہ لوگ عالم، متقی اور فقیہ تھے بلکہ ان میں ایک کثیر تعداد ان کی بھی تھی جو باضابطہ راہ خدا میں جہاد بالسیف بھی کرتے رہے۔ مثال کے طور پر حضرت سفیان الثوری، عبداللہ بن مبارک، مالک بن دینار، شفیق البلخی، حاتم اصم، ابراہم بن ادھم، معروف الکرخی، نجم الدین کبریٰ وغیرھم رحمھم اللہ تعالیٰ۔

یہ سینکڑوں بزرگوں میں سے بعض کا ذکر ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو دنیائے تصوف میں ائمہ کہلاتے ہیں۔ انہوں نے جو طریق مقرر کر دیا، اس میں اساسی تبدیلی صدیوں تک رونما نہ ہوئی۔ یہ لوگ طریقت وشریعت کے جامع تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے محافظ۔

حضرات الصوفیہ کے تذکرے عام طور پر ان ہی اصحاب نے قلم بند کیے جو خود بھی صوفی تھے اور صوفیہ کی طرح چوٹی کے عالم بھی تھے بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ تصوف پر کتب تصنیف اور مرتب

Marfat.com

کرنے والوں میں بھاری اکثریت ان کی تھی جو فقیہ تھے۔ مثلاً

الحارث بن اسد المحاسبی، مصنف "کتاب الرعاية لحقوق الله". ابونصر السراج :مصنف "کتاب اللمع فی التصوف". ابوبکر محمد بن اسحق الکلاباذی مصنف "کتاب التعرف لمذهب اهل التصوف". ابوطالب المکی مصنف" قوت القلوب". ابوعبدالرحمن السلمی نیشا پوری مصنف "طبقات الصوفیه". ابو القاسم القشیری مصنف "رساله القشیریه". علی بن عثمان الهجویری مصنف "کشف المحجوب". شیخ الاسلام عبدالله الانصاری مصنف "طبقات الصوفیه والمنازل السائرین". کمال الدین عبدالرزاق کا شانی مصنف "کتاب اصطلاحات الصوفیه". ابوالخبیب ضیاء الدین عبدالقادر بن عبدالله بن محمد السهروردی مصنف " عوارف المعارف". شهاب الدین ابوحفص عمر السهروردی مصنف"عوارف المعارف". عین القضاة ابو المعالی عبدالله بن ابی بکر محمد بن علی الهمدانی مصنف " تمهیدات" و "زبدة الحقائق". شیخ عبدالقادر جیلانی مصنف "فتوح الغیب" و " الفتح ربانی". خواجه فرید الدین عطار مصنف "تذکرة الاولیا". عبدالرحمن الجامی مصنف "نفحات الانس" و "لوائح".

یہ سب لوگ صوفی تھے مگر ان کے سوانح سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ علوم متداولہ میں صاحبِ کمال تھے اور فقہ میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔۔اس لیے کہ فقہ دین کا ستون ہے۔ حضرت ابنِ عمر سے مروی ہے:

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم :"ما عندالله عزوجل بشیء افضل من فقه فی الدین، والفقیه واحد اشد علی الشیطان من الف عابد. ولکل شیء عماد، وعماد هذا الدین الفقه"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دین کے تفقہ سے برتر کسی نے اللہ کی کوئی عبادت نہیں کی۔ سو عابدوں کے مقابل شیطان کے لیے ایک فقیہ زیادہ مضبوط اور سخت ثابت ہوتا ہے۔ ہر چیز کا کوئی تکیہ اور ستون ہوتا ہے اور اس دین یعنی اسلام کا تکیہ اور ستون فقہ ہے"۔

Marfat.com

قرآن کریم کا ارشاد ہے:

''اور مومنوں کو نہ چاہیے کہ (آئندہ) سب کے سب نکل کھڑے ہوں۔ یہ کیوں نہ ہوا کہ ہر گروہ میں سے ایک حصہ نکل کھڑا ہوا کرے تا کہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے کریں اور یہ اپنی قوم والوں کو جب وہ ان کے پاس جائیں تو ڈراتے رہیں۔ کیا عجب کہ وہ محتاط ہو جائیں''۔

ابوالنجیب ضیاءالدین عبدالقاہر السہر وردی اس آیت کی تشریح میں کہتے ہیں:

فصار الانذار مستفا دمن الفقه. والانذار :احياء المنذر بما ء العلم ؛والاحياء بالعلم رتبة الفقية فی الدين فصار الفقه فی الدين من اكمل المراتب وأعلاها ''۔(چنانچہ خوف دلانا دین کے تفقہ سے حاصل ہوا اور خوف دلانا اس کو جسے خوف دلایا جا رہا ہو علم کے پانی سے زندہ کرنا ہے اور علم کے ساتھ زندہ کرنے کا عمل ''تفقہ فی الدین'' رکھنے والے کی نیت ہے۔ لہٰذا ''تفقہ فی الدین'' دین کے کامل اور بلند ترین مراتب میں سے قرار پایا۔)

تو یہ حضرات الصوفیہ دین کی کامل سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگ تھے اور علم دین کے پانی سے مُردہ روحوں کو زندہ کرتے تھے۔ حضرت القشیر ی لکھتے ہیں:

> ''اس جماعت کے شیوخ میں سے چند لوگوں کا ہم نے یہاں ذکر کیا۔ ان کا اس جگہ ذکر کرنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ میں لوگوں کو متنبہ کر دوں کہ یہ سب لوگ شریعت کی تعظیم کرنے پر متفق ہیں اور طریقِ ریاضت میں سنت کی تابعداری پر پابندی کرتے ہیں''۔

ایک عام عالم اور صوفی میں امتیازی فرق یہ ہے کہ صوفی علم ظاہری کو قلب وجگر اور روح وجان کا جز بنا کر حقیقت وواقعیت سے آگاہی حاصل کر لیتا ہے اور اس طرح اسلام کو دل وجان کا جز بنا کر ایمان اور ایمان کو ایقان کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ بالفاظِ دگر صوفی مدرسی علم یا اکتسابی علم کو معرفت وعرفان بنا دیتے ہیں۔ حضرت فریدالدین عطار فرماتے ہیں:

''صوفی علم رسمی یعنی دانائی اکتسابی و آموختی را علم می نامد از حالیکه دانائی مخصوص بصوفیه رامعرفت

Marfat.com

یا عرفان می نامد"۔

مگرعرفان کی منزل پر پہنچ کرکوئی عارف یا صوفی اگر واقعی صاحبِ عرفان ہے تو تارکِ شریعت نہیں ہوتا۔ وہ باطن میں ڈوب کر ظاہر کی حقیقت معلوم کرلیتا ہے اور ظاہر پر اس کا یقین مستحکم ہوجاتا ہے۔ اس کے لیے سنت ہی طریقت بن جاتی ہے۔ لہٰذا جس نے عرفان کا سہارا لے کر سنت کو ترک کردیا گویا اس نے کچھ بھی نہ پایا۔ حیرت اور جذب کی کیفیت اور ہے مگر علماء نے ہی نہیں خود عرفاء نے بھی ظاہر شریعت سے، بزعمِ عرفان، دانستہ انحراف کرنے والوں کو مجرم قرار دیا ہے۔

کسی نے حضرت یحییٰ بن معاذ الرازی سے پوچھا: "جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ ہم کو اب نماز نہ پڑھنی چاہیے وہ کیسے ہیں"؟ آپ نے جواب دیا: "وہ قبر تک پہنچے ہیں، دوزخ تک نہیں پہنچے"۔ مراد اس سے یہ ہے کہ سنت سے انحراف کرنے والے یہ لوگ مُردوں میں شامل ہیں اور آگے جاکے جو سزا ملے گی وہ دوزخ کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے؟

حضرت جنید بغدادی کا قول ہے:

"تمام مخلوق کے لیے اللہ تک پہنچنے کے راستے بند ہیں۔ ماسوائے ان لوگوں کے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلیں"۔

ابوسلیمان عبدالرحمٰن الدارانی فرماتے ہیں:

"بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ میرے دل پر صوفیاء کے نکاتِ معرفت وارد ہوتے ہیں اور کئی دنوں تک رہتے ہیں۔ مگر جب تک کتاب وسنت کے دونوں عادل گواہ اس کی تائید نہ کریں، میں انہیں قبول نہیں کرتا"۔

اس باب میں حضرت مجدد الف ثانی لکھتے ہیں:

"طریقِ صوفیہ پر سلوک کرنے سے مقصود یہ ہے کہ معتقداتِ شرعیہ پر جو ایمان کی حقیقت ہیں زیادہ یقین حاصل ہوجائے اور فقیہہ کو احکام کے ادا کرنے میں آسانی میسر ہو"۔

عرفان سے تو کتاب وسنت کے اوامر ونواہی آسان ہوجاتے ہیں اور ان کی ادائی میں نفس کو ضیق نہیں محسوس ہوتی۔ عرفان کے باعث ظاہرِ شریعت کی خلاف ورزی کا خیال بھی پیدا

Marfat.com

نہیں ہوسکتا۔

حضرت غوث الاعظم عبدالقادر الجیلانی کا ارشاد ہے:

''الصوفی من صفا باطنه وظاهره بمتابعة کتاب الله عزوجل و سنة رسوله .....اساس الخیر متابعة النبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم فی قوله وفعله''۔(صوفی وہ ہے جس نے اپنے باطن اور ظاہر کو قرآن اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کے باعث پاک صاف کرلیا ہو۔ بھلائی اور نیکی کی بنیاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہے، ان کے قول وفعل میں۔)

اس ضمن میں حضرت الحارث بن اسد المحاسبی فرماتے ہیں:

''من صحح باطنه بالمراقبة والاخلاص زین الله ظاهره بالمجاهدة واتباع السنة''۔(جس نے اپنا باطن مراقبہ واخلاص کے باعث درست کرلیا، اللہ تعالیٰ نے اس کے ظاہر کو ریاضت واتباعِ سنت کے باعث سجادیا۔)

حضرت خواجہ بہاءالدین نقشبندی کا قول ہے:

''ہمارا طریقہ عروۃ الوثقیٰ ہے.....یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن کو مضبوطی سے پکڑنا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار کی پیروی کرنا۔''

خواجہ محمد پارسا سے پوچھا گیا کہ طریقت کیونکر حاصل کرسکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''شرع کی پابندی سے''۔

ان ہی جملہ مضامین کے دریا کو علامہ اقبال نے شعر ذیل کے کوزے میں بند کردیا:

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

حضرت ابوسلیمان عبدالرحمٰن الدارانی کا قول گزر چکا ہے کہ صوفیہ کے نکات انہیں کئی کئی دن پریشان رکھتے تھے لیکن جب تک کتاب وسنت کے دونوں عادل گواہ تائید نہ کرتے، وہ انہیں قبول

Marfat.com

نہیں فرماتے تھے۔علامہ اقبال کا مقصودِ بیان شعر بالا میں بھی یہی ہے کہ کسی خیال، فکر، انکشاف، نظریہ، القا، کشف کو جوں کا توں قبول نہیں کرلیا جانا چاہیے۔ممکن ہے اپنے نفس کا تجزیہ غلط ہو، ممکن ہے اپنا نفس دھوکا دے رہا ہو۔آنکھوں کو کچھ غلط سجھائی دے رہا ہو، کان کچھ غلط سمجھ رہے ہوں، ممکن ہے ہم جسے فرشتے کی آواز سمجھ رہے ہیں وہ اپنے اندرون سے کسی غلط خواہش کے باعث پیدا ہورہی ہو اور مغالطہ رونما ہورہا ہو۔ایسی ہر کیفیت کا ایک ہی علاج ہے اور وہ کتاب وسنت کی پیروی ہے۔وہ کتاب جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور وہ عمل جو اس کتاب کی ہدایت کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا۔اگر ہمارا کوئی کشف یا القا کتاب وسنت کی کسوٹی پر کھرا ثابت نہیں ہوتا تو جان لینا چاہیے کہ ہم نقصِ فہم کا شکار ہورہے ہیں۔حضرات صوفیہ طریقت میں شرع کی اس کسوٹی کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے تھے اور جو اس کسوٹی کو نظر انداز کرتے تھے انہیں مُردہ جانتے تھے اور دوزخ کا مستحق۔علامہ اقبال نے اس وضع احتیاط پر کاربند رہنے کی شعر ذیل میں بڑے فنکارانہ انداز میں تلقین کی ہے اور 'باوزسیدی' ہی کی وضاحت ہے:

صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

ابوالحسن احمد بن ابی الحواری کا ارشاد ہے:

''من عمل عملا بلا اتباع سنة رسول الله (صلى الله عليه وسلم) فعله باطل''۔(جس نے بلا اتباعِ رسول عمل کیا اس کا عمل باطل رہا)۔

حضرت ابویزید بسطامی وہ بزرگ ہیں کہ ان کے بارے میں سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی نے فرمایا تھا: ''بایزید درمیان ما چوں جبرئیل است درمیان ملائکہ''۔ان حضرت بایزید کا اپنا ارشاد ملاحظہ ہو:

''اگر تم کسی آدمی کو دیکھو کہ اسے کرامات دی گئی ہیں۔یہاں تک کہ وہ ہوا میں اڑتا ہو پھر بھی تم اس سے دھوکا نہ کھانا۔یہاں تک کہ تم یہ نہ دیکھ لو کہ وہ اوامر ونواہی، حدود اللہ کی محافظت اور شریعت کی ادائیگی میں کیسا ہے''؟

حضرت ذوالنون مصری فرماتے ہیں:

Marfat.com

''اللہ کو دوست رکھنے والے کی علامتیں یہ ہیں کہ اخلاق، افعال، اوامر اور
سنن میں اللہ کے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کرے''۔

مختصر یہ کہ حضرات الصوفیہ کی عزلت گزینی نہ ترک دنیا تھی اور نہ رہبانیت۔ بلکہ وہ تزکیہ نفس کی ایک صورت تھی، وہ ایک طرح کی تربیت ذات تھی اور اس باب میں خود آنحضور کا نمونہ ان کے روبرو تھا جیسا کہ ''تفقه ثم اعتزل'' کے سلسلے میں حضرت غوث الاعظم کے حوالے سے واضح کیا جا چکا ہے۔ اُن کا اوڑھنا، بچھونا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا اسوۂ حسنہ تھا۔ ایک عرب شاعر کہتا ہے:

لو كان حبّك صادقاً لاطعتهٗ
ان المحبّ لمن يحبّ مطيع

(اگر تیری محبت سچی ہوتی تو پھر تو اس کی اطاعت بھی کرتا۔ اس لیے کہ
محبت کرنے والا تو اپنے محبوب کا مطیع ہوتا ہے۔)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''الفقرا سرع الی من یجنی من سیل الماء الی منتهاهُ''۔ (مجھ سے محبت کرنے والا فقر کی جانب اس تیزی سے بڑھتا ہے کہ سیلاب بھی اس تیزی سے اپنی منزل کی جانب نہیں بہتا۔)

لہٰذا ان صوفیہ کے مزاج میں بھی کہ وہ عاشقانِ رسولِ خدا تھے، درویشی راسخ ہو جاتی تھی اور انہیں اسی میں مزا آتا تھا۔ چنانچہ وہ ہر طرح کے کبر، نخوت، ہوس، حرص، جاہ، تمکنت، غرور وغیرہ کی آلائش سے مبرا ہو جاتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا آخر اور کیا مطلب تھا۔ ماسوا اس کے کہ عملاً اسی اسوۂ حسنہ کا نمونہ پیش کیا جائے۔ جس کے آپ ﷺ مظہر تھے؟ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''انما بعثت لاتمّم صالح الاخلاق''۔ اور یہ دوسری طرح یوں آیا ہے: ''انّما بعثت لاتمّم مکارم الاخلاق'' (مجھے اخلاق عالیہ کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔)

اسی طرح آپ کا ایک اور ارشاد ہے: ''احبّ عباداللہ الی اللہ احسنهم خلقا''۔ (اللہ کا سب سے پسندیدہ بندہ وہ ہے جو بندوں میں سب سے بہتر اخلاق کا مالک ہے۔) چنانچہ حضرات الصوفیہ حسنِ اخلاق کا بہتر سے بہتر نمونہ بننے کی کوشش کرتے تھے۔ حضرت امام محمد باقر کا قول ہے: ''التصوف خلق فمن زاد علیك فی الخلق زاد علیك فی

Marfat.com

التصوف "۔(تصوف تو نام ہی حسنِ اخلاق کا ہے جو جتنا تم سے حسنِ اخلاق میں آگے ہے، اتنا ہی تصوف میں آگے ہے۔)

اسی طرح حضرت ابوالحسن نوری کا قول ہے: "لیس التصوف رسوماً ولا علوماً ولکن اخلاق "۔(تصوف محض رسوم وعلوم کا نام نہیں، تصوف تو اخلاق کا نام ہے۔)

ابوالنجیب عبدالقادر بن عبداللہ السہر وردی "عوارف المعارف" میں رقم طراز ہیں:

"فالصوفیة راضوانفوسهم بالمکابدات و المجاهدات حتی اجابت الی تحسین الاخلاق. و کم من نفس تجیب الی الاعمال ولا تجیب الی الاخلاق، فنفوس العباد اجابت الی الاعمال وجمعت علیٰ الاخلاق و نفوس الزهاد اجابت الی بعض الاخلاق دون البعض. ونفوس الصوفیة اجابت الی الاخلاق الکریمة کلها." (صوفیوں نے اپنے نفسوں کو مشقتیں اور ریاضتیں کر کے اس طرح سدھا لیا کہ ان کے نفوس نے حسنِ اخلاق کو قبول کر لیا۔ کتنے ہی نفوس ہیں کہ اعمال کو قبول کر لیتے ہیں مگر اخلاق سے کتراتے ہیں۔ زاہدوں کے نفوس بعض اخلاق کو قبول کرتے ہیں اور بعض کو قبول نہیں کرتے۔ مگر صوفیہ کے نفوس تمام اعلیٰ اخلاق کو قبول کر لیتے ہیں۔)

ابوالنجیب السہر وردی نے کیا پتے کی بات کہی ہے کہ ایسے آدمی موجود ہیں جو نماز بھی پڑھتے ہیں۔ زکوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں۔ دیگر احکام شرع کی بھی تعمیل کرتے ہیں، لیکن یہ عمل چونکہ دل وجان میں راسخ نہیں ہوتا۔ لہٰذا عام معاملات، میل جول، رحم، شفقت، غمگساری، بھلائی، ایثار وغیرہ وغیرہ کے باب میں غافل رہتے ہیں اور اگر متوجہ ہوں بھی تو طبیعت یہ برداشت نہیں کرتی۔

مولانا حالی نے کہا تھا:

ہم نہ تھے آگاہ واعظ زشت خوئی سے تیری
آدمی تجھ کو سمجھ کر پاس آ بیٹھے تھے ہم!

گویا حضرت واعظ جملہ علم ودانش کے باوصف اپنے نفس کی ناتربیت یافتگی کے باعث مزاج

Marfat.com

میں گداز پیدا نہ کر سکے۔ اور یہ آج کی دنیا کا اور آج کے انسانی معاشرے کا سب سے بڑا حادثہ ہے کہ علم و دانش اور مشاہدات و تجربات اور افکار و خیالات کی وسیع کائنات اولادِ آدم کو میسر ہے مگر حسنِ معاملت اور دل سوزی اور ہمدردی کے جوہر ناپید ہیں۔ یعنی انسان اسی شے سے محروم ہے جسے انسانیت کہتے ہیں نتیجہ یہ کہ آدمی سے آدمی دور ہوتا جا رہا ہے۔ علمی و عقلی بلندی اور اخلاقی پستی ایک ہی شخص میں متوازی رواں دواں رہتی ہیں۔ مزید نتیجہ یہ کہ کسی بھی عالم و فاضل کو محض اس کے علم و فضل کی بنا پر ہم نہ قول کا سچا قرار دے سکتے ہیں نہ وفادار فرض کر سکتے ہیں، نہ مخلص جان سکتے ہیں اور نہ ایثار پیشہ اور مخیّر۔ جب تک تزکیہ نفس نہ ہو اور روح آلائشوں سے مبّرا نہ ہو اس وقت تک حسنِ اخلاق اور حسنِ معاملات کا بار برداشت کیا ہی نہیں جا سکتا۔

ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ تصوف کا آغاز غیر اسلامی عناصر کی اثر اندازی سے ہوا۔ حالانکہ صحیح تو یہ ہے کہ اس کا انجام غیر اسلامی عناصر کی دراندازی پر ہوا، اس لیے کہ اسلامی معاشرہ جب اسلامی روح سے ہمہ جہتی محرومی کا شکار ہو گیا تو تزکیہ نفس کی کوشش اور حسنِ معاملت بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اجتماعی ناپاکی تصوف میں داخل ہو گئی۔ لہٰذا تصوف زوال کا باعث نہ تھا بلکہ زوال کی زد میں آ گیا تھا۔ تصوف جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ ایک مزاج اور عمل کا نام ہے اس کا آغاز تو غارِ حرا سے ہو گیا تھا۔ اس کا آغاز تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہو گیا تھا کہ ''الفقر فخری''۔ اس کا آغاز تو قرآن میں بار بار وارد ہونے والے مضامین ''تزکیہ'' سے ہو گیا تھا۔ رہا بدھی، مسیحی، یہودی اور افلاطونی اثرات کا کھوج، تو حقائق کا مزاج بین الاقوامی ہے۔ سچائی کسی خاص علاقے یا معاشرے میں محدود و مخصوص نہیں۔ اس لیے آنحضورؐ نے حکمت و دانش کو مومن کا اپنا گمشدہ مال قرار دیا ہے۔ اقوام کے میل جول سے تبادلِ تاثرات لازم ہے، تصوف کے معاملے میں واضح ہے کہ اس کا آغاز، نمو اور تقویت اور شباب بیشتر کتاب و سنت کا عطیہ تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعد میں باہر کے اثرات کی وجہ سے کچھ حضرات سنت و شریعت سے غافل ہو گئے اور سرنگ میں روپوش ہو کر رہ گئے۔

بہ مرور وقت صوفیہ کے یہاں بعض کلامی اور فلسفیانہ مباحث ایسے بھی راہ پا گئے جو قدیم الاصل اسلامی عقائد سے بعض اوقات متصادم نظر آتے ہیں مگر اپنے زمانے کے کلامی و فلسفیانہ مسائل کو فکری کاوش سے حل کرنے کی کوشش کرنا اور معاملہ ہے اور اصل عقائد الگ قصہ ہے۔ لہٰذا

Marfat.com

مباحث کی بنا پر کسی صوفی کے اساسی عقائد کے بارے میں بدگماں ہونا بجا نہ ہوگا۔ حنظل اور تربوز کی بیل کے روپ میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ مگر ثمر میں جو فرق ہے۔ وہ من لم یذق لم یدرا (جس نے چکھا ہی نہیں وہ کیا جانے) کا معاملہ ہے۔

مثال کے طور پر شہاب الدین ابو حفص عمر السہر وردی، صاحب عوارف العارف، اور حضرت ابن عربی مفکرین صوفیہ میں شمار ہوتے ہیں مگر حضرت سعد الدین حمدیہ سے جب حضرت سہروردی کے بارے میں پوچھا گیا، تو انہوں نے جواب دیا: ''نور متابعة النبی صلی الله علیه وسلم فی جبین السهروردی شیء آخر (یعنی سہروردی کی پیشانی میں نبی اکرم کی متابعت کا نور کچھ نرالی ہی شان کا مالک ہے۔) اور جب سہروردی سے ابنِ عربی کے بارے میں پوچھا گیا (خاموش آمنا سامنا ہونے کے بعد) تو انہوں نے کہا: ''هو بحر الحقائق''۔ رہے ابنِ عربی تو وہ خود فرماتے ہیں: فلم ازل اقول واعمل ما اقوله واعمله الا یقول النبی صلی الله علیه وسلم ولا بعملی ولا بعینی ولا بمشاهدتی. (یعنی میں وہی کچھ کہتا ہوں اور وہی کچھ کرتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وارشاد کے مطابق ہے۔ میں نے اپنے علم اپنے معائنے اور اپنے مشاہدے سے کچھ نہیں کیا۔ اسی طرح ڈاکٹر قاسم غنی نے تصوف کے ضمن میں ابنِ عربی کا ایک قول نقل کیا ہے:

''وقوف بآداب شرعیه ظاهراً و باطناً وآں عبارت از اخلاق الٰهیه است و گاهی کلمهٔ تصوف مرادف به مکارم اخلاق استعمال میشود. تصوف پرهیز ازاخلاق زشت برای مستعد شدن بقبول تجلی صفات الٰهی است .....گویا صوفیۂ متاخرین کا بھی عالم یہ تھا کہ معاصر فکری مباحث کی رنگا رنگ اثر اندازی کے باوصف ان کا اپنا شعار اور عمل اسی نہج پر رہا جسے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت اور اسوۂ حسنہ کے شمس بازغہ نے منور کیا۔

Marfat.com

نعت رسولِ مقبول ﷺ اور مولانا ظفر علی خاں

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کو جو شیفتگی اور وابستگی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ یہی نام نامی اس امت کے لیے محور مودت، مرکز الفت اور یہی ذات گرامی علمبرداران توحید کی ہستیِ منفرد کی موجب وضامن ہے۔ مسلمانوں کے لیے یہی بارگاہ غایت نگاہ اور یہی نظر مقصودِ قلب وجگر ہے۔ یہی شعلۂ عشق ملّتِ بیضا کا مابہ الامتیاز ہے اور یہی جذبۂ عقیدت قوم حجاز کے سازِ جان کا مضراب۔

مسلمان شعرا میں سے قریباً ہر بڑے شاعر نے حمد خدا کے ساتھ نعتِ رسول خداوند کہی اور اس سعادت کو اپنے گنجینۂ شعر کے لیے تاج کرامت سمجھا۔ حسان بن ثابتؓ اور کعب بن زہیرؓ سے لے کر ابن الفرید ابن عربی تک اور ان سے لے کر عہد حاضر کے شوقی وابراہیم تک ہر بڑا عربی شاعر اس نغمہ جان نواز سے رطب اللسان رہا۔ اسی طرح سنائی وعطار سے چل کے خسرو جامی اور عہد حاضر کے جگر وحفیظ تک فارسی اور اردو کے قریباً ہر نامی شاعر نے بحضور سرور کونینؐ اپنے شعری گلدستہ ہائے عقیدت کو پیش کیا۔

نعت گوئی باعتبار صنفِ سخن بڑا کٹھن کام ہے۔ اس فرضِ صعب سے عہدہ برآ ہونا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں کیونکہ قصیدہ وغزل میں تخیلات ومضامین کی جولانیاں جس رنگ اور جس انداز سے کارفرما ہوتی ہیں وہ اس مقام پر نسبتاً محدود ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ یہاں شاعر وَالشعرأ الّذین یَتَّبِعُھم الغاوون کا مصداق نہیں بن سکتے۔ یہاں ہر بات سوچ سمجھ کر کہنا پڑتی ہے۔ حدود کا احترام کرنا پڑتا ہے اور ادب کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا

لہٰذا احسن الشعراء اکذبھم والی بات اس صنفِ سخن میں تو بالکل ہی کام نہیں دیتی۔ حقیقت

Marfat.com

شعری کی گنجائش ہے مگر وہ بھی انہی حدود میں۔ یہی باعث ہے کہ شوخ اور جوشیلی طبیعتیں اس مقام پر اپنے آپ کو رکا رکا پاتی ہیں اور انہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعرانہ جوہر یہاں نہیں دکھائے جاسکتے۔ یہاں فقط اظہار محبت ہوگا، اپنا درد بیان ہوگا۔ اور التماس والتجا تک بات محدود رہے گی۔ اسی سبب سے مولانا شبلی نے مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کو یہ صنف بحیثیت فن اپنا لینے سے منع کیا تھا اور مشورہ دیا تھا کہ ''ثواب مقصود ہے تو درود پڑھ لیا کیجئے''.....لیکن اگر یہ اعراض یوں آسان ہوتا تو خود شبلی کو بھی اس طرح نہ کہنا پڑتا۔

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرؐ خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

طبع آزمائی کے لیے انتہائی حزم واحتیاط کی ضرورت ہے۔ لہٰذا یہ منزل کٹھن ہے۔ لیکن پختہ فکر فنکار شعراء نے نعت کو بھی مرقعۂ ہزار رنگ بنا دیا ہے اور حدود ادب میں رہ کر وہ نکتہ آفرینیاں کی ہیں کہ دل اَش اَش کر اٹھتا ہے۔ خلوص شرط ہے۔ یہاں بناوٹ سے بات نہیں بنتی۔ انہی پختہ کار شعرا میں سے ایک عاشق رسولؐ مولانا ظفر علی خان (مدظلہٗ) بھی ہیں۔ جنہوں نے نعت کو ہئیت و مواد کے حسین امتزاج سے حسین مرقعوں کی صورت میں پیش کیا ہے۔ آخر ''خونِ جگر'' کس فن میں رنگ نہیں بھرتا اور خلوص کہاں تاثر پیدا نہیں کرتا۔

قطرۂ خونِ جگر سل کو بناتا ہے دل

مولانا ظفر علی خان کی شاعری کو ''ہنگامی'' اور ''سیاسی'' شاعری کا نام دے کر لوگوں نے پسِ پشت ڈال دیا۔ اس بات پر غور کرنے کی ضرورت بہت کم آدمیوں نے محسوس کی ہے کہ اس فرمانروائے مملکتِ سخن نے کیا کیا ادبی نکتہ سنجیاں کی ہیں۔۔ اردو ادب کو کتنی وسعت دی ہے۔ کتنے گراں قدر الفاظ بخشے ہیں۔ کتنی رنگین وخوش آہنگ تراکیب عطا کی ہیں۔ صنفِ ''نظم'' کی ترقی و وسعت میں ان کا کتنا ہاتھ ہے۔ نیز یہ کہ طنز وظرافت کے کس قدر فارستان وگلستان پیدا کیے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ اوصاف کم بھی ہوتے تو بھی مسلمانوں کی کشمکش کی تاریخ ہونے کے اعتبار سے ان کے کلام کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

Marfat.com

مولانا کی ایسی نظمیں جن میں کسی نہ کسی جذبے سے نبی اکرمؐ کو یاد کیا گیا ہے تعداد میں بہت زیادہ ہیں لیکن ظاہر ہے کہ وہ متعلقہ اشعار تو کلامِ نعت ہو سکتے ہیں مگر ان نظموں کو ''نعتیں'' نہیں کہا جا سکتا۔ ان میں ذیل کی چند ایک نظمیں خصوصاً قابل ذکر ہیں:

''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ''۔ ''آوازۂ حق''، ''دعا''، ''لیس کمثلہٖ شیءٌ''، ''جہانِ باطن''، ''دوائے بے پرہیز''، ''مے باقی''، ''قسمت کی شوخی''، ''ناز طبیب''، ''پھر وہی تو''، ''پختگی اور خامی''، ''پیغمبر کی شفاعت پر میرا حق''، ''مدینہ کے ایک کبوتر کی یاد''، ''ذوقِ ادب''، ''نقارۂ خدا''، ''تاجدار مدینہ کے غلاموں کی شان'' وغیرہ۔

مذکورہ بالا نظموں میں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں چوتھائی سے کچھ اوپر اشعار خواجہ دوسراؒ کے بارے میں ہیں۔ کل اشعار چالیس کے لگ بھگ ہیں۔ کچھ اشعار درج کیے جاتے ہیں:

وہ ذاتِ پاک نبی جو خلاصۂ مقدور
خدا کے بعد ہوئی کائنات میں افضل
بہار باغِ رسالت کی آمد آمد ہے
خدائے پاک کی رحمت کے چھائے ہیں بادل
عرب سے اٹھ کے زمانہ پہ یہ گھٹا برسی
درخت سبز ہوئے پھوٹنے لگی کونپل
جہان و اہلِ جہاں کی پلٹ گئی کایا
کھلا دریچۂ رحمت کھلے دلوں کے کنول

''دعا'' چار شعروں کی چھوٹی سی نظم ہے۔ یہ ''دعا'' بارگاہ الٰہی میں ہے مگر دیکھیے تان کہاں ٹوٹتی ہے:

الٰہی برقِ غیرت کی تڑپ مجھ کو عطا کر دے
مجھ آتش زیرِ پا کو ساتھ ہی آتش نوا کر دے
مری تقریرِ سحر آلود میں کر وہ اثر پیدا
کہ اہلِ درد کے حلقوں میں اک محشر بپا کر دے
دیا ہے علم گر تو نے تو ساتھ اس کے عمل بھی ہو
کہ شرحِ لیس للانسان الّا ما سعٰی کر دے

Marfat.com

بتادوں گا کہ خاک ہند یوں اکسیر بنتی ہے
مری پلکوں کو جاروب حریم مصطفیٰؐ کر دے

''مقامِ حیرت'' بھی حمد خدا ہے جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے:

مرے کس کام میری دانشِ مشکل کشا آئی
سمجھ تیری ذرا مجھ کو نہ اے میرے خدا آئی

اس شعر سے آگے تفصیل ہے اس امر کی کہ دنیا کا معمہ حل نہ ہوا۔ نگاہ عرش سے فرش تک دوڑی۔ آتش و آب و باد خاک کو دیکھ بھال چھان پھٹک کر بیٹھی کچھ بھی پلے نہ پڑا۔ اُلٹا جو کچھ ساتھ لے گئی تھی وہ بھی گنوا آئی اور آخر کار نور حقیقت کی تجلی ظاہر ہوئی تو فقط آفتاب رسالت کے طفیل:

چمکتا نیّر اعظم نہ ہم پر گر رسالت کا
خرد سے مرتبہ کچھ بھی نہ کم ہوتا جہالت کا

یہی کیفیت ''لیس کمثلہٖ شیءٌ'' کی ہے۔ عنوان سے ظاہر ہے کہ یہ نظم خدائے ذوالجلال کی حمد ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ: ارض و سما۔۔ سال و ماہ۔۔ اوج ثریا۔۔ سوا و طور۔۔ منشا یعقوب۔۔ ترانۂ داؤد۔۔ وغیرہ اسی ذاتِ واحد کے مختلف پرتو ہیں لیکن اگر جلوہ الٰہی کو اصلی صورت میں دیکھنا ہو تو وہ فقط سرکار دو عالمؐ کے نور جبیں میں ہے:

جو اس کو صورتِ اصلی میں دیکھنا چاہو
محمدؐ عربی کی جبیں کے نور میں ہے

اس زاویہ سے دیکھا جائے تو یہ ''حمدیں'' حمدیں کم ہیں اور نعتیں زیادہ۔ علاوہ ازیں اسلام اور اہل اسلام سے متعلق جتنی بھی نظمیں ہیں وہ نعتیہ اشعار کی تعداد کثیر کی حامل ہیں جن کی مثالیں باعث طوالت مضمون ہوں گی لہٰذا قلم انداز کی جاتی ہیں۔

رہیں وہ نظمیں جنہیں خالص نعتیں کہا جا سکتا ہے تو ان کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ ''فریاد بحضور سرورِ کونینؐ''، ''عرضِ حال بدرگاہ ربّ العزت''، '' صلوا علیہ وآلہٖ''، ''رحمتہ للعالمین''، '' شب معراج''، '' التجا بحضور سرورِ کائنات''، '' نذر مختصر''، ''عرض داشتِ امت''، '' نذر عقیدت''، ''اسلامیان ہند کی فریاد''، ''جشن میلاد النبیؐ''، ''صاحب قاب قوسین او ادنیٰ''، ''تاجدار عرب و عجم''، '' مقامِ محمدؐ''، ''فخر رسلؐ''، ''عشقِ رسولؐ''، ''نور حقیقت''، ''نوید مسیحا''، ''ماہ

Marfat.com

وپرویں''، ''شان احمد مجتبیٰ''، شان مصطفوی''، ''سرکار دو عالم سے التجا''، ''سرکار دو عالم کا دربار''، ''مدینہ منورہ''، ''چراغ کعبہ''، ''امت کے حق میں پیغمبر کی دعا'' وغیرہ وغیرہ۔

یہ نعتیں اس دور کی یاد ہیں جب مسلمان ایک عجیب سیاسی و معاشی کشمکش میں مبتلا تھے۔ وہ سلسلہ ابتلا اب بھی ختم نہیں ہوا مگر وہ حالت کچھ اور ہی تھی۔ جنگ عظیم اول نے مسلمانوں کی رہی سہی وقعت کو بھی ختم کر دیا تھا۔ ان کے سب علم ختم ہو گئے تھے۔ مصر، ایران، عرب، مغربی افریقہ، انڈونیشیا، ہندوستان سب غلام ممالک تھے افغانستان کے والی بھی فقط ''امیر'' تھے۔ بادشاہ بھی نہ تھے۔ ترکی کی آزاد سلطنت کو شکست فاش ہو چکی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسلام کا یہ جھلملاتا ہوا چراغ اپنی آخری لو دے کر بے نور ہونے کو ہے کہ احساسِ زیاں نمودار ہونے لگا۔ ترکی نے از سر نو اتحادیوں کے خلاف مورچے گاڑ دیے۔ عرب میں ابن سعود نے زور پکڑنا شروع کیا۔ افغانستان میں آہستہ آہستہ امان اللہ خان نے آزادی حاصل کر لی اور بادشاہ بن گیا۔ مصر میں ہلچل شروع ہو گئی۔ ایران میں بے چینی نظر آنے لگی۔ حتیٰ کہ ہندوستانی مسلمانوں میں بھی بیداری کے آثار نظر آنے لگے۔ اگرچہ اس وقت مسلمانانِ ہند کے سامنے کوئی بیّن مقصد نہ تھا۔ کوئی روشن منزل نہ تھی مگر وہ تھوڑی دور تک ہر راہرو کے ہمراہ چل کھڑے ہوتے تھے۔

بیرونی ممالک کے مسلمانوں کو تو فقط مغربی استعمار ہی کا مقابلہ کرنا تھا مگر ہندوستان میں مسلمانوں کی کشمکش زیادہ پُر پیچ تھی۔ یہاں ایک طرف انگریز کا مقابلہ تھا تو دوسری طرف ابنائے وطن کی چیرہ دستیوں کا سامنا۔ وہ حاکموں کے لیے غلام اور ہندوؤں کے لیے غیر تھے۔ شوکتِ رفتہ کی یادیں مسلمانوں کے دلوں میں ناسور بن رہی تھیں۔ اسی دور کی یادیں ہندوؤں کو آمادۂ انتقام کر رہی تھیں۔ یہ عالم کس مپرسی اور بے کسی پوری طرح طاری تھا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس عہد میں مسلمانوں کو کچھ ایسے رہنما مل گئے جنہوں نے ان کے خون کو گرمائے رکھا۔ حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، ڈاکٹر اقبال، مولانا حسرت موہانی، اور احرار رہنما وغیرہم خواہ اپنی اپنی جگہ کسی بھی سیاسی نظریے کے حامل رہے ہوں مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے مسلمانانِ ہند کو سونے نہیں دیا۔ کبھی ایک شاہراہ پر ڈال دیا۔ کبھی دوسری شاہراہ پر چلا دیا۔ مگر حرکت کو ختم نہیں ہونے دیا۔ نیز اسلامی غیرت کی آگ کو بھی مشتعل رکھنے میں انہی بزرگوں کا ہاتھ ہے۔ ''توحید'' کا علم

Marfat.com

انہی نے اٹھا رکھا تھا۔اور ''رسالت'' کی عظمت وتوقیر کے علم بردار بھی یہی اصحاب تھے۔مولانا ظفر علی خان بھی اسی متموج سیاست میں غلطاں تھے اوران کی یہ نعتیں اسی عہد پُر آشوب کے ستائے ہوئے دل ودماغ کی صدا معلوم ہوتی ہیں۔

مولانا نے اپنی ''نعتیں'' نظموں کی صورت میں کہی ہیں۔خسرو یا احسن مارہروی وغیرہ کی طرح قصیدوں کا انداز اختیار نہیں کیا۔

نعت کے عام مروجہ مضامین میں آپؐ کی ذات بابرکات کا وجہ ظہور کائنات ہونا مذکور ہوتا ہے۔معجزات کا ذکر ہوتا ہے۔''معراج'' کی جانب کئی طرح کے اشارے ہوتے ہیں۔خاتم مہر نبوت ہونے کی حقیقت کا بیان ہوتا ہے۔آپؐ کے سید الانبیا اور محبوب خدا ہونے کے مضمون سے نکتہ آفرینیاں کی جاتی ہیں آپ کے شفیع المذنبین اور رحمتہ للعالمین ہونے کی حیثیت پر زور ہوتا ہے وعلی ھذا القیاس..... یہ سب کچھ مولانا ظفر علی خان کی نعتوں میں بھی موجود ہے.....مثلاً رحمتہ للعالمین کا بیان ہے۔

عرب کے واسطے رحمت عجم کے واسطے رحمت
وہ آیا لیکن آیا رحمۃٌ للعالمیں ہو کر

شفیع المذنبین:

خدا کیونکر نہ کھینچے معصیت پر مغفرت کا خط
مسلماں مذنبیں ہیں اور شفیع المذنبیں تم ہو

وجہ ظہور کائنات ہونا (لولاک لما خلقت الافلاک)

گر ارض وسما کی محفل میں لولاک لما کا شور نہ ہو
یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں یہ نور نہ ہو سیاروں میں

انا من نور اللّٰہ والخلق کلھم من نوری:

تیری جبین سے آشکار، پرتوِ ذات کا فروغ
اور ترے کوچہ کا غبار، سرمۂ چشمِ کائنات

وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحیٰ

Marfat.com

نہ نکلی کوئی بات اس کی زباں سے تادمِ آخر
نہ نکلی ہوجو زیبِ نطقِ جبریلِ امیں ہوکر

الیوم اکملت لکم دینکم ....اور یہ کہ.....ماکان محمد اباأحد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین:

ہوئی تکمیلِ دیں تم سے کہ ختم المرسلیں تم ہو
رسالت ہے اگرانگشتری اس کے نگیں تم ہو

....

مصطفیٰؐ کو جب ملا پیغام اکملت لکم
گل ہمیشہ کے لیے شمع نبوت ہوگئی

معراج کاذکر:

جو ماسوا کی حد سے بھی آگے گزر گیا
اے رہ نوردِ جادۂ اسریٰ تمہی تو ہو

معجزات کابیان:

دیکھ کر تجھ کو گرے لات وہبل سر کے بل
آتے ہی تیرے فرو ہوگئی تھی نارِ جحیم
کونسی ایسی ہوئی اس میں تعجب کی یہ بات
اک اشارے سے ہوا گر مہِ کامل دو نیم

تعلیمِ مساوات:

از سرِ نو کیا گیا، دودۂ آدم ارجمند
اٹھ گئی قیدِ رنگ وخوں مٹ گیا فرق نسل وذات

لیکن جیسا کہ قبل ازیں کہا گیا ہے مولانا ظفر علی خان نے جس ذہنی پس منظر کے ساتھ یہ ''نعتیں'' کہیں وہ امت مسلمہ کے زوال وانحطاط کی تصاویر کا عکس تھا۔لہٰذا کئی مقامات پر مسلمانوں کی بہتری کے لیے حضور پرُ نور کی خدمت اقدس میں التجا کرتے ہیں۔اس دعا میں قید غلامی سے نجات کی تمنا شامل ہے۔یہ قوم میں احساسِ زیاں کی بیداری کے لیے گزارش ہے اور یہ خواہش

Marfat.com

ہے کہ کاش مسلمان پھر اپنی عظمت رفتہ کو حاصل کر سکنے کے قابل ہو جائیں۔ مثلاً

مغرب کی دستبرد سے مشرق ہوا تباہ
ایماں کا خانہ کفر کے ہاتھوں ہوا خراب
پھر بھی ہے ان کو لاج ترے نام پاک کی
پروانہ وار جس پہ تصدق ہیں شیخ و شاب
اے قبلۂ دوعالم و اے کعبۂ دو کون
تیری دعا ہے حضرت باری میں مستجاب
یثرب کے سبز پردے سے باہر نکال کر
دونوں دعا کے ہاتھ بصد کرب و اضطراب
حق سے یہ عرض کر کہ ترے ناسزا غلام
عقبیٰ میں سرخرو ہوں تو دنیا میں کامیاب

اسی طرح ایک اور نعت میں یہ مضمون دہرایا گیا ہے:

جاگ او یثرب کی میٹھی نیند کے ماتے کہ آج
لٹ رہا ہے آنکھوں آنکھوں میں تری امت کا راج
تیرے بچے ہو رہے ہیں ساری دنیا میں ذلیل
کیا نہیں اے قبلۂ عالم تجھے بچوں کی لاج
ہم ہیں ننگے سر اٹھ اے شان عرب آن عجم
اور پہنا دے ہمیں پھر سطوتِ کبریٰ کا تاج

یہ اور اسی نوع کے دیگر کئی اشعار ایک پر درد درخواست اور دلگداز التجا کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے ایک نہایت نرم سا شکوہ بھی ٹپکتا ہے۔ جیسا کہ .....

''کس کو ترے سوا سنائیں جا کے ہم اپنی مشکلات''

یا

''کیا نہیں اے قبلۂ عالم تجھے بچوں کی لاج!''

یا

Marfat.com

''ہم سے پھرا ہوا ہے کیوں گوشۂ چشمِ التفات''

وغیرہ الفاظ سے ظاہر ہے مگر انہی نعتوں کے اندر کئی مقام پر جوابِ شکوہ بھی موجود ہے۔ مثلاً یہ کہ جب تک ہم دینِ متین کے اعلیٰ اور زریں اصولوں پر کاربند رہے دنیا بھر میں سربلند تھے۔ اب ہم نے وہ دستورِ حیات چھوڑ دیا لہٰذا عظمت و اقبال نے ہم سے منہ موڑ لیا:

مرکزِ ثقل سے ستوں شرعِ مبیں کا ہٹ گیا
خطرہ میں آکے پڑ گیا دینِ قدیم کا ثبات

اور یہ کہ پہلے ہم اتحاد و اتفاق کی نعمت سے متمتع تھے لہٰذا ہم میں قوت تھی۔ ہم ذات پات کی تمیز سے بالا تھے لہٰذا ہم میں یک جہتی تھی۔ علم و حکمت پر نثار تھے اس لیے باوقار تھے اور اب فرقہ بندی اور ذاتوں کے چکر میں پڑ گئے تو علم و حکمت کے ذوق سے محروم ہیں۔ بلکہ جہلِ مرکب میں گرفتار ہیں۔

ایک طرف ہیں ذات کی زہر بھری عداوتیں
ایک طرف ہیں نسل کے قہر بھرے تعصّبات
حکمت و علم کا مطب دینے لگا مریض کو
بے خبری و جہل کے بوقلموں مرکبات!

اس انداز سے فیشن کے غلط تصور اور غلط استعمال کی طرف اشارہ ہے جس نے مسلمانوں کو ارکان دین کی ادائیگی سے روک لیا ہے اور مسجدیں ہیں کہ ویران پڑی ہیں۔ اگر کوئی علم حاصل کیا ہے تو فقط دنیاداری کا علم دین سے کوئی غرض ہی نہیں۔

پڑے پتلون میں سلوٹ مبادا کوئی جھکتے ہی
نہیں اس ڈر سے ہو سکتے شریکِ راکعیں تم ہو
پڑی ہی مسجدیں ویران اور ہیں مدرسے سونے
قریب از علمِ دنیا ہو تو دور از علمِ دیں تم ہو

یعنی ان نعتوں میں مدح و ستائش اور التجا و گزارش کے ساتھ ساتھ قوم کی کوتاہیوں کا تذکرہ بھی ہے۔ اس اعتبار سے یہ نعتیں فقط مظہرِ عقیدت ہی نہیں بلکہ پیغام بیداری اور ترغیب عمل و اصلاح کے زیور سے بھی مزین ہیں۔

Marfat.com

جہاں تک شوکت الفاظ کا تعلق ہے یہ امر محتاج بیان نہیں کہ مولانا سلطنت الفاظ کے حاکم اعلیٰ، علی الاطلاق ہیں۔ لہٰذا وہ الفاظ کے مزاج شناس ہیں۔ فقرات کے دروبست سے پیدا ہونے والی ساحریت سے آگاہ ہیں۔ آہنگ ونغمہ کی اثر آفرینی سے واقف ہیں اور دلکش تراکیب کے موزوں ترین استعمال پر قادر۔ مثلاً فریاد بحضور سرور کونین کا انداز ملاحظہ ہو۔

اے خاورِ حجاز کے رخشندہ آفتاب
صبحِ ازل ہے تیری تجلی سے فیضیاب
پیدا ہوئی نہ تیری مواخات کی نظیر !
لایا نہ کوئی تیری مساوات کا جواب
خیرالبشر ہے تو تو ہے خیرالامم وہ قوم!!
جس کو ہے تیری ذاتِ گرامی سے انتساب

اسی طرح ایک اور نعت ہے جس کا عنوان ہے صلوا علیہ وآلہ اس کا طرز دیکھیے:

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز چمکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں

بالخصوص نغمگی اور آہنگ کے لحاظ سے نعت معنون بہ ''عرش سے فرش تک حضور سرور کونینؐ پر صلوٰۃ وسلام کی بارش'' بہت حسین ہے۔ ایک دو شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

رونقِ بزم دودۂ آدم صلی اللہ علیہ وسلم
خواجۂ گیہاں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم
جادہ شناس منزل وحدت جلوہ نمائے نور حقیقت
ہادیٔ اکبر مصلح اعظم صلی اللہ علیہ وسلم
خیر تمثل فضل مجسم صلی اللہ علیہ وسلم
آیۂ لطفِ ربک الاکرم صلی اللہ علیہ وسلم

لیکن ان سب باتوں سے قطع نظر جو خلوص، شیفتگی، خودرفتگی، عقیدت، فریفتگی اور عشق کی جھلکیاں ان نعتوں میں نظر آتی ہیں۔ ان کی صحیح قدر و قیمت اہل دل ہی جان سکتے ہیں۔ یہ الفاظ بڑے کرب و اضطراب سے نکلے ہوئے محسوس ہوئے ہیں۔ ان میں بڑی گہرائی ہے اور بڑا

Marfat.com

ٹھہراؤ۔ ہر مصرع ڈوب کر کہا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ تاثیر بہ درجۂ کمال موجود ہے۔ یہی وہ خاصیت تھی جس کی بدولت علامہ اقبال جیسے قادرالکلام بھی ان نعتوں کو سن کر جھوم جھوم جاتے تھے۔ اس سوز وساز جذب وشوق اور خلوص ونیاز کے کچھ نمونے درج ذیل ہیں:

شرق ہے تجھ سے مستفیض غرق ہے تجھ سے فیضیاب
دونوں جہاں کی رحمتیں ہوگئیں ترے ہمرکاب
جو ترے در کی خاک تھے ہو گئے آسماں جناب
لطف ترا ہے بے شمار فیض ترا ہے بے حساب
تیری نگاہ مہرباں ہم کو ذریعہ فلاح
تیری دعائے مستجاب ہم کو وسیلۂ نجات
دور فتادہ ہی سہی تیرے مگر غلام ہیں
ہم سے پھرا ہوا ہے کیوں گوشۂ چشمِ التفات

ان کے علاوہ آپ کا نہایت مشہور نعتیہ شعر اس طرح ہے:

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمہی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمہی تو ہو

اور ارشاد فرماتے ہیں:

سواد یثرب میں گھومتا ہوں نبیؐ کی دہلیز چومتا ہوں
شراب حق پی کے جھومتا ہوں رہے سلامت پلانے والا

ان سب حقائق کے پیش نظر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ترکیب وترتیب، جذب وشوق اور مضمون والفاظ کے بہترین امتزاج کے لحاظ سے یہ ''نعتیں'' بڑی حسین اور دلکش تصویریں ہیں..... یہاں تک کہ میرے خیال میں اگر مولانا نے اور کچھ بھی نہ لکھا ہوتا تو یہ ''نعتیں'' جو اتنی شاندار اور جاندار ہیں انہیں حیات جاوید بخشنے کے لیے کافی تھیں اور یہی ظفر علی خان کے لیے آخرت کا سب سے بڑا توشہ ہیں۔

Marfat.com

حصولِ عبرت کی اہمیت

جب کہا جاتا ہے: ''فاعتبروا یااولی الابصار ''تو ایک شرط عاید کردی جاتی ہے کہ اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو۔ اے وہ جو دیکھ سکتے ہو سبق سیکھو!!'' گویا دیکھنے پر قادر ہونا شرط ہے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ دیکھنے سے مراد خالی آنکھیں کھولے رکھنا ہی نہیں۔ خالی آنکھیں کھولنا الگ معاملہ ہے، دیکھنا جدا مسئلہ ہے اور دیکھ کر کچھ سمجھنے پر قادر ہونے کی حقیقت ہی مختلف ہے۔ عبرت حاصل کرنے کے لیے دل کی آنکھوں کا کھلا ہونا ضروری ہے۔

مجھے حضرت عتابیؒ کا واقعہ بہت پسند ہے۔ آنکھوں والوں کا اندھا پن کانوں والوں کا بہرہ پن اور سمجھداروں کا بے سمجھ پن اس واقعہ کی یاد تازہ کرتا رہتا ہے۔ ہوا یوں کہ حضرت عتابیؒ بغداد کے شاہی دروازے میں کھڑے کچھ کھا رہے تھے۔ یہ امر ثقاہت کے خلاف جانا جاتا تھا۔ کسی فرد شناسا نے عرض کیا: '' آپ سر بازار، ہجومِ عام میں کھڑے کھا رہے ہیں۔ یہ کیا''؟ حضرت عتابی نے جواب دیا: '' مویشیوں کے ریوڑ میں اگر آپ کپڑے تبدیل کرنا چاہیں تو کیا پردے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں''؟ شناسا نے عرض کیا ''نہیں تو!'' حضرت عتابیؒ نے وضاحت کی: ''میرے اردگرد بھی اولاد آدم کا ہجوم نہیں محض دو پائے ہیں''۔ اس پر شناسا نے قدرے حیرت اور ناخوشی کا اظہار کیا۔ بنو آدم کا مویشی قرار دیا جانا اسے پسند نہ آیا۔ حضرت عتابیؒ نے فرمایا: ''دیکھیں میں آپ کو ابھی سمجھائے دیتا ہوں، کہ یہ لوگ آدمی نہیں مویشی ہیں''۔

یہ کہہ کر حضرت عتابیؒ کسی دکان کے تھڑے پر کھڑے ہو گئے اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا: ''لوگو! میری بات سنو، وہ بات جس میں تمہارا بھلا ہے''۔ اب ایک کو رکتے دیکھ کر دوسرا اور دوسرے کو رکتا دیکھ کر تیسرا اور چوتھا رکا، حتیٰ کہ اچھا خاصا مجمع ہو گیا۔ حضرت عتابی گویا ہوئے: ''اے لوگو! مجھے بشارت ملی ہے کہ تم میں سے جس شخص کی زبان کی نوک، ناک کی نوک کو چھو لے وہ جنتی ہے''۔ ان کا اتنا کہنا تھا کہ مجمع کے ہر فرد نے زبان نکالی اور اسے ناک کی نوک کی طرف بڑھانے لگا۔ حضرت عتابیؒ نے اپنے اس شناسا سے کہا: ''دیکھ لیا! میں نہ کہتا تھا کہ یہ سب مویشی ہیں''؟

Marfat.com

ظاہر ہے کہ اس مجمع میں کسی نے یہ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ آخر زبان کا دراز ہونا یا ناک کا جھک کر ہونٹوں سے اتنا قریب ہو جانا کہ نوک اسے چھو لے کون سا کارِ خیر ہے جس کا اجر بخشش و رحمتِ خداوندی ہے؟ مگر حق یہ ہے کہ اولادِ آدم کا عمومی احوال وہی رہا ہے اور تا حال تقریباً یہی حال ہے۔ اللہ نے سوجھ بوجھ اور دانش و فکر کے سارے جوہر دے رکھے ہیں مگر اولادِ آدم کی کثرت کثیرہ بس یونہی منہ اٹھائے ہوتی ہے۔

حضرت مجددؒ لکھتے ہیں کہ ''روح کا تعلق عالم امر سے ہے اور بدن کا عالم خلق سے، گویا آدمی امر و خلق کا مجسمہ ہے مگر بے ترتیب فرد آدم پر عالم خلق یعنی بدن حکومت کرتا ہے اور بدن مادی وجود ہے جسے مادے ہی کی طرف کھنچنا ہے لہٰذا وہ بالعموم مادے ہی کی جانب جھکا رہتا ہے''۔ مطلب واضح ہے کہ انسان کی لطیف روحانی صلاحیتیں محنت کے ساتھ پروان چڑھتی ہیں، اس ضمن میں مسلسل آگاہی کی ضرورت ہے۔ محنت کون کرے، آگاہی کے دوام کا بار کون اٹھائے؟

محض مادی سطح پر زندگی بسر کرنے والا فرد یا بشر گویا آدم خاکی ہے وہ آدم دکھائی دیتا ہے، آدم بنا نہیں ہوتا کیونکہ وہ حیوانوں کی طرح بے قید جبلتوں کا اسیر رہتا ہے۔ کوئی جتنا جبلتوں کے وحشی کو سدھار لے اتنا انسانیت کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ ورنہ وہ منہ زور ہوس، بے روک خود غرضی اور بے توازن لذت پسندی کے وحشت زار میں کھاتا، چرتا، پھنکارتا، لڑتا، مارتا، مرتا رحلت ہی کیوں کر جاتا ہے۔ ایسے انسانی دوپائے اگر کسی معاشرے میں کثرت کثیرہ حاصل کر لیں تو وہ معاشرہ انسانی معاشرہ کہلانے کے بجائے ''وحشتستان'' ہو کر رہ جاتا ہے۔ قرآن کریم نے بھی تو یہی فیصلہ دیا ہے۔ سورہ اعراف کی آیہ کریمہ (۱۸۹) میں ایسے غافل، بے ہوش اور ناآگاہ افراد سے متعلق ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ''ان کے دل ہیں مگر یہ ان سے سوچتے سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں مگر یہ ان سے دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں مگر یہ ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ چوپاؤں کی مثال ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے، ان سے بھی زیادہ بے راہ۔ یہی تو ہیں غافل لوگ''۔

جہاں حیوان کو اس کی خاص نوعی جبلت ملی ہوتی ہے وہاں آدم کو ہر جبلت میسر ہے۔ یہ ساری جبلتوں کے خلاصے کا مالک ہے، جن کے صحیح توازن و توافق کے باعث اسے وہ قوت و حیثیت ارزانی ہوئی ہے جو اسے تسخیر کائنات پر قادر کر دیتی ہے۔ اس کے اندر ہر جوہر ہے۔ اسی لیے تو ہر فرد آدم اپنی ذات میں ایک دنیائے صغیر ہے لیکن اگر وہ جبلتیں وحشی ہی رہیں اور انسانی

Marfat.com

اقدار کی روشنی میں تربیت یافتہ نہ ہوں یعنی پابندی اخلاق نہ کریں تو پھر فرداً فرداً بھی اور مجتمعاً بھی بے باک ہوس کا جلوہ دکھانے لگتی ہیں۔

-آپ نے دیکھا ہوگا کہ حیوانی سطح پر چلنے والے افراد آدم میں سے بعض کے اندر ڈھور ڈنگر کے اوصاف زیادہ نمایاں ہوتے ہیں اور وہ پہچان لیے جاتے ہیں چنانچہ کہا جائے گا: ''چھوڑو جی وہ کوئی آدمی ہے وہ تو ڈنگر ہے'' اور آپ نے بھی مشاہدہ فرمایا ہوگا کہ جسے آپ ڈھور ڈنگر کہہ رہے ہیں اسے بالعموم متین مزاج لوگ اسی روپ میں پاتے ہیں کیونکہ ڈنگر پن ہی اس فرد کا حاوی وصف ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ دیکھتے ہیں کہ اہلِ نظر کسی کو سانپ گردانتے ہیں، کسی کو شُتر، کسی کو گیدڑ، کسی کو لومڑی، کسی کو شیر، کسی کو بھیڑیا، کسی کو بھیڑ، وعلیٰ ہذا القیاس..... مگر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جسے کینہ پروری کے باعث شتر کے طور پر شناخت کر لیا جائے، اسے لومڑی یا گیدڑ یا شیر کوئی نہیں کہتا۔ یہ واقعی عجیب معاملہ ہے۔ جسے جاننے والے بھیڑیا کہتے ہیں وہ کسی باہمی صلاح مشورے سے ایسا نہیں کرتے، وہ شخص اسی انداز میں متشخص ہو جاتا ہے یعنی اس کی تشخیص یہی ہے۔ جس شخص کے جاننے والے اسے سانپ کہتے ہیں اسے گدھا کوئی بھی قرار نہیں دیتا۔ آخر کیوں؟ سیدھی سی بات ہے کہ اس کا غالب اور حاوی وصف حیوانی اسے اس اصلی حیوان سے مشابہ کر دیتا ہے۔ دوسری حیوانی صفات دبی رہتی ہیں اور وہ کبھی کبھی موقع پا کر سر نکالتی رہتی ہیں۔ پھر یہ کہ یہ شناخت اور تشخیص دشوار نہیں ہوتی۔ وہ بزرگ جن کی طرف مولانا رومؒ نے اشارہ کیا ہے احساس کے کسی کرب سے گزرے ہوں گے جنہوں نے دن کے وقت چراغ پکڑ کر آدمیوں کی بستی کے باہر کسی فردِ آدم کی تلاش کے دوران میں فریاد کی تھی:

از دیو و دَد ملولم و انسانم آرزوست

بظاہر انسانوں کی بستی میں رہنا مگر بھوتوں اور وحشیوں کے سوا کچھ دیکھ نہ سکنا نظر کا مالک ہونے کی کڑی سزا کے سوا کیا ہے۔

اب آپ یہ دیکھیں کہ ہر حیوان اپنی نوعی جبلتوں کا مالک اور نمائندہ ہے۔ اس کی نوعی جبلت ہی اس کا تشخص ہے۔ وہ کسی دوسری جبلت کا عموماً اظہار نہیں کر سکتا۔ عموماً۔۔ مثلاً گدھا محض گدھا ہے۔ مشرق میں ہو مغرب میں ہو وہ گیدڑ یا بھیڑ نہیں ہو سکتا۔ اسی اعتبار سے قابل اعتماد ہے مگر ابنِ آدم کا کیا علاج کریں۔ بظاہر آدمی ہو، تجربہ اسے گیدڑ ثابت کرے اور کبھی یوں بھی ہو کہ کسی خاص

Marfat.com

موقع پراس کا حاوی وصف دب جائے اوراندر سے کوئی دوسری حیوانی جبلت نکل آئے یعنی جسے آپ شیر سمجھے وہ لومڑ نکلا۔غرض انسانی اقدار سے محروم اور اخلاقی تربیت سے عاری انسان وہ حیوان ہے جسے سب سے زیادہ نا قابلِ اعتماد جانور قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ کوئی فلسفے کی بات نہیں۔ یہ کوئی نفسیات کا پیچیدہ مسئلہ نہیں۔ یہ عام مشاہدے میں آنے والے مناظر ہیں کہ محافظ لٹیرے ثابت ہوں اور رہبر ہی رہزنی فرمانے لگیں۔جن کو صاحبِ ایثار جانیں وہ خود پرور اور جاہ پرست نکلیں۔

پھراس معاشرے کا کیا علاج ہو بلکہ ان معاشروں کا کیا علاج ہو جن میں بظاہر آدمی مگر طبعاً اور عادتاً وحشی آباد ہوں! وہ وحشی نہایت خوبصورت سوٹ بوٹ میں نظر آئیں۔خواہ دیہاتی لباس میں خواہ علماء وفضلاء کی شکل میں۔اگر حاوی اور غالب ہوس ہی ہے تو نظری علم اور ظاہری عبادات عام جبلی رویے کے مقابل دھری رہ جاتی ہیں۔ ملاوٹ ہو، خون ناجائز ہو۔ ناجائز منافع ہو، سمگلنگ ہو، بلیک کی تجارت ہو، ڈاکہ ہو، فسق وفجور کی کوئی قسم ہو۔قوم فروشی ہو، کیا ہم یہ نہیں دیکھتے کہ اپنی ہوس کو پورا کرنے کے لیے پڑھے لکھے، وہ دنیوی اعتبار سے پڑھے لکھے ہوں خواہ دینی اعتبار سے، کیا کیا جلوہ دکھاتے ہیں۔ دوسروں کے حقوق غصب کرنا، دوسروں کو نقصان پہنچانے کے درپے رہنا، اپنی غرض پر دوسروں کے جائز مفاد کو بلکہ قومی، معاشرتی اور ملکی مصلحت کو قربان کردینا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ وحشیوں کے معاشرے میں یہی ہوتا ہے۔حضرت امام محمد بن علی الباقر کا قول ضیاءالدین عبدالقادر بن عبداللہ السہر وردی نے اپنی ''عوارف المعارف'' میں نقل کیا ہے۔موضوع یہ ہے کہ آیا ایسے لوگوں پر کوئی نصیحت اثر کرسکتی ہے؟ وہ قول یہ ہے: ''نفسانی ہوسوں کے باعث دل مرجاتا ہے۔ جب بھی آدمی ہوس کو راندتا ہے زندگی میں سے کچھ حصہ پالیتا ہے۔ پس نصیحت سننا زندوں کا کام ہے، مُردوں کا کام نہیں۔حق تعالیٰ فرماتے ہیں: **انك لاتسمع الموتٰی** (اے رسولؐ! آپ مُردوں کو تو نہیں سنا سکتے)۔

گویا ہوس کی زندگی گزارنے والے لوگ انسان کی حیثیت سے مُردہ ہیں۔نظر مُردہ، کان مُردہ، دانش مُردہ، دل مُردہ، ضمیر مُردہ، ایمان مُردہ۔ وہ چلتے پھرتے ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں۔ روتے ہنستے ہیں۔تن پر ہر انداز کا ملبوس سجاتے ہیں۔اچھے اور برے مسکنوں میں رہتے ہیں۔ پیدل بھی چلتے ہیں اور کاروں اور ہوائی جہازوں کو بھی مرکب بناتے ہیں۔علمی سندات کے بھی مالک

Marfat.com

ہوسکتے ہیں۔مگر کوئی روپ ہو، کوئی حیثیت ہو وہ لوگ وحشی ہیں لہٰذا بے درد ہیں، خونخوار ہیں، منہ زور ہیں۔ان پر کوئی نصیحت اثر نہیں کرتی۔وہ مقاماتِ عبرت سے اندھوں اور بہروں کی طرح گزر جاتے ہیں۔وہ اپنے جیسوں ہی کو چاہتے ہیں، اور کسی ایسے ہی کو مانتے ہیں جو وحشت و درندگی کی بات کرے۔جو خود ان سے بڑھ کر وحشی اور درندہ ہو اور جو انسان کی حیثیت سے نمایاں ترمُردہ ہو۔ بالعکس یہ سب لوگ ہر اس فرد یا جماعت کو دشمن جانتے ہیں جس میں ان کو انسانیت کی بو آئے۔

حضرت غوث الاعظم جیلانی ''الفتح الربانی'' میں فرماتے ہیں: ''تو مُردہ دل ہے چنانچہ تیری صحبت بھی ان کے ساتھ ہے جن کے دل مرے ہوئے ہیں۔تجھے چاہیے کہ ان کا دامن گیر ہو جو زندہ ہیں، جو شریف ہیں اور شرفاء کے خلف ہیں، مگر تو تو قبر ہے اور اپنی جیسی قبر کے پاس آتا ہے۔تو تو مُردہ ہے اور اپنے جیسے مُردے کے پاس آتا ہے۔تو تو لاغر ہے اور تیری قیادت تیرے ہی جیسے لاغر کے ہاتھ میں ہے۔تو تو اندھا ہے اور تیری رہبری، تیرے جیسا اندھا کر رہا ہے۔اہلِ ایمان، اہلِ ایقان اور صالح لوگوں کی مجلس اختیار کر، ان کی بات حوصلے سے سن، اسے قبول کر، اور اس کے مطابق عمل کر، پھر جان لے کہ کامیابی تیرے قدم چومے گی۔

ایسے حیوان حیوانوں ہی کی سنتے ہیں۔انہی میں خوش رہتے ہیں۔انسانیت کے حوالے سے بات کرنے والوں کے وہ قریب نہیں پھٹکتے۔ماسوا اس کے کہ نقصان پہنچانا اور ضرب لگانا مقصود ہو۔حد یہ ہے کہ ہوس کے معاشرے میں کوئی مقامِ عبرت بھی عبرت کا مقام نہیں ہوتا۔اس لیے کہ حیوان عبرت حاصل کرنے کی اہلیت ہی سے محروم ہوتا ہے۔آپ گلے یا ریوڑ میں بیٹھے باری باری ایک ایک کر کے مویشی کو پیٹتے بلکہ ذبح کرتے رہیں، دوسرے مویشی اگر چر رہے ہیں تو چرتے رہیں گے، اگر جگالی کر رہے ہیں تو کرتے رہیں گے، ان کو پروا نہ ہوگی کہ ان کے اردگرد ان کے ابنائے نوع پر کیا گزر رہی ہے۔بالکل ایک مرحلہ انسانی معاشروں میں بھی ایسا آجاتا ہے کہ فطرتِ حیوانی کے غلبے کے باعث آپ پٹائی کریں، لوگوں کو لوگوں کے سامنے ہر طرح کی سزا دیں حتیٰ کہ مجمع عام میں مجرم کو پھانسی دے دیں، دوسروں کے لیے یہ محض ایک واقعہ، ایک منظر، ایک صورت حال یا تماشا ہے۔اگر سچ مچ طبع انسانی باقی ہو تو دیکھنے والے ضرور عبرت حاصل کریں۔اس اعتبار سے خود سزا کے بارے میں تو سوچا جانا چاہیے۔وہ سزا جو انسانوں کے لیے تجویز کی گئی ہو وہ حیوانوں کو دی جائے؟ پہلے وہ انسان بنیں، پھر اس قابل ہوں کہ نیک و بد میں شناخت کر سکیں۔

Marfat.com

پھر اگر وہ جرم کریں تو وہ انسانی سزا کے شایاں ہیں اور پھر وہ سزا دوسروں کے لیے باعث عبرت بھی ہوسکتی ہے۔ حیوانی سطح، پر سزا کچھ نہیں سنوارتی ماسوا اس کے کہ انہیں مضبوط آہنی پنجروں میں ڈال کر ان کی ضرر رسانی سے ایک دوسرے کو بچایا جائے۔ یا نعوذ باللہ جنگ، قحط، بیماری، خانہ جنگی، غلامی، سیلاب یا کوئی اور عذاب آئے اور صفائی بھی کرے اور صفایا بھی۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ بنو آدم کے کرتوتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تباہی، خرابی اور سڑاند خشکی پر بھی اور تری میں بھی جلوے دکھانے لگتی ہے اور اس سے مطلوب یہ ہوتا ہے کہ بنو آدم کو ان کے کیے کا مزہ کسی قدر چکھا دیا جائے۔

تاریخ شاہد ہے قرآن گواہ ہے کہ جب معاشرے انسانوں کی بستیاں نہیں رہتے یعنی اپنی ہوس اور آپا دھاپی کے باعث توازن کھو بیٹھتے ہیں تو قدرت کا اٹل قانون کسی نہ کسی طرز کا سہاگہ پھیر کر ہمواری بحال کر دیتا ہے اور پھر دیکھتا ہے کہ نئے کسان کس دیانت سے کام کرتے ہیں۔ کتنی محنت سے فصل بیجتے ہیں۔ کس شوق سے پاسبانی کرتے ہیں اور کس خلوص سے حاصل کا حق ہر حق دار تک پہنچاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کا مزاج عدل سے عاری ہے، یہاں کا ہر فرد بھی بے درد ہے اور جھوٹا بھی۔ کوئی بھی اپنی حد میں رہنے کو تیار نہیں۔ نہ چھوٹا نہ بڑا۔ آپا دھاپی کا ایک وسیع اور بسیط منظر ہے۔ جس میں ہر فرد بیک وقت ظالم بھی ہے اور مظلوم بھی۔ ظالم بقدرِ ہمت اور مظلوم بقدرِ بے ہمتی۔ قدرت کا قانونِ توازن کب تک مہلت دیے رکھے گا! اے اولی الابصار! کسی جماعتی سزا کے تدارک کے لیے آپ کیا کر رہے ہیں؟ اے اولی الابصار! کیا آپ میں عبرت اندوز ہونے کی اہلیت تا حال موجود ہے یا یہ جوہر سلب ہو چکا ہے۔ بقول حفیظ:

ہے یہاں کوئی مری بات سمجھنے والا؟

Marfat.com

حصّہ دوم

معنیٔ اِسلام ترکِ آفِل است

Marfat.com

Marfat.com

رضائے الٰہی.....انقیاد احکام الٰہی

رضا کا عمومی معنٰی ہے خوشی، خوشنودی، کسی شے یا کسی معاملے کا عین حسبِ منشا عمل میں آنا، کلمۂ مرضی کا رابطہ بھی رضا ہی سے ہے یعنی خواہش اور خوشی۔ اور اسی کے مطابق کسی صورتِ حال اور کیفیت کا خواہاں ہونا یا کسی ایسی صورتِ حال اور کیفیت کا پایا جانا۔ گویا مرضی میں خواہش اور خوشی دونوں مفہوم شامل ہیں۔

اللہ کے وہ بندے کتنے ہی مبارک ہیں جن کے بارے میں قرآن میں کئی بار آیا ہے کہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوا عَنْہُ. اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔

حضرت قشیریؒ لکھتے ہیں کہ عراقیوں اور خراسانیوں کے مابین رضا کے متعلق قدرے اختلاف ہے۔ اہلِ خراسان کہتے ہیں کہ رضا مقام ہے اور اہلِ عراق کہتے ہیں کہ رضا حال ہے۔ حضرت ابوالنجیب ضیاء الدین السہر وردیؒ کہتے ہیں کہ ہر مقام درحقیقت حال ہی کی مستقل اور پائیدار کیفیت ہے۔

حال کیا ہے؟ مختصراً حال ہے کسی تربیتی اور ریاضتی مرحلے میں یقین کی کیفیت کا ایک روپ۔ حال کا تعلق تحوّل سے ہے۔ تغیر اور تبدل کا رونما ہوتے رہنا۔ کیفیت میں کمی اور بیشی کا احساس و شعور۔ مقام کیا ہے؟ مجملاً ایک مطلوبہ تربیتی کیفیت کا جزوِ مزاج ہو کر قائم ہو جانا، برقرار رہنا اور معتین ہو جانا کہ اس میں تزلزل در آنے کا اندیشہ نہ رہے۔

ہر ہر حال یعنی تربیتی مرحلے یا روحانی ریاضت کے سفر و سلوک کا آغاز توبہ سے ہوتا ہے۔ جس کا مطلب ہے احکامِ خداوندی کی مخالفت، معصیت اور گناہ سے روگردانی۔ جب تک توبہ پکی نہ ہو آگے نہیں چلا جا سکتا۔ جب تک توبہ جزو جان ہو کر مقام نہیں بن جاتی اس میں اتار چڑھاؤ کی گنجائش رہے گی۔ ایسے عالم میں سالک مطمئن ہو کر اگلے حال و مقام کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔ بقول ابوالنجیب السہر وردی دل کی بیداری اور اپنی حالت سے بخوبی آگاہی کے بغیر توجہ کا توحیدی رخ ممکن نہیں۔ دل بیدار کے بغیر نہ حکم عدولی سے منہ موڑا جا سکتا ہے اور نہ اطاعت کی جانب لوٹا

Marfat.com

جاسکتا ہے۔اس ضمن میں حضرت ابوالخبیب کی وضاحت یہ ہے کہ احوال ومقام کی حیثیت ایک بلند عمارت کی سی ہے اور توبہ اس عمارت کی بنیاد ہے۔لیکن واضح ہے کہ بنیاد کسی زمین پر استوار ہوتی ہے۔بغیر زمین کے کوئی عمارت تعمیر نہیں کی جاسکتی۔اسی طرح روحانی تزکیے کی تعلیم کا آغاز یعنی حال ومقامِ توبہ جس زمین پر استوار ہوتا ہے اسے دل کی آگاہی اور بیداری کہتے ہیں۔اگر دل سویا ہوا ہو، ضمیر غافل ہو اور دانش مدہوش ہو تو گناہ، بدی اور سرکشی کا شعور کیونکر ممکن ہے۔حضرت علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے

دلِ بیدار فاروقی، دلِ بیدار کرّاری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری
دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری

لبِ لباب یہ کہ غفلت کی کوئی عبادت، کوئی ریاضت اور کوئی توبہ بھی کوئی معنٰی نہیں رکھتی۔احوال اور مقامات کے سلوک میں ایک چیز بڑی ضروری ہے وہ یہ کہ حضرات الصوفیہ کا ایک گروہ اس عقیدے کا مالک ہے کہ حال سے مقام کی جانب ترقی بجا، مگر کوئی بھی مقام اس وقت تک واقعتاً معین اور طے شدہ امر قرار نہیں پاتا جب تک اس مقام سے گزرنے والا سالک، یعنی روحانی تزکیے کا طالب، اگلے مقام کا آغاز نہیں کر لیتا۔یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے۔اگلے مرحلے کا آغاز ہو گا تو پچھلے مرحلے کی حد مقرر ہوگی ورنہ سالک کی ریاضت اسی مقام میں جاری رہے گی اور وہ مقام، حال کی زد میں رہے گا۔یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی طالب علم پندرہویں سے سولہویں میں پہنچتا ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ پندرہ تعلیمی درجے طے کر چکا ہے۔سولہویں میں پہنچنے سے قبل یہ نہیں کہا جاسکتا۔

توبہ کے بعد زہد اور توکل اور پھر دوسرے مقام ہیں حتیٰ کہ صاحبِ عزیمت سالک مقامِ رضا پر پہنچ جاتا ہے۔مقامِ رضا، حضرت امام غزالیؒ کی رائے میں بلند ترین مقامِ سلوک ہے۔مقامِ رضا مشکل ترین مقام بھی ہے۔ظاہر ہے کہ ایسے مقام پر حال بڑا طویل ہو گا۔مقالے کے آغاز میں قرآن کریم کے یہ کلمات عرض ہوئے تھے: ''رضی اللّٰہ عنھم ورضوا عنہ''۔اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ان کلمات کی روشنی میں بعض بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ یہ راضی ہونا یکطرفہ نہیں۔جب اللہ راضی ہوگا تو بندہ خود بخود راضی ہوگا۔اللہ کے

Marfat.com

راضی ہونے کا مطلب ہے اللہ کی نعمتوں سے سرمایہ دار ہونا۔ اس میں روحانی مسرت اور جنت شامل ہیں۔ روحانی مسرت کے باعث جنت بھی دنیا ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ ایک بزرگ نے فرمایا: اللہ مجھ سے راضی ہے۔ پوچھا گیا: آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ بولے: اس لیے کہ میں اللہ سے راضی ہوں۔ اور میرا اللہ سے راضی ہونا اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک اللہ مجھ سے راضی نہ ہوتا اس لیے کہ رضی اللّٰہ عنھم ورضوا عنہ کا معنٰی یہی ہے۔ ایک کی رضا دوسرے کی رضا کے لیے شرط بھی ہے اور اس پر دال بھی۔ گویا یہ لزوم ہے، لازم ہونے کی کیفیت ہے۔

آخر رضا کا مفہوم کیا ہے؟ حضرت قشیریؒ کہتے ہیں کہ میں نے استاذ ابوعبداللہ دقّاق کو یہ فرماتے سنا کہ ''رضا، یہ نہیں کہ تم اللہ کے حکم اور اس کی تقدیر پر اعتراض نہ کرو۔ یاد رکھو بندے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس قضا پر راضی رہے جس پر راضی رہنے کا حکم دیا گیا ہے''۔ وضاحت یہ ہے کہ مومن خدائی احکام کی اطاعت کا مکلّف ہے اور خدا کے فیصلوں کے حضور بخوشی سرِ تسلیم خم کرنا اس کا فرض ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان ہر اس شے کو جو خدا کے احکام کے برعکس اور مخالف ہو اپنی تقدیر جان کر قبول نہ کرے۔ وہ تقدیر نہیں۔ وہ قضا نہیں۔ مثال کے طور پر معصیت میں پڑنا، دوسروں کے لیے اذیت کا باعث بننا، فلاکت اور مہنگائی کو قبول کر لینا، باحال خراب جینا اور کہنا یہ کہ میرے حق میں اللہ کی قضا یہی ہے۔ قضا کا معنٰی ہے فیصلہ۔

انسان کی تقدیر جمادات، نباتات اور حیوانات سے مختلف ہے۔ انسانوں کی تقدیر احکامِ الٰہی کے حضور میں سرِ تسلیم خم کرنا ہے اور ان احکام کی روشنی میں۔۔ حتی المقدور۔۔ جینا اور مرنا ہے..... بلکہ انسان، انسان بنتا ہی اس وقت شروع کرتا ہے جب احکامِ الٰہی کی اطاعت میں جینے کی کوشش کا آغاز کرتا ہے۔ اسے ہر وہ شے ترک کرنا ہوتی ہے جس کے ترک کرنے کا خدا نے حکم دیا ہو اور ہر وہ شے یا امر قبول کرنا ہوتا ہے جس کے قبول کرنے کا حکم دیا گیا ہو۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

کسی مصیبت، کسی بیکاری، کسی بدحالی، کسی بدکاری، کسی نشے یا کسی اور کمزوری کو اس لیے قبول کر لینا کہ یہ تقدیرِ الٰہی ہے اور قضائے خداوندی ہے لہٰذا اعتراض کرنا یا اس صورتِ حال کو بدلنے کی کوشش نہ کرنا رضا ہے..... رضا یہ نہیں ہے۔ یہ تو صبر بھی نہیں ہے۔

Marfat.com

خدا کا حکم ہے بقدر ہمت وعزیمت کوشش کرتے رہنا، مجاہدہ اور جہاد جاری رکھنا اور اس ضمن میں ساری مشقت کو استقلال وخوشی سے برداشت کرنا۔

عیاں ہے کہ جو شخص اوامر یعنی احکام کے مطابق عمل پیرا ہے اور نواہی یعنی منع کردہ امور سے مجتنب اور دور رہ کر زندگی بسر کیے جارہا ہے اس کی روحانی تربیت جاری رہتی ہے اور اس انداز میں جاری رہتی ہے کہ ممکن ہے اسے مقام رضا تک پہنچا دیا جائے۔ لیکن خدا کے احکام کی تعمیل اور خدا کے نواہی کے باوصف اگر کوئی صورت ابتلا نمودار ہو، کوئی مصیبت آن پڑے اور پھر ہر کوشش کے باوجود اس کا تدارک نہ ہو سکے تو پھر مومن اس کو فیصلۂ الٰہی جانتا ہے اور اسے قبول کر لیتا ہے۔ تاہم خدا کی قضا کی شناخت کم ہمت لوگ نہیں کر سکتے۔ یہ شناخت انہی کے بس میں ہے جو جانتے ہیں کہ خدا کی قضا کے سوا ان کے عزم وارادہ کو کوئی ناکام کر ہی نہیں سکتا۔ باہمت اہلِ ایمان، احکامِ الٰہی کے اطاعت گزار اہلِ ایمان جب کسی حالتِ ضرر کو نمودار ہوتے دیکھیں اور اسے روکنے یا اس کے مقابلے پر قادر نہ ہو سکیں تو پھر اس کیفیت کو بلا چون وچرا اور بخوشی منظور کر لیتے ہیں..... یہ بھی رضا کا ایک روپ ہے۔

وطن سے بے وطن ہونا پڑتا ہے، سیلاب آتے ہیں، وبا رونما ہوتی ہے، زلزلے جھنجھوڑ دیتے ہیں، قحط پڑ جاتا ہے، جنگ پھوٹ پڑتی ہے، عزیزوں، بزرگوں، احباب کی موت کا زخم لگتا ہے، امیدوں کے باغ دیکھتے ہی دیکھتے اجڑ جاتے ہیں، غرض ایسی سینکڑوں صورتیں ہیں جو انسان کے بس کی نہیں۔ لہٰذا ایسے جملہ واقعات کے روبرو صاحبِ ایمان شخص استقلالِ ایمان ویقین کا ثبوت دیتا ہے اور کہتا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ''ہم اللہ ہی کے ہیں اور بے شک اللہ ہی کی جانب لوٹ کر جانے والے ہیں''۔

حضرت رُدیمؒ فرماتے ہیں اللہ کے حکموں کو خوشی سے مان لینا رضا ہے۔ فانی کی محبت یعنی دنیا، دل میں بس جائے تو مقام رضا دور ہو جاتا ہے۔ دنیا کے دل میں بس جانے کا معنٰی ہے کہ لالچ اور ہوس میں مبتلا ہونا۔ اس کی سزا یہ ہے کہ ایسے بخیالِ خویش مالک شخص کو خدا ان چیزوں کا غلام اور مملوک بنا دیتا ہے جو اسی نے اس کو عطا کی ہوتی ہیں۔ صاحبِ ایمان آدمی پوری زندگی کو اور اس پر ہر شے کو جو میسر ہوتی ہے اللہ کی امانت جانتا ہے اور اللہ ہی کے احکام کے مطابق ہر شے کو کام میں لاتا ہے۔ اس کے پاس دولت کے انبار ہوں تو جب بھی وہ اللہ کا فقیر اور درویش رہتا ہے۔ اس کے

Marfat.com

پاس کچھ نہ ہوتو جب بھی وہ اللہ کا فقیر اور درویش رہتا ہے۔ وہ حصولِ نعمت پر مغرور نہیں ہوتا، وہ وداعِ نعمت پر مغموم نہیں ہوتا۔ رضا کی یہ کیفیت اللہ کی بے بہا نعمت ہے۔ لیکن یہ مقام جو انسان کی روحانی تربیت کا مشکل ترین مرحلہ ہے بڑی ہی مشکل سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت روحانی بلندی اور بالیدگی کے اس مقام پر پہنچ جانا ہے جہاں بندے کو کائنات کا سارا عمل اپنی مرضی سے ہم آہنگ دکھائی دے۔ جو جو کچھ ظہور پذیر ہو وہ اس طرح نظر آئے گویا اس کی اپنی ہی مرضی سے ظہور پذیر ہوا۔ یہ وہ کیفیت ہے جسے مولانا روم نے اس شعر میں بیان کیا ہے:

گفتہ او گفتہ اللّٰہ بود!
گرچہ از حلقوم عبداللّٰہ بود

گو بظاہر اللہ کے بندے کی زبان سے بیان ہوتی ہے مگر بندے کی مرضی اور خوشی اللہ کی مرضی اور خوشی بن جاتی ہے۔ ایک مقام پر علامہ اقبال کہتے ہیں:

چوں فنا اندر رضائے حق شود
بندۂ مومن قضائے حق شود

جب بندۂ مومن خدا کی رضا میں پوری طرح جذب ہو جاتا ہے تو پھر وہ قضائے الٰہی بن جاتا ہے۔ بندے میں یہ اہلیت ہے اس لیے کہ خدا نے خود اپنی روح کا پرتو یا ذرہ اسے عطا کر رکھا ہے۔ اور وہ قدسی ذرّۂ نور بندے کی جان ہے لہٰذا بندہ جوں جوں احکامِ الٰہی کی پابندی میں استقامت پذیر ہوتا چلا جاتا ہے توں توں وہ اللہ کی طرف لوٹتا اور اس کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اللہ کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ پھر ظاہر ہے اللہ کے رنگ سے خوب تر اور خوش تر رنگ اور ہے بھی کس کا؟ صبغة اللّٰه و من احسن من اللّٰه صبغة.

مگر اللہ کا رنگ اختیار کرنے والا بندہ بھی رہتا تو بندہ ہی ہے، خواہ وہ کسی بھی مقامِ اعلیٰ پر پہنچ جائے۔ شیخ محی الدین ابن عربی کہتے ہیں:

الرّب ربٌ وان تنزّل والعبد عبدٌ وان ترقیٰ!

معنٰی ہے رب ربّ ہی رہتا ہے خواہ (ازرہ کرم) کتنا ہی اتر آئے اور بندہ بندہ ہی رہتا ہے (خواہ اللہ کے کرم سے) کتنا ہی اونچا چلا جائے۔ خدا انسان کی شہ رگ کے قریب تر ہو کر بھی خدا ہی ہے۔ خالق اور بندے میں جو تفاوت ہے اس میں جوہری اور اساسی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔

Marfat.com

تمام انبیاء علیہم السلام اللہ کے عبد تھے، بندے تھے، حتیٰ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یٰسین، طٰہٰ، النبی، الرسول اور رحمتہ للعالمین ہونے کے باوصف عبد تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ بقول حضرت علامہ اقبال ''عبد دیگر، عبدہٗ چیزے دگر''۔ بہرحال کوئی بھی بندہ خواہ کسی بھی روحانی مقامِ عالی پر فائز ہو، احکامِ خداوندی کی بجا آوری کے ضمن میں اس کو کوئی رعایت حاصل نہیں۔ کسی بھی مقام پر پہنچ جائے، کوئی بھی بندہ شریعت کی پابندی سے آزاد نہیں ہو جاتا۔ وہ اہلِ اسلام جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلتے رہے ہیں، جن میں اصحابؓ اور ان کے تابعین اور پھر ان کے تابعین اور ازاں بعد لاکھوں علماء و صلحا، متقین و مجاہدین امت شامل ہیں، خدا نے ان کے بارے میں یہ خوشخبری دی ہے کہ خدا ان سے راضی ہو گیا اور وہ خدا سے راضی ہو گئے۔ خدا نے کبھی تو ان اہلِ رضا کے باب میں یہ فرمایا کہ انہیں فوز عظیم یعنی بہت ہی بڑی کامرانی اور کامیابی میسر آ گئی، کبھی یہ فرمایا کہ یہ لوگ حزب اللہ ہیں، اللہ کا گروہ ہیں مگر کسی کو بھی شریعت کی پابندی سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا گیا۔

درحقیقت بنو آدم میں سے جس بھی فرد کو مقامِ بلند میسر آیا وہ درحقیقت اس کی بندگی ہی کا مقامِ بلند تھا۔ لہٰذا اگر وہ تارک اطاعت ہو جائے یا پابندیٔ شریعت سے غافل یا منحرف ہو جائے تو وہ مقامِ رضا ہی سے نہیں مقامِ بندگی سے بھی محروم ہو سکتا ہے۔

حضرت بایزید بسطامی کا مشہور قول ہے کہ کوئی شخص خواہ کیسا ہی زاہد اور عبادت گزار ہو، خواہ کیسی ہی حیران کن کرامات اس سے ظاہر ہو رہی ہوں حتیٰ کہ خواہ وہ اڑنے پر قادر ہو مگر وہ لائقِ اعتنا نہیں۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ احکامِ خداوندی کے اتباع میں وہ کیسا ہے؟ شریعت کی پاسداری میں اس کا عالم کیا ہے؟ اسی طرح کوئی آدمی خواہ مقامِ رضا ہی پر فائز کیوں نہ ہو اور ہر قضائے الٰہی کو عین اپنی رضا سے ہم آہنگ ہی کیوں نہ جانتا ہو، وہ التجا و دعا سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ مستغنی صرف اللہ کی ذات ہے۔ ''یَاایُّھَا النَّاسُ اَنتُمُ الْفُقَرَاءُ اِلَی اللّٰہِ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ''۔ ''اے لوگو! تم سب اللہ کے حضور میں محتاج ہو۔ فقط اللہ ہی کی ذات غنی بھی ہے اور ہر صفت رحمت سے موصوف اور محمود بھی، لہٰذا مقامِ رضا میں استقامت کے لیے جہاں احکامِ الٰہی کی پابندی بدستور لازم ہے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ بندہ خدا کے حضور میں دعا گو بھی رہے۔

ہے اوجِ یقیں بے شک راضی برضا ہونا!
بندے ہیں مگر یارب ہم عرض دعا والے!

Marfat.com

اطاعتِ خداوندی.....انفرادی جوابدہی

علامہ اقبال نے فرمایا ہے:

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات

کائنات میں ہر شے حکمِ خداوندی کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ ہر ایک کے عمل کا اسلوب مقرر ہے۔ اور ہر ایک اپنے طور وطرز کے مطابق مصروفِ کار ہے اور ہر شے کا یہ عمل اور ہر شے کی یہ مصروفیت چونکہ عین امرِ الٰہی کے اتباع میں ہے اس لیے ہر ایک کا عمل اس کی عبادت بھی ہے گویا ذرے کے حقیر ترین جزو سے لے کر بڑے سے بڑے آفتاب تک جو وجود بھی ہے، مصروفِ ذکرِ خدا ہے اور سرگرمِ عبادتِ الٰہی ہے۔ اس حقیقت کی طرف قرآن حکیم ہماری توجہ دلاتا ہے کہ **وان من شیء الا یسبح بحمدہ ولا کن لا تفقھون تسبیحھم.** کوئی شے ایسی نہیں جو حمد کے ساتھ خدا کی تسبیح میں مصروف نہ ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ تم ان کی تسبیح کو پہچانتے اور سمجھتے نہیں۔

ہم اینٹ، پتھر، خشک لکڑی وغیرہ کو بے جان شے جانتے ہیں۔ قرآن کی رُو سے ایک ذرہ بھی بے جان نہیں ہے۔ ہر ذرے میں حرکت مضمر ہے اور آج تو سائنس وہاں پہنچ ہے جہاں ذرے کو ایک جیتا جاگتا وجود تسلیم کیے بغیر چارۂ کار ہی باقی نہیں رہتا۔ ہر شے تحلیل ہوتے ہوتے آخر حرکت یا برقیہ رہ جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں بجا فرمایا تھا کہ کائنات کا اَت اور سَت روح ہے۔ اور ظاہر ہے کہ روح سے مراد جماد نہیں۔ مادی ٹھوس مواد نہیں۔ سکون اور عدم حرکت نہیں بلکہ روح سے مراد ولولہ، تپش، بے سکونی اور اضطراب ہے۔ ہماری دنیا بظاہر بے جان ذرے سے شروع ہوتی ہے۔ ذرات ہی کا ٹھوس اجتماع زمین بھی ہے اور پہاڑ بھی۔ ذرات کے اسی ٹھوس اجتماع سے نباتات یعنی ہر قسم کی گھاس، بیلیں، جھاڑیاں اور درخت پھوٹتے ہیں۔ نباتات ہی کا سرا حیوانات سے بندھا ہے۔ نباتات وحیوانات سے آگے آدمی کی منزل ہے۔

نباتی کائنات متحرک تو ہے مگر حس اور شعور سے عاری ہے۔ حیوانی دنیا حس اور شعور کی

Marfat.com

مالک ہے مگر اپنے باحس اور باشعور ہونے کی آگاہی سے محروم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حیوانی دنیا خود آگاہ نہیں، حیوان اپنا تجزیہ نہیں کر سکتے، بااختیار نہیں، اپنی حدود کو عبور نہیں کر سکتے۔ ہر نوع اپنی نوع میں مقیّد ہے اور فطرت کی مقرر کی ہوئی جبلّت کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے۔ کوئی نوع حیوان اپنی خصلت بدل کر دوسری نوع کی خصلت اختیار کرنے پر قادر نہیں۔ گیدڑ گیدڑ ہی ہے۔ وہ لومڑ کی خصلت نہیں اپنا سکتا۔ گدھا گدھا ہی ہے، اونٹ اونٹ ہی ہے، چیل چیل ہی ہے، اور چوہا چوہا ہی ہے...... وعلیٰ ہذا القیاس۔ غرض جو حیوان جہاں ہے اپنی نوع کے اعتبار سے قابل اعتماد ہے۔ وہ اپنی نوعی جبلت کے تابع ہے اور اسے یہ بھی شعور نہیں کہ وہ کس قانونِ فطرت کے زیرِ فرمان جی رہا ہے۔ حیوان کی زندگی کو اس کی جبلّت راہ بھی دکھاتی ہے، حوصلہ بھی دیتی ہے۔ پناہ بھی عطا کرتی ہے۔ ڈراتی بھی ہے۔ کھلاتی پلاتی بھی ہے۔ ان سے افزائش نسل بھی کراتی ہے۔

بظاہر آدمی بھی ایک حیوان ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہ دو پاؤں پر چلنے والا جانور ہے۔ خدائے تعالیٰ کا ارشاد ہے: واللہ خلق کل دابۃٍ من مآءٍ فمنھم من یمشی علی بطنہ ومنھم من یمشی علی رجلین ومنھم من یمشی علی اربعٍ یخلق اللہ ما یشاء ان اللہ علیٰ کلّ شیءٍ قدیر۔ (24/45) ”اللہ نے تمام جاندار پانی سے پیدا کیے۔ ان میں وہ بھی ہیں جو رینگتے ہیں، وہ بھی ہیں جو دو پاؤں پر چلتے ہیں اور وہ بھی ہیں جو چار پاؤں پر چلتے ہیں۔ اللہ جو چاہتا ہے خلق کرتا ہے۔ اللہ ہر شے پر بے حد قدرت رکھتا ہے“۔

اس آیۂ کریمہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ نے تخلیق کے اعتبار سے انسان کو بھی حیوانی انواع میں سے ایک نوع قرار دیا ہے یعنی دو پایہ کہا ہے اور ظاہر ہے کہ انسان جب تک محض حیوانی سطح پر رہے وہ محض دو پایہ ہی ہوتا ہے۔ ہاں عام حیوان کا آغاز و انجام حیوانیت ہے اور اس میں تربیت پا کر انسان بننے کی قابلیت فطرتاً موجود نہیں۔ لیکن یہ دو پایہ حیوان ایسا ہے کہ اس کے آغاز و انجام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس کا آغاز تو حیوان ہی کی طرح ہوتا ہے مگر اس کی فطرت میں اللہ نے وہ وہ اہلیتیں اور امکانات ودیعت کیے ہیں کہ اس کی انتہا کی کوئی حد مقرر نہیں۔ آخر حد تو کہیں وہاں جا پہنچتی ہے جہاں کوئی حد نہیں رہتی۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک سے زیادہ مقامات پر ارشاد فرمایا ہے کہ میں نے آدم کے پتلے میں اپنی روح پھونکی و نفخت فیہ من رّوحی. اپنی روح پھونکنے کا ایک معنیٰ یہ بھی ہے کہ

Marfat.com

گویا خدا نے آدم کو خدائی اوصاف کا پرتو عطا کر دیا۔ اب واضح ہے کہ آدم مادہ بھی ہے اور روح بھی، اور مادہ و روح اس کے وجود میں الگ الگ خانوں کے مکیں نہیں۔ تمام وجود میں روح و مادہ اکٹھے ہی مقیم بھی ہیں اور کارفرما بھی۔ یہ امر عیاں ہے کہ روح عالم بالا سے رابطہ رکھتی ہے اور مادہ عالم سفلی سے۔ جسم میں جمادی اثر بھی ہے، نباتی اثر بھی اور حیوانی اثر بھی۔ اگر کسی شخص کے وجود میں بدن روح پر حاوی ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ شخص اپنے ارادہ و اختیار کی زندگی بسر نہیں کر رہا۔ وہ فطرت کے ان قوانین کے مطابق جی رہا ہے جن کے مطابق اینٹ، پتھر، بیلیں، پودے اور حیوانات زندگی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ایسا ہر شخص گویا ابھی انسان بنا ہی نہیں اور اگر کبھی بنا تھا تو واپس نیچے کی سطحوں کی جانب لوٹ گیا ہے۔

انسان کے وجود میں خدائی روح کا ہونا گویا اعلان ہے اس بات کا کہ انسان کے اندر یہ اہلیت موجود ہے کہ وہ بعدِ خدا ساری خدائی سے برتر مخلوق ثابت ہو سکے۔ ہوائیں اسے عاجز نہ کریں بلکہ وہ ہواؤں کو عاجز کر کے رکھ دے۔ ہواؤں کے کندھے پر سوار ہو کر اپنی برتری، فضیلت اور قوت کا ثبوت دے۔ وہ سمندروں کا سینہ چیرے، وہ دھاتوں کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالے، وہ سورج کی شعاعوں کو سدھائے، گرفتار کرے اور اپنی خدمت میں لگا دے۔ وہ خواص اشیا سے آگاہ ہونے کے باعث اشیاء کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرے۔ واضح ہے کہ وہ فطرت کے غیر متبدّل بنیادی عناصر کی غیر متغیر خاصیت سے واقف ہونے کے باعث اختراعات عمل میں لاتا ہے۔ پتھر کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا، پتھر میں سے آگ نکالنے کے وسائل پیدا کرنا، دھاتوں سے ہتھیار ڈھالنا، ہتھیاروں سے دیگر اشیا کو حسب ضرورت تشکیل دینا اور بنانا، یہ قدرت اور یہ شوق آدمی کی فطرت میں ہے۔ فطرت کے آئین سے آگاہی اور خواص اشیا کا علم آدم کے ذوق اور ولولۂ اختراع کے اضافے کا سبب ہے۔ اگر لکڑی اور پانی کے مابین پائیدار فطری اور خاصیتی تعاون نہ ہوتا تو آدمی نہ درخت کا تنا نہ بار بار گرا کر اس پر بیٹھ کر پانی عبور کرنے کی کوشش کرتا اور نہ کشتیاں بناتا۔ اگر لکڑی کا جب جی چاہتا وہ ڈوب جاتی اور اگر پانی کا جب جی چاہتا لکڑی کو ترائے رکھنے کی اہلیت سے اپنے آپ کو فارغ کر لیتا تو کوئی بار بار کشتی نہ بناتا۔ کشتی کا بار بار بننا ثبوت ہے اس امر کا کہ پانی کی بھی فطرت غیر متبدّل ہے اور لکڑی کی بھی۔ دونوں قابل اعتماد ہیں۔ یہی عالم دنیا کی ہر شے کا ہے۔ ہر شے کے بنیادی خواص مقرر ہیں۔ اور وہ اپنی معمول

Marfat.com

کی حالت میں لائقِ اعتماد ہیں۔ اسی اعتماد کی بنیاد پر تمام طبی نسخے تشکیل پاتے ہیں۔ انجینئری اور ریاضی کے فارمولے عمل میں آتے ہیں۔ گویا اشیا کو آدمی اپنی ضرورت اور مرضی کے مطابق کام میں لاتا ہے۔ یہ اس کی قوت تسخیر کا ثبوت ہے۔ یہ اس کی نیابتِ الٰہی کی سند ہے۔ آدم کے سوا نہ کسی کے اندر خود آگاہی کا امکان موجود ہے اور نہ کسی میں غیر آگاہی کا۔ یہ جوہرِ آگاہی گویا آدم کی فطرت میں ہے۔ یہ اللہ کا عظیم ترین عطیہ ہے۔ مگر اس عظیم ترین عطیے کو کام میں لانے کے لیے آدم کا بیدار ہونا اور خود آگاہ ہونا لازم ہے۔ ورنہ جو درجہ دیگر مخلوقات کا وہی آدم کا۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کا مرحلۂ آغاز ہی اس کی فضیلت کا ضامن نہیں اس لیے کہ ہوسکتا ہے کوئی آدمی ساری عمر بے سوچھے سمجھے گزار دے۔ گھاس کی سطح پر رہے۔ ہر ہوا کے حضور سر ہلائے اور بس۔ نہ ارادہ، نہ مرضی، نہ اختیار۔ ہر فضیلت اختیار کے ساتھ وابستہ رہے۔ اختیار کا ہتھیار عزم ہے اور واضح امر ہے کہ اپنی مرضی کو کام میں لانا، اختیار استعمال کرنا، عزم کو نافذ کر کے رہنا علامت ہے اس بات کی کہ آدمی کے مادی وجود پر اس کے روحانی حصے کا غلبہ و تسلط ہے۔ ایسے عالم میں وہ دو پایہ نہیں محض ایک جانور نہیں بلکہ جانور کی سطح سے بلند کوئی شے ہے۔

اگر گھوڑے پر سواری مقصود ہے تو اسے لگام دینا ہوگی۔ اسی طرح ہر جبلّی خواہش اور ذوق، ولولہ اور شوق کو پابند حدود رکھنا ہوگا۔ جبلّت حیوان کے لیے واحد قوت ہے۔ وہ آدمی کے لیے بھی ہر حرکت کی اساس ہے۔ مگر حیوان کو اللہ تعالیٰ نے اختیار نہیں دیا اس لیے اس کی جبلت کی حدود خود ہی متعین کر دیں۔ حیوان اپنی جبلّتوں میں محدود ہونے کے باعث اور اختیار و مرضی سے محروم کسی امر میں خالق کے حضور میں جوابدہ نہیں۔ اس کے سارے عمل کی زمام قانونِ قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن آدمی کے ضمن میں معاملہ یکسر مختلف ہے۔ آدمی کا صاحبِ اختیار و ارادہ ہونا ہی اس امر کا تقاضا بھی کرتا ہے کہ فطرت کے ان اصولوں سے آگاہ رہے جو اس کو انسان بننے میں مدد دیں۔ اور ان احوال سے بچے جو اسے بحیثیت انسان زوال سے دوچار کریں۔ دنیا میں انسانی آبادی کی کثرت کثیرہ غیر ذمہ دارانہ زندگی بسر کرنے کی عادی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشرہ سخت قانون نافذ کرتا ہے۔ پولیس اور دیگر قانون نافذ کرنے والے اداروں کو وجود میں لاتا ہے۔ جیلیں بناتا ہے اور پھانسیاں لٹکاتا ہے۔ یہ سزا کا سارا اہتمام ہی ظاہر کرتا ہے کہ آدمی میں ان جملہ امور سے بچنے کی بالعموم اہلیت موجود ہے جو امورِ معاشرے کے خلاف یا انسانیت کے خلاف جرم

Marfat.com

تصور کیے جاتے ہیں۔آدمی کیے کی جزا بھی پاتا ہے اور سزا بھی تو اس لیے جزا و سزا پاتا ہے کہ وہ اچھے کام کرنے اور برے کام نہ کرنے پر قادر ہے۔

یہ اختیار و ارادہ اور یہ خود آگاہی اللہ کا وصف ہے مگر اس جوہر کو اللہ نے اپنی روح کے ساتھ آدم کے پتلے میں ودیعت کر دیا۔دوسرے لفظوں میں یہی اختیار و ارادہ گویا اللہ کی امانت ہے جو اللہ نے آدم اور صرف آدم کے سپرد کی۔قرآن کریم کا ارشاد ہے:انا عرضنا الامانة علی السّمٰوات والارض والجبال فابین ان یحملنها واشفقن منها وحملها الانسان انه کان ظلوماجهولا ۔(33/72)''ہم نے امانت آسمانوں کے پیش کی،زمین کے سامنے رکھی، پہاڑوں کو دکھائی سب نے اس (کو قبول کرنے) سے انکار کیا،منہ موڑ لیا۔سب اس سے ڈرے۔ آدمی نے اس امانت کو اٹھالیا۔یقیناً آدمی نے بڑی زیادتی اور اکھڑ پن نا آگاہی کا ثبوت دیا''۔

اس آیت کا معنی علامتی بھی ہے اور لغوی بھی۔اللہ کی نیابت کی امانت کا بار کون اٹھائے۔بلندیوں اور پستیوں اور ان کے مابین موجود کسی شے کو بھی حوصلہ نہ ہوا کہ بڑھ کر اس بار کو اٹھالے۔بات فقط اتنی سی تھی کہ آیا خدا ہر مخلوق کو براہ راست اپنے ضابطے اور آئین کے تابع رکھے یا انہیں عقل و اختیار اور عزم و ارادہ دے کے آئین اور ضابطے سمجھا دے۔انسان کے بغیر ہر شے عقل و ارادہ و اختیار کو کام میں لائے بغیر خدا کی عطا کردہ جبلّت اور حیثیت کے مطابق کارفرما ہے جیسا کہ مقالے کے آغاز میں عرض ہوا تھا۔مگر آدمی کو نیکی اور بدی کا شعور دے دیا گیا۔اسے آزاد اور بے حد قوی جبلّتیں دے کر ساتھ ہی ان جبلّتوں کو قابو میں رکھنے کے لیے نہایت موزوں اور مناسب اوزار بھی دے دیے گئے۔یعنی آدمی کو اختیار دے دیا گیا تاکہ وہ چاہے تو جبلّتوں کا غلام ہو کر جیے اور چاہے تو جبلّتوں کا حاکم ہو کر زندگی بسر کرے۔جبلّتیں انسان کی اساسی اور جوہری قوت ہیں مگر ظاہر ہے کہ ہر قوت کا پابند حدود ہونا ضروری ہے۔یہ شعوری اور اختیاری پابندی ہی آدمی کی شان ہے اور یہی اللہ کی امانت ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی کا صحیح معنوں میں آدمی بننا اللہ نے آدمی ہی کے سپرد کر دیا۔باقی ہر شے کے وجود کی تکمیل اور ہستی کا اہتمام اللہ نے فطرت کے حوالے کیا مگر آدمی کو فطرت کا غلام بنانے کے بجائے،اختیار اور مرضی کی دولت سے نوازا گویا لاثانی شان کا مالک بنا دیا۔

اللہ نے انسان کو اختیار اور مرضی کی سرشاری بخشی جو کسی دوسرے وجود کو حاصل نہیں۔اس

Marfat.com

اعتبار سے آدمی واقعی اللہ کی بہترین مخلوق ہے۔ مگر ساتھ ہی متنبہ کر دیا کہ ہم نے جو فطرت آدمی کو دی اس کی تربیت کا ذمہ دار بھی آدمی خود ہے۔ اگر تو اس نے بہترین قوام کے ساتھ پیدا کیے جانے والے بہترین وجود کو جو روح اور مادہ کے امتزاج کا حسین مظہر ہے نقصان پہنچایا تو سزا ملے گی۔ ہم نے اسے بہترین اہلیتیں اور امکانات عطا کیے ہیں اگر وہ اہلیتیں اور وہ امکانات اپنی معیاری اور اعلیٰ شان تک نہ پہنچے تو سزا دی جائے گی۔ اس شرط کے ساتھ ارادہ اور اختیار قبول کرنا انسان کے لیے واقعی بڑا مشقت طلب مسئلہ تھا۔

آدم مادّے سے تخلیق ہوا۔ قدرتی بات ہے کہ ایک مدت تک وہ نباتی زندگی گزارنے پر مجبور ہے اور اس کے بعد شعور کے بالغ ہونے تک حیوانی سطح پر رہنے پر مجبور ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان جب تک اور جس قدر مٹی سے قریب رہتا ہے اسے سہولت رہتی ہے۔ گھاس اور بیلیں آرام میں ہیں۔ درخت کا کچھ زور صرف ہوتا ہے۔ جانور کو مزید مشقت کرنا ہوتی ہے۔ اس کو اپنی بقا کے لیے حرکت میں آتے رہنا ہے۔ آدمی کی ہستی اس سے بھی زیادہ محنت و عزیمت کی طالب ہے۔ اسے حیوانی سطح سے اوپر ابھرنے کے لیے بڑا زور لگانا پڑتا ہے۔ اس کے وجود کا مادی جوہر اسے مادی اشیا کی ہوس میں مبتلا کر کے نیچے کو گھسیٹتا ہے اور روح جو نور کا مادہ ہے اسے اوپر کو اٹھاتی ہے۔ اس کشمکش میں وہ کبھی نیچے کو جاتا ہے اور کبھی اوپر کو، بقول غالبؔ:

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر!
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے!

اگر یہ کشمکش جاری رہے تو جب بھی آدمی آدمی ہی کے زمرے میں شمار ہوگا اس لیے کہ یہ کشمکش ثبوت ہے اس بات کا کہ آدمی نے بدن کی وحشت کے حضور میں ہتھیار نہیں ڈالے۔

اس کو حیوان جبھی کہا جائے گا کہ وہ اپنے مادی وجود کے حضور میں گردن ڈال دے اور اس کی روح اس کے بدن کی مغلوب ہو کر رہ جائے: واتلُ علیهم نبا الذی آتیناهُ آیاتنا فَانْسَلَخَ مِنها فَاتبعهُ الشیطان فکان من الغاوِین ولو لرَفَعْنَاهُ بها ولٰکنّه اخلد الیٰ الارض واتّبَعَ هَوَاهُ.

اور اے نبی ﷺ آپ انھیں اس شخص کی خبر سنائیں جسے ہم نے اپنی آیات دیں لیکن وہ ان سے گریزپا ہو گیا۔ پس شیطان نے اس کا تعاقب کیا پھر وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ اگر ہم چاہتے تو

Marfat.com

اسے اس مقام سے اٹھا لیتے مگر وہ زمین سے چپکتا رہ گیا اور اس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی کی۔

واضح ہے کہ بالاستقلال رفتہ رفتہ روح کو تقویت دینا اور اوپر کو اٹھتے چلا جانا کٹھن مرحلہ ہے۔ خدائے آدم بھی جانتا ہے کہ آدم کو کیا محنت درپیش ہے۔ یٰاَیُّهَا الْاِنسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ. (84/6) ''اے انسان تو اپنے رب کی جانب کشاں کشاں چلا جا رہا ہے بالآخر تو اس کے حضور حاضر ہوگا۔'' لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (84/19) ''تو ضرور ایک حالت سے دوسری کو پہنچے گا۔'' یہ ساری محنت اس جوہر اختیار کا نتیجہ ہے۔ نہ اختیار کی امانت قبول کی جاتی اور نہ ذمہ داری آن پڑتی۔ مسئولیت یعنی ذمہ داری بقدر اختیار۔ بیل کو بیل اور درخت کو درخت خود فطرت بنا دیتی ہے۔ بلّی کو کامل بلّی اور اونٹ کو کامل اونٹ خود فطرت تعمیر کرتی ہے۔ یعنی انسان کے سوا ہر موجود کی طبعی تکمیل اس کی اپنی مرضی اور پسند و اختیار کے تابع نہیں ہوتی مگر انسان کو سچ مچ انسان بنانا خود انسان ہی کے ذمے ڈال دیا گیا۔ ہاں ساتھ ہی عقل و دانش، عزم و ارادہ اور پھر وحی کردہ نور ہدایت بھی بخش دیا تا کہ ان وسائل سے کام لے کر آدمی اپنے آپ کو سچ مچ آدمی بنا سکے۔ تعمیری عناصر سب خیر، تخریبی عناصر سب شر۔

یہاں سوال یہ آن پڑتا ہے کہ یہ خیر و شر کیا ہے۔ خیر و شر حقیقت ہے اور ہر حقیقت کا خالق خدا ہے۔ یہاں مختصراً یہ عرض کیا جاتا ہے کہ ہر وہ شے جو آدمی کی روح کو مادّے کی غلامی سے نکال کر اس کو تکمیل کے درجے پر پہنچانے میں مدد دے وہ خیر ہے اور ہر وہ شے جو روح کو مادّے کے سامنے کمزور اور عاجز یا مغلوب کر دے وہ شر ہے۔ اللہ نے بلندی کی طرف سفر کرنے کے امکانی قویٰ سے آدمی کو بخوبی مسلح کیا ہے۔ وہ ان قویٰ سے کام نہ لے تو اس کا اپنا قصور۔ یہی باعث ہے کہ قرآن کہتا ہے: خیر میری طرف سے ہے۔ شر تمہارے طرف سے ہے

اس لیے کہ آدم جب کبھی نیچے کو جاتا ہے اسے پتہ ہوتا ہے کہ وہ کیا ارتکاب کر رہا ہے اور اس ارتکاب کے خلاف متنبہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آدمی کے اندر نادم اور شرمسار کرنے والی اہلیت بھی ودیعت کر رکھی ہے اس اہلیت کو نفس لوامہ کہتے ہیں۔ جب کوئی غلط کام سرزد ہو جاتا ہے تو کوئی شے آدمی کے اندر سے اسے کچوکے لگاتی ہے اور وہ بقدر صورتِ حال کم یا زیادہ اذیت محسوس کرتا ہے۔ گویا اللہ نے سرزنش کا تازیانہ بھی آدمی کی ہستی میں شامل کر رکھا ہے۔ اس کے باوصف مسلسل غلط کام ہو تو پھر وہ کون کر رہا ہے؟ اور اگر وہ غلط کام آدمی خود اپنے ارادہ و اختیار سے

Marfat.com

نہیں کر رہا تو پھر اندر سے لعن طعن کرنے والی حقیقت کیا ہے؟ یہ تھا وہ مسئلہ ذمہ داری کا۔

ذمہ داری خالصتاً انفرادی ہے۔ خدائے تعالیٰ کا واضح اعلان ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی (کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی اور کا بوجھ نہ اٹھائے گا) کوئی جان کسی دوسری جان کا بار اٹھانے کی نہیں۔ اس اعتبار سے جسے اجتماعی ذمہ داری کہا جاتا ہے وہ بھی درحقیقت انفرادی ذمہ داری ہی ہے۔ معاشرے کا اجتماعی کمال اور اجتماعی زوال بندوں کے کمال وزوال ہی کا نام ہے۔ جس معاشرے میں اکثریت غلط بندوں کی ہو وہ معاشرہ اجتماعی زوال سے دوچار ہو جاتا ہے اور اسی طرح جس معاشرے میں کثرتِ کثیرہ بھلے لوگوں کی ہو وہ معاشرہ اجتماعی طور پر کمال سے ہمکنار ہوتا ہے مگر معاشرہ خود محض ایک تصور ہے، نظریہ ہے، تصویرِ خیالی ہے۔ اصل ٹھوس حقیقت فرد ہے۔ اور افراد مل کر معاشرہ بناتے ہیں۔ بقول حضرت علامہ:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر!
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا!!

ہاں یہ الگ بات ہے کہ بروں کی اکثریت اچھوں کی اقلیت کو بھی لے ڈوبتی ہے۔ وہ یوں کہ قوموں کو سزا جب بھی ملتی ہے اجتماعی سزا ہی ملتی ہے۔ جبھی تو علامہ نے فرمایا تھا:

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملّت کے گناہوں کو معاف

تاہم یہ حقیقت بھی خود اپنی جگہ اٹل ہے کہ فرد صحیح معنوں میں فرد آدم معاشرے ہی میں بنتا ہے۔ وہ شے جسے اخلاق یا کردار یا سیرت کہتے ہیں وہ معاشرے ہی میں پروان چڑھتی ہے۔ اگر فرد آدم محض اکیلا ہے، جنگل یا غار میں رہتا ہے، کسی دوسرے فرد آدم سے کوئی ربط بھی نہیں رکھتا تو اس کا اخلاق کیا، اس کا کردار کیا؟ اخلاق و کردار کو تو دوسروں سے لین دین کی صورت میں پرورش پانے کا موقع ملتا ہے۔ جہاں دوسروں سے معاملہ ہی نہ ہو وہاں امانت کیا، دیانت کیا، سچائی کیا، ایثار کیا، جہاد کیا اور شہادت کیا۔ مطلب یہ کہ فرد اگر اوصاف کا مالک ہے تو وہ اوصاف پنہاں رہتے ہیں۔ وہ امکانات خوابیدہ رہتے ہیں۔ ان کا بروئے عمل آنا اور بیدار ہونا صرف اجتماعی اور معاشرتی زندگی ہی کے باعث ممکن ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے آدمی واقعی معاشرتی حیوان ہے جسے معاشرہ موقع مہیا کرتا ہے کہ رفتہ رفتہ حقیقی معنوں میں انسان بن جائے یا کم از کم اس راہ پر پڑ جائے جو راہ انسانیت ہے۔

Marfat.com

باوصف اس کے کہ آدمی کو معاشرہ ہی آدمی بناتا ہے، ذمہ داری ہر فرد کی اپنی ہے۔ خدا کے حضور میں سب کو اکیلے اکیلے پہنچنا ہے۔ جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے: وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يومَ القيامَةِ فَرْداً۔ ہر ایک کا اپنے اور فقط اپنے ہی اعمال کا ذمہ دار ہونا واضح کر دیتا ہے کہ از روئے قرآن کوئی بھی شخص کسی دوسرے کے گناہوں کا بار نہ اٹھائے گا اور نہ سزا بھگتے گا۔ از روئے اسلام کوئی ازلی گناہ بنو آدم کے گلے میں نہیں پڑا۔ از روئے اسلام ہر انسان پاک پیدا ہوتا ہے۔ ماں باپ کے گناہوں کی سزا اولاد اور اسی طرح اولاد کے گناہوں کی سزا والدین کو نہیں ملے گی۔ اگر والدین تربیت اولاد میں کوتاہی کریں تو یہ ان کی اپنی خطا ہے۔ جس کے لیے وہ جوابدہ ہیں لیکن اولاد کی شعوری اور دانستہ خطاؤں کے وہ ہرگز ذمہ دار قرار نہیں دیے جائیں گے۔

بالکل اسی طرح کسی حاکم یا صاحب قوت کی حکومت یا قوت کے خوف یا دباؤ سے ایسے اعمال سرانجام دینا جو مستوجب سزا ہوں ضرور سزا دلائیں گے۔ کسی بڑے کا خوف یا لحاظ خدا کے خوف اور خوشنودی کے زیادہ یا برابر قابل لحاظ نہیں۔ اہل ایمان کے لیے حکم فقط اللہ کا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ قیامت کے روز مجرمین کہیں گے ہمارے بڑوں (عظام) نے ہمیں غلط راہوں پر ڈالا، وغیرہ مگر کوئی ایسا بودا عذر مسموع نہ ہوگا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے:

الا ان رحی الاسلام دائرة فدوروامع الكتاب حيث دار. الا انّ السلطان والكتاب سيفترقان فلا تفارقوا الكتاب. ا لا انّهم سيكون عليكم الامراء يقضون لكم ما لا يقضُون لاَ نفسِهم ان اطعتموُهُم اضلّوكُم وان عصيتموُ هم قتلوكم. كيف نصنعُ يا رسول اللهِ صلى الله عليه وسلم قال الرّسول كما صنعَ اصحابُ عيسَى بنِ مريمَ نشروا بالمناشر وصلّبوا على الخشب. موتٌ فى طاعةِ الله خير من حياةٍ فى معصيةِ الله.

''آگاہ رہو کہ اسلام کی چکی گردش میں آچکی ہے پس تم بھی کتاب کے ہمراہ گردش میں رہو۔ آگاہ رہو کہ جلد ہی حکومت کی راہ اور ہوگی اور قرآن کی راہ اور مگر تم قرآن کو نہ چھوڑنا۔ آگاہ رہو کہ تم پر ایسے حاکم بھی حکومت کریں گے جو اپنے لیے فیصلوں کے معیار اور قائم کریں

Marfat.com

گے اور تمہارے لیے اور۔ اگر تم ان کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں گمراہ کر دیں گے اور اگر تم سرکشی اختیار کرو گے تو تمہیں مار ڈالیں گے۔ اس پر اصحابؓ نے دریافت کیا: پھر ایسے عالم میں ہم کیا کریں؟ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہی کچھ جو اصحابِ عیسیٰؑ نے کیا تھا۔ انہیں آروں سے چیرا گیا، انہیں سولی دی گئی۔ اللہ کی اطاعت میں مرجانا اللہ کے سرکش ہو کر زندہ رہنے سے بہتر ہے"۔

Marfat.com

کمالِ رسالت۔۔کمالِ سیرت

قرآن کریم کی سورہ الاعلیٰ میں خدائے تعالیٰ کا ارشاد ہے: (ترجمہ) ''آپ تسبیح کیجیے اپنے عالی شان پروردگار کے نام کی جس نے پیدا کیا۔ صحیح، درست اور ٹھیک ٹھیک پیدا کیا۔ پھر جس نے اندازہ اور تخمینہ مقرر کیا اور راہ بتلائی''۔

ہر شے کا خالق خدا ہے۔ خالق کا معنی ہے وجود میں لانے ولا، لاشے کو شے بنانے والا یعنی ایک شے جو نہ ہو وہ ہو جائے۔ نیز یہ کہ ہر شے اپنے طبعی، فطری اور مزاجی تقاضے کے مطابق پیدا کی گئی۔ مادہ، خشکی، پانی، ہوا اور پھر ان کے بھی مختلف احوال میں ہر شے کی حیثیت اور اس کی ضرورت کا پورا کر دیا جانا۔ ہر شے کا ٹھیک تخمینہ اور اندازہ طے کر کے اس کے مطابق اس کا راہ پر لگا دیا جانا، جماد اور نبات کو اپنے انداز میں، حیوان اور انسان کو اپنے انداز میں۔ گویا ہر شے خداوند تعالیٰ کی بتائی ہوئی راہ پر چلتی ہے۔ فرمان پذیر ہے اور عبادت گزار۔ یہ الگ بات ہے کہ حسب ارشاد خداوندی ہم اس کی عبادت کو سمجھتے نہیں۔

آدمی واحد مخلوق ہے جسے اللہ نے عقل دی ہے، ارادہ بخشا ہے، قوت اختراع سے نوازا ہے۔ ساتھ ہی نیک و بد میں تمیز کرنے کی اہلیت بھی ارزانی کی ہے۔ اس کے مزاج میں غور و فکر کا جوہر بھی ہے۔ وہ پیش بینی پر بھی ایک حد تک قادر ہے۔ اس کے پاس قوتِ حافظہ بھی ہے، جس کے باعث وہ حوصلہ بھی پاتا ہے، آگے کو بھی بڑھتا ہے، فخر بھی کرتا ہے، اور نادم و شرمندہ بھی ہوتا ہے۔ یہ مخلوقِ آدم باقی ہر مخلوق سے بہتر اہلیتوں کی حامل ہے۔ اگر آدم اپنی اہلیتوں کو بجا طور پر استعمال کرے تو وہاں پہنچے کہ فرشتوں کا بھی مقدور نہ ہو، اور اگر ان اہلیتوں کو بیجا اور غلط استعمال کرے تو وہاں جا گرے جہاں کوئی وحشی سے وحشی جانور بھی نہ گر سکے:

کبھی جھومے، کبھی لرز جائے !!
سن کے انساں کی داستاں انساں!

آدم کو از رہِ وحی ہدایت دی ہے۔ باقی ہر مخلوق آئین فطرت کے مطابق اپنے مزاج میں اپنی

Marfat.com

زندگی کا لائحہ مضمر پاتی ہے۔ اسے کیا کیا کرنا ہے اور کس کس طرح کرنا ہے اس کے مطابق ہر شے سے عمل سرزد ہو رہا ہے۔ کوئی شے بے راہ نہیں ہو سکتی، اور کوئی شے اپنی ہستی کے باطن سے آگاہ نہیں ہو سکتی، کسی جمادی نباتی، حیوانی وجود کو خود آگاہی کی قابلیت عطا نہیں کی گئی۔ خود شناسی اور خدا شناسی کی اہلیت فقط آدم کے خمیر میں ودیعت کی گئی ہے۔ لہٰذا اس کو اس کی حیثیت، مقام، مرتبے اور امکان کے مطابق ہدایت سے نوازا گیا ہے۔ آدم ہی مرضی، پسند و ناپسند اور عقل و فہم رکھنے والا وجود ہے۔ اس لیے وہ اپنے نفع و نقصان کو پہچان سکتا ہے۔ اپنے حقوق کی حدود کو بھی سمجھ سکتا ہے اور فرائض کی وسعتوں کو بھی جان سکتا ہے۔ اس کی فطرت میں ذوقِ عبادت بھی ہے اور شوقِ بغاوت بھی، وہ صاحبِ ہوس بھی ہے، صاحبِ اشتہا بھی، اس میں راہِ خیر پر بھی پڑ جانے کی صلاحیت موجود ہے اور راہ شر پر بھی، وہ بہت کچھ سیکھ سکتا ہے اور تو اور وہ اپنے مفہوم کو اپنے لفظوں میں بول کر بھی اور لکھ کر بھی بیان کر سکتا ہے، وہ قلم والا ہے۔ سورہ اقراء میں، جو سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات کی مالک سورہ ہے خدائے تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تھا: ''خدا وہ ہے جس نے قلم سے تعلیم دی''۔ آدم میں ہر اہلیت اللہ نے پیدا کی اور اس کا تخمینہ اور اندازہ خدا نے طے کرایا۔ لہٰذا ٹھیک ٹھیک وہ اللہ ہی جانتا ہے کہ آدم کی فطرت کا تقاضا کیا ہے، اسے کس کس طرح راہ دکھانی ہے اور اسے کس کس طرح سمجھانا ہے۔ آدم خود اپنا خالق نہیں، اس لیے خود اپنے جملہ امکانات کو نہیں جان سکتا، خدا کی ہدایت کی روشنی ہی میں اس کے امکانات اس پر کھلتے ہیں۔ اس لیے خدا کی عطا کردہ رہبری کے سوا اور کوئی بھی رہبری اس کے لیے موزوں، مناسب اور موافق نہیں ہو سکتی۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

''اے رسول کہہ دیجئے جو ہدایت اللہ عطا کرے وہی ہدایت ہے''۔

خدا نے جو آدم کا خالق ہے آدم کو عقل، فہم اور بصیرت دے کر بھی اس کو اس کے حال پر نہیں چھوڑ دیا۔ اس کی اہلیتوں کو صحیح راہوں پر چلانے کے لیے اور اس کو صحیح معنوں میں آدمی کی حیثیت سے پروان چڑھانے کی خاطر اللہ نے وحی کے ذریعے راہبری کی، اسے زندگی کی صحیح راہ سے آگاہ کیا۔ مگر لازم تھا کہ وحی لفظی کے ساتھ ساتھ وحی عملی بھی سامنے آتی، لفظ بھی درس دیتے ہیں، تاہم عملی مثال بڑی کارگر تلقین و تبلیغ ہے۔ چنانچہ جس زمانے میں اور جس معاشرے میں اللہ تعالیٰ نے جو وحی بھیجی وہ اپنے کسی پیغمبر ہی پر نازل کی۔ یہ وحی فرشتے کے ذریعے آئی۔ اور یہ تو قرآن حکیم کا

Marfat.com

واضح اعلان ہے کہ ''ہر قوم کے لیے کوئی نہ کوئی ہادی آیا''۔اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہوا:

ہم نے ہر انسانی معاشرے میں رسول بھیجا جس نے انہیں یہ ہدایت دی کہ خدا کی عبادت کرو اور شیطان سے کنارہ کش رہو''۔(16/36)

یہ تھی پیغمبروں کی بعثت کی غایت۔ ہر پیغمبر نیچے تک پہنچنے والی وحی کا عملی نمونہ تھا اور عموماً ہر پیغمبر اسی معاشرے کے افراد میں سے تھا جس معاشرے کو ہدایت دینا مقصود تھی۔اس پیغمبر کا کردار اہلِ معاشرہ کے سامنے ہوتا تھا لہٰذا جب وہ وحی کے مطابق تلقین و تبلیغ کرتا تو کبھی کوئی منکرِ خدا یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ تم خود تو یہ کچھ کرتے رہے، آج نیا وعظ سنانے لگے ہو۔۔نہیں، ہر پیغمبر اپنے معاشرے کا بہترین انسان تھا۔جس کے ذاتی اخلاق پر کوئی دھبہ نہ پڑا ہوتا تھا اور اہلِ معاشرہ اس کی شرافتِ ذاتی کے قائل ہوتے تھے۔اہلِ معاشرہ وحی کو مانیں یا نہ مانیں یہ ان کا اپنا اختیار تھا، اتمامِ حجت اللہ کی طرف سے عمل میں آجاتا تھا۔خیر و شر کی جزا و سزا مقرر ہے۔دانش و فہم آدمی کے پاس موجود ہے۔ چاہے خدا کی اطاعت کا دم بھرے اور عبادت کرے، چاہے خدا کا انکار کرے اور سرکشی و معصیت کا مرتکب ہو۔پیغمبر کا کام وحی کا پہنچانا، وحی کے مفہوم کو دلوں میں اتارنے کی کوشش کرنا اور خود کو خدا کی وحی کا عملی نمونہ بنا کر لوگوں کے لیے قابلِ تقلید مثال پیش کرنا رہا ہے۔پیغمبر عموماً اصحاب ارشاد و تلقین ہی رہے ہیں۔وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح بادشاہ یا حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح وزیر با تدبیر کم ہی ہوئے۔اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل پیغمبروں نے مشرکین و کفار کے خلاف فوج کشی شاذ و نادر ہی فرمائی۔

ہر پیغمبر کی بعثت کا باعث اللہ کا اولادِ آدمؑ پر یہ کرم تھا کہ انسان بہتر انسان بن سکیں۔ٹھیک اور درست اطوار کے مالک ہوں، بہتر ضابطے اور قاعدے مقرر کر کے عادلانہ معاشرے استوار کر سکیں۔قرآن کریم نے سابق معاشروں کی بہت سی برائیاں گنوائی ہیں۔مثلاً غرور اور سرکشی، ظلم اور مار دھاڑ، ناجائز منفعت کا ذوق بے پناہ، شراب خوری، جنسی بے راہ روی، لین دین اور بھاؤ تول میں دھوکا دینا اور ڈنڈی مارنا وغیرہ۔وحی کی رو سے خداوند کریم نے انسانوں کو خدا کے حکم کا پابند بنا کر منصف اور خیر جُو فرد کی صورت میں تعمیر کرنا چاہا۔تا کہ فرد بھی سلامت روی کے باعث بہتر فرد بن سکے اور مجموعی طور پر معاشرہ بھی بہتر انسانوں کے باعث سکھ چین کا مسکن قرار پائے۔

ابھی ہم نے اوپر عرض کیا ہے کہ ہر پیغمبر اپنے معاشرے کا بہترین فرد تھا۔اسے اپنے

Marfat.com

معاشرے والے مرد امین جانتے تھے اور اس کے اعمال واخلاق کی پاکیزگی کے قائل ہوتے تھے۔ان لوگوں کے لیے بلندترین اور خوشترین نمونۂ انسانیت ان کا پیغمبر ہوتا تھا۔

ظاہر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے فقط ایک معاشرے کے لیے پیغمبر بنا کر نہیں بھیجا تھا، آپؐ سے تو خدا نے یوں ارشاد فرمایا: ''ہم نے آپ کو سب لوگوں کے لیے رسول بنا کر روانہ کیا ہے، اور اس ضمن میں ایک خدا ہی کی گواہی کافی ہے''۔(4/79) اب اگر ہر پیغمبر اپنے معاشرے کا بہترین فرد تھا تو ظاہر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو ساری اولادِ آدم کے لیے مبعوث ہوئے ہیں وہ ساری اولادِ آدم میں سب سے بہتر، سب سے عظیم، سب سے بلند اور سب سے بڑے امانت دار رسول ہیں۔اسی لیے آپ الرسول ہیں، النبی ہیں اور الامین ہیں۔ پھر ایک اور نہایت اہم بات یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ونبوت اور کمالِ سیرت فقط آپؐ کے ہم زمانہ معاشروں ہی کے لیے واجب اطاعت وتقلید نہ تھی بلکہ اب تک ہے اور تا قیامت رہے گی۔اس لیے کہ از روئے قرآن آپ پر دین مکمل ہو گیا اور آپ کو خاتم النبیین قرار دے دیا گیا۔ اب یہ امر خود بخود عیاں ہو گیا کہ وحیٔ خدا کا کامل ترین نمونہ قرآنِ کریم ہے۔جبھی تو اس کے تحفظ کا خود خدا ضامن ہے۔اس وحی کو اولادِ آدم کی راہبری کا حق تا قیامت ادا کرنا ہے۔ساتھ ہی کامل ترین وحی کی آئینہ دار اور اس کی عملی مثال باکمال یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو بھی تا قیامت رہنا ہے۔عملی قرآن تو آپؐ ہیں۔کامل ترین وحی کے حامل ہونے کی حیثیت سے کامل ترین رسالت بھی آپؐ ہی کی ہوئی۔اس طرح آپ اکمل الرسل اور اکرم الرسل ٹھہرے۔گویا ایک مسئلہ اور کھل کر سامنے آجاتا ہے کہ امتِ محمدیہ کو ہدایت کاملہ کی جو نعمت میسر آئی وہ اس سے قبل کی امتوں کا مقدر نہ ہوئی۔اس لیے انسانیت کے جس درجۂ بلند پر پہنچنے کے امکانات امت محمدیہ کے افراد کو میسر آئے اور آسکتے ہیں وہ سابق امتوں کے افراد کو ارزانی نہ ہوئے تھے۔حضرت بوصیریؒ نے اپنے مشہور قصیدہ بُردہ میں بجا ہی تو کہا ہے کہ خدا نے ہمارے داعی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی طاعت کے باعث رسولوں میں مکرم ترین کہا تو ہم ان کی امت ہونے کے باعث امتوں میں مکرم ترین امت قرار پائے۔اسی ضمن میں یہ معاملہ بھی عیاں ہو گیا کہ جو اسلوب حیات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی کامل یعنی قرآن کریم اور سیرت نبیؐ کے اتباع میں حاصل ہوتا ہے وہی اسلوبِ حیات بہترین ہے۔ہم دین کو پوری زندگی پر حاوی اصولوں کا مجموعی نام جانتے ہیں۔

Marfat.com

کوئی بھی اور اسلوبِ حیات پائیدار اور مفید ثابت نہیں ہوسکتا۔ دین اسلام میں خدا کے احکام کے مطابق جس عبودیت کا عملاً دم بھرنے کی تلقین کی گئی ہے صحیح معنوں میں آدم سازی کی اس سے بہتر اور کوئی صورت نہیں۔ علامہ اقبالؒ کہتے ہیں:

زمانہ کہنہ بتاں را ہزار بار آراست
من از حرم نگزشتم کہ پختہ بنیاد است

زمانہ اپنے پرانے بتوں کو بار بار سجاتا رہا مگر میں نے حرم کو نہ چھوڑا۔ میں جانتا ہوں کہ حرم کی بنیاد بڑی پکی ہے۔ علامہ اقبالؒ کی مراد یہ ہے کہ باطل نظریات بار بار سر اٹھاتے ہیں۔ انسانی کمزوریاں اور کوتاہیاں ان نظریات کو بار بار سہارا بھی دیتی ہیں مگر ان میں ٹھہراؤ اس لیے ممکن نہیں کہ باطل مزاجاً پائیدار نہیں ہوتا۔ حرمِ کعبہ سے آغاز پذیر ہونے والا دین بڑا پختہ اور مضبوط ہے۔ اس لیے کہ جن اصولوں پر یہ استوار ہے وہ ابدی اصول ہیں۔ وہ خالص اصول ہیں جن میں تحریف نہیں ہوئی اور نہ ہوگی۔ جبھی تو قرآن کریم نے اس ارشادِ خداوندی کا اعلان کیا: ''خدا وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا تا کہ اسے ہر دین پر غالب کرے خواہ یہ بات مشرکین کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو''۔ (سورہ توبہ)

خدا کے حکم پر چلنے والا معاشرہ ہی متوازن اور معتدل اسلوبِ حیات سے بہرہ مند ہوسکتا ہے، اسی معاشرے میں قانون کی بالادستی عمل میں آسکتی ہے۔

اسلامی معاشرے میں کوئی ڈکٹیٹر یا جمہوری سربراہ خدا کے قانون کو اپنی مرضی کے تابع نہیں کرسکتا۔ یہاں تو خود اسے بھی خدا کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ یہ اسلام ہی میں ممکن ہے کہ خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے یہ کہے کہ جب تک میں خدا کا حکم مانوں تم میرا حکم مانو۔ میں ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کر دو۔

یہ اسلام ہی ہے جو انسانی اخوت کے جذبے کو ابھار کر پوری دنیائے آدم کو باہم مربوط معاشرہ بنا سکتا ہے۔ عیسائی یہودی خون پر استوار معاشرہ احترامِ آدم کے وسیع معنی کو نافذ نہیں کرسکتا۔ اسی طرح کوئی آریائی اور برہمنی معاشرہ وحدتِ آدم کا ضامن نہیں ہوسکتا۔ ہٹلر نے جرمن قوم کو سب اقوام سے بہتر قرار دیا۔ مسولینی نے فقط اطالوی قوم ہی کو دنیائے آدم کا حاکم ہونے کے قابل جانا۔ گویا اپنے اپنے معاشرے کے فرد جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا نعرہ لگاتے رہے۔ اسی

Marfat.com

طرح مادی قوت سے جو معاشرہ سرمایہ دار ہو وہ دوسرے معاشروں کو روند ڈالے۔ یہ سارے اسالیبِ حیات جن کو ہم قرآنی اصطلاح میں دین کہتے ہیں آدم کی آدم کے اعتبار سے واجب تعظیم نہیں کر سکتے۔ یہ اصول قرآن پر استوار معاشرہ نافذ کر سکتا ہے۔ یہ اصول اس حکمِ خداوندی پر مبنی ہے کہ تم میں سے خدا کے حضور میں مقرب ترین اور معزز ترین وہ فرد ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ متقی ہونے کا مطلب ہے خدا کے خوف سے ہر اس امر کو ترک کر دینا جو مستوجب سزا ہو۔ وہ کام کرنا جو گناہ کی آلائش سے بچائے اور سزائے دوزخ سے محفوظ رکھے۔ ظاہر ہے کہ متقی بے انصاف نہیں ہو سکتا۔ دوسروں کے حقوق نہیں چھین سکتا۔ متقی فریب کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ متقی خود غرض نہیں ہو سکتا۔ متقی خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا باغی نہیں ہو سکتا۔ اسلامی معاشرہ اگر روحاً اور معناً اسلامی معاشرہ ہے تو وہ اہلِ تقویٰ کا معاشرہ ہوگا۔ شیطنت و شر کا نہیں۔ ایسے مثالی معاشرے میں تربیت پانے والا ہر فرد اپنے آپ میں ہی محتسب اور پولیس کو بھی موجود پاتا ہے اور عدالت کو بھی۔ وہ ہر وقت اپنے ضمیر کی عدالت میں حاضر رہتا ہے۔ وہ قانون، احتساب، پولیس اور عدالت کا محتاج نہیں ہوتا۔ ایسے مثالی معاشرے کو وجود میں لانے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کامل الوحی اور کامل السیرۃ بنا کر بھیجا گیا تھا اور ان کے ذمے کام یہ تھا کہ وہ قرآنی آیات کی تلقین فرمائیں۔ پھر قرآنی آیات کی تلقین اور اپنے فیض صحبت اور کمال سیرت سے لوگوں کے کردار کی خامیاں دور کریں تا کہ ذہن کی میل صاف ہو۔ فکر کی آلائش دور ہو۔ راست فہمی کے لیے گنجائش پیدا ہو، پہلے ذہنی کجی دور ہوگی اور غلط عادات درست ہوں گی تب دل خدائی احکام کا نقش اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا عکس قبول کرنے کے قابل ہوگا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

اول بروے خانہ دگر میہماں طلب
آئینہ شو جمال پری طلعتاں طلب

پہلے گھر میں جھاڑو دے لو۔ گھر کو صاف کر لو پھر مہمان کی طلب دل میں پیدا کرو۔ پہلے آئینہ بنو پھر اہل جمال کے عکس کی خواہش کرو۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو الرسول اور النبی کے ساتھ ساتھ قلب و روح کو پاک صاف کرنے والے کا منصب بھی خدا نے عطا کیا۔ پھر معلم کا منصب بھی بخشا۔ شریعت کی تعلیم حضورؐ ہی نے دی۔ بہت سی قرآنی آیات کی عملی تفسیر آپؐ نے پیش فرمائی۔ حکم نماز، قرآن میں ہے مگر وہ ادا کیسے ہوگی یہ حضور اکرمؐ ہی نے بتایا، وضو کیسے ہوگا،

Marfat.com

زکوٰۃ کی کیا شرائط ہوں گی، جنگی قیدیوں کی رہائی کے باب میں فدیہ کیا کیا کچھ ہوسکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایک دو نہیں بہت سے مسائل ہیں جن کی قرآن کی روشنی میں آپ نے تعلیم دی۔ گویا آپ نبی بھی ہیں، ہادی بھی، معلم بھی، روحانی معالج بھی اور اس کے علاوہ زندگی کی استواری کے لیے بہترین حکمت و دانش کے آگاہ کرنے والے بھی، حق گوئی خدا کا حکم ہے، مگر حق گوئی کی حکمت کی تشریح قرآن میں نہیں۔ امانت داری، حکم خداوندی مگر امانت میں حکمت کیا ہے، خیر جوئی میں حکمت کیا ہے، شر سے اجتناب میں حکمت کیا ہے، صلہ رحمی میں حکمت کیا ہے۔ غرض ایک دو نہیں سینکڑوں معاملات ہیں جن میں دانش کا درس مضمر ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس دانش اور حکمت کو نبی اکرمؐ کی چشم مبارک ہی بخوبی دیکھ سکتی ہے۔ مثلاً حضور اکرم کا ارشاد ہے: ساری حکمتوں اور دانائیوں کا مغز خوفِ خدا ہے۔ اس ایک قول کی تشریح میں مقالات مرتب ہوسکتے ہیں۔ یہ ہیں گویا وہ کام یا منصب جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد ہوئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کعبہ کے دوران میں دعا کی تھی کہ ان کی آل اولاد اور آل اولاد کی آل اولاد میں ''وہ'' صاحبِ مناصب جلوہ گر ہو:

> ''اے ہمارے پروردگاران میں سے ایک پیغمبر انہی میں سے بھیج، جو انہیں تیری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنائے، اور انہیں کتاب کی اور دانائی کی تعلیم دے اور انہیں پاک صاف کرے۔ یقیناً تو بڑا زبردست وقوی اور حکمت والا ہے۔'' (سورہ بقرہ آیت 129)

گویا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک تو آیات قرآنی سنانا ہیں، دوم قرآن کے معانی و مفاہیم سے آگاہ کرنا ہے، سوم معاملاتِ حیات کے باب میں دانش و حکمت کا درس دینا ہے اور چہارم لوگوں کو حسنِ اخلاق، حسنِ عمل اور حسنِ فکر و خیال کی نعمت سے نواز کے ان کو عملی اور فکری آلائشوں سے پاک صاف کرنا ہے۔ اس مفہوم کو سورہ آل عمران میں بھی دہرایا گیا ہے اور سورہ جمعہ میں بھی۔ اس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غایت واضح ہوجاتی ہے۔ بندوں کو خدائی پیغام اور حکم سنانا، سمجھانا اور رہبری کرنا، عادات و اطوار سنوارنا، سوجھ بوجھ کو صحیح خطوط پر ڈالنا تاکہ آدم کی تربیت بطریقِ احسن عمل میں آئے۔ آدم میں شانِ خداوندی کا عکس موجود ہو۔ افراد بلند نظر ہوں۔ ہوس کے بندے نہ ہوں۔ باطل کے پجاری نہ ہوں، حق کے پاسدار ہوں تاکہ وہ واقعی اس مقام تک پہنچ سکیں جو آدم کی شان کے شایاں ہے یعنی مقامِ خلافتِ ربانی۔

Marfat.com

عیدالاضحیٰ

حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام نے ستارے کو خدا بنایا مگر ستارہ ڈوب گیا۔ آپؑ نے فرمایا: میں ڈوب جانے والوں کو دوست نہیں بنا سکتا۔ میں زوال آشناؤں سے محبت نہیں کر سکتا۔ پھر آپؑ نے چاند دیکھا، پھر سورج دیکھا۔ وہ بھی ڈوب گئے۔ وہ بھی انحطاط پذیر ثابت ہوئے۔ چنانچہ آپؑ نے فرمایا: ''میں نے اپنا رخ زمین اور آسمان کے خالق کی طرف کر لیا ہے اور باقی ہر شے سے منہ موڑ لیا ہے۔ اب میں کسی کو بھی خدا کے ساتھ شریک خدائی نہ مانوں گا۔ زوال آشنا اور ڈوب جانے والے کو قرآن نے ''آفل'' کہا ہے۔ درحقیقت یہ ستارے اور چاند اور سورج کا ڈوبنا ایک رمزی اور علامتی بیان ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے وہ ستارہ یا چاند یا سورج جس نے ڈوب کر ان کے ذوقِ عبودیت کو ٹھیس پہنچائی تھی، پہلی بار تو نہ دیکھا تھا۔ جب سے آپؑ نے آنکھ کھولی تھی طلوع وغروب کا سلسلہ دیکھ رہے تھے۔ مقصود یہ بتانا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے دنیا کی مختلف ہستیوں کو دیکھا۔ کوئی کسی قوت اور شوکت کی مالک تھی اور کوئی کسی ہیبت وجلال کی مگر ان کے مشاہدے نے ان کو اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ یہاں جو کچھ ہے وہ فانی ہے۔ یہ مشاہدے اور علم کی بات ان کو ایک خدا کے تصور تک لے گئی اور پھر آپؑ نے ایک خدا پر کامل انحصار کر کے باقی ہر شے سے منہ موڑ لیا۔ اسی منہ موڑ لینے والی ادا نے آپؑ کو حنیف کے لقب سے ملقب کیا۔

یہ امر کہ ہر شے ''آفل'' ہے، بے بقا ہے، زوال پذیر ہے، حضرت ابراہیمؑ کے دل میں اس طرح جاگزیں ہو گیا کہ آپؑ کو پھر کسی شے نے اپنی محبت میں گرفتار نہ کیا۔ باقی رہنے والا محبوب ایک ہی ہے اور بس اس محبوب پر ہر شے قربان خواہ وہ مال ہو، گھر ہو، اہل وعیال ہوں اور خواہ خود اپنی جان۔ ہر وہ شے جو آفل ہے اسے غیر آفل کے اشارے پر قربان کیا جا سکتا ہے۔ اس امتحان میں حضرت ابراہیمؑ پورے اترے۔ انہوں نے بزرگوں کی عقیدت کے مظاہر یعنی رنگا رنگ اصنام توڑ دیے۔ انہوں نے اپنے جسم کو بھڑکتے ہوئے شعلوں کی نذر کر دیا، انہوں نے گھر چھوڑا، انہوں نے بڑھاپے کے دور میں اپنے نونہال اسمٰعیلؑ کے گلے پر چھری رکھ دی۔ اللہ کو یہ ادا بھا گئی۔ آخر

Marfat.com

کیوں نہ بھا جاتی۔ چنانچہ اللہ نے اپنے ان صادق پرستار کو خلیلؑ کا خطاب عطا فرمایا اور ان کی یاد کو دوام بخشا۔

ہم امت مسلمہ کے افراد عید الاضحیٰ کو اس انداز سے دیکھتے ہیں۔ ہم اسے ''یادِ یار'' جانتے ہیں۔ ہم اسے گوشت اور خون اور اس کی قیمت اور نفع اور نقصان کے زاویے سے نہیں دیکھتے۔ ہم اسے فقط عشق کے اعتبار سے دیکھتے ہیں عقل ستارے سے چاند اور پھر آفتاب تک پہنچی تھی۔ اسمٰعیلؑ کے گلے پر چھری چلا دینا، عقل سے کوئی علاقہ نہ رکھتا تھا۔ امتِ مسلمہ علم و مشاہدہ سے شروع ہوتی ہے اور عشق تک پہنچتی ہے۔ اور یہی ہم مسلمانوں کے علم کی تکمیلی منزل ہے۔ بقول حضرت علامہ اقبال:

علم مسلم کامل از سوز دل است
معنیِ اسلام ترک آفل است

اگر آپ کو یہ وہم لاحق ہو کہ ہم لاکھوں جانور ذبح کر کے اور اربوں روپے کا ضیاع کر کے غیر عاقلانہ فعل کا ارتکاب کرتے ہیں تو اہل دل آپ سے عرض کریں گے کہ حضور آپ تا حال محو تماشائے لب بام ہیں۔ بتوں کے بارے میں نمرود کی امت اور آذر کے قبیلے سے مصالحت ہو سکتی تھی۔ سیاست و تدبر سے کام لے کر کوئی درمیانی راہ اختیار کی جا سکتی تھی۔ یوں بھی ہو سکتا تھا کہ اے ابراہیمؑ تم دل میں بیشک بتوں کو گالی دیتے رہنا مگر بظاہر کوئی ایسی حرکت نہ کرنا جس سے بتوں کی عظمت کو ٹھیس پہنچے۔ مگر حضرت ابراہیمؑ عاشق تھے، مروج معنوں میں سیاست دان نہ تھے کہ اصول پر مصالحت کر لیتے۔ یہی تو عاشق اور دنیا دار کے تدبر میں فرق ہے۔ آگ میں کود جانا بہر حال اہلِ عقل کے نزدیک غیر عقلی بات ہے مگر اہلِ دل کے نزدیک دل کی ترنگ اور دل کی موج اور دل کی زندگی ہے۔ اسی طرح گھر چھوڑ دینے کی خواہش خداوندی کو تاویل کی نذر کیا جا سکتا تھا۔ بیٹے کی قربانی کے ایماء اور اشارے کو بھی استعارہ اور مجاز کا رنگ دیا جا سکتا تھا اور اپنے آپ کو فریب دینے کے لیے کوئی فکری تدبیر تراشی جا سکتی تھی۔ یہ سب کچھ ممکن تھا مگر پھر خلیلؑ کون کہلاتا؟

عشق فرمودۂ قاصد پہ سبک گام عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیِ پیغام ابھی

Marfat.com

اگر حضرت ابراہیمؑ فقط ایک خدا کی محبت سے سرشار ہونے کے یہ والہانہ ثبوت مہیا نہ کرتے تو گلشنِ عشق میں شہادت کے نخل کیونکر اگتے اور کس طرح برومند ہوتے ؟ اور اگر ذوقِ شہادت نہ ہوتا تو جہاد و غزوات کہاں سے آتے ؟ غازی اور مجاہد کا تصور کیونکر ابھرتا ؟ امتِ مسلمہ اسی لیے ابراہیمیؑ امت کہلاتی ہے کہ یہ علم و مشاہدے سے شروع ہو کر عشق تک پہنچتی ہے اور پھر بدر کے غزوے میں فیصلہ کر دیتی ہے کہ اللہ والے فقط اللہ والوں کے رشتہ دار ہیں۔ خون کا رشتہ توحید کے رشتے کے بغیر متروک، مردود اور مقطوع ہے، نہ عربی رشتے کی رو سے بھائی قبول، نہ بیٹا، نہ ماں، نہ باپ، دوسرے رشتوں کا تو ذکر ہی کیا۔

Marfat.com

قربانی.....یادِ یار

عیدِ قربان پھر آئی۔ یادِ خلیلؑ و اسمٰعیل علیہما السلام پھر منائی جائے گی۔ تمام عالم اسلامی میں کسی خواب اور کسی تعبیر کے از سرِ نو چرچے ہوں گے۔ خواب کیا؟

''جانِ پدر! میں نے خواب میں دیکھا کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں.....!''

بیٹے نے جواب دیا: ''جو حکم ہوا ہے کر گزریئے''۔

باپ بوڑھا ہے مگر اس کا ایمان جوان ہے۔ بیٹا معصوم ہے مگر اس کا یقین بالغ ہے۔ باپ اور بیٹے کے یہ راز و نیاز توحید پرستوں کے لیے شمعِ راہ بن گئے۔ خدا نے ارشاد فرمایا: ''ہم نے ایک بہت بڑے ذبیحہ کی صورت میں اسمٰعیلؑ کا فدیہ ادا کر دیا''۔

ملّتِ ابراہیمی اپنے امام کی غیرتِ ایمانی کی لاج رکھنے کے لیے اور علمِ توحید بلند رکھنے کی خاطر ہزاروں کربلاؤں میں خندہ پیشانی کے ساتھ کود گئی۔ حضرت خلیلؑ نے ستارہ سے مہتاب اور مہتاب سے آفتاب تک سب کی چمک دیکھی۔ سب سے مرعوب ہوئے۔۔۔ مگر: ''میں غروب ہونے والوں کی یاری نہیں چاہتا!'' کہہ کر ان غروب ہونے والوں کے خدائے لم یزل کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔

آسمانی چاند تارے اور سورج تو نظری بات تھی۔ آیا جگری شمس بازغہ کو بھی آفلین ہی کا مقام حاصل تھا۔ یا وہ زیادہ پائیدار تھا؟ حضرت خلیلؑ نے اس شمس بازغہ کو خود اپنے ہاتھوں غروب کر دینے کا عزم کر لیا تا کہ

معنیِ اسلام ترک آفل است کا صحیح مفہوم اجاگر ہو سکے۔

ہر غیر فانی شے، لاشے ہے۔ ایک ہی ذات باقی ہے اور وہی محبوب ہے۔ جو عشق واجب الوجود سے کوئی نسبت قائم کر سکا وہ خود بھی لازوال ہو گیا۔ مجھے معلوم نہیں دینی اور شرعی توجیہات کیا ہیں..... ''نہ قاضیم نہ مدرس، نہ مفتیم نہ فقیہہ'' اتنا ضرور محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے امام کی یاد ضرور تازہ رہنی چاہیے۔ وہ جس نے ہر فانی متاع کو خدا کے عشق میں پرِ کاہ جتنی حیثیت بھی نہ دی

Marfat.com

..... جان آگ میں ڈال دی..... وطن چھوڑ دیا..... اعزہ سے جدا ہو گئے..... جگر گوشہ کی گردن پر چھری رکھ دی۔ خدا نے کہا: ''ہم نے ابراہیمؑ کو اپنا دوست بنالیا ہے اور اسے بنو آدم کا امام قرار دے دیا ہے۔ خدا نے کسی کو بیٹا، بیٹی، بہن، بھائی نہ بنایا مگر دوست ضرور بنایا۔ پھر دوستی خونی رشتوں سے کیوں بالا نہ ہو۔ میدانِ بدر نے خون کی دوستی پر قربان ہونے کے کیا کیا منظر دیکھے۔

میں نے بات شروع کی تھی کہ عید قربان پھر آئی۔ پھر وہ یاد منائی جائے گی جو ہمیں ''ترکِ آفل'' کا بڑا دل نشین درس دیتی ہے۔ اس یاد کی شمع سے ہمارے حکمت پوش سینوں میں تھوڑی سی روشنی ضرور ہو جاتی ہے بشرطیکہ یاد کو یادِ یار جان کے منایا جائے۔ جب عشق روپوں کے ترازو میں تلنے لگتا ہے تو پھر بات کاروباری اور آفل پرستانہ سی ہو کر رہ جاتی ہے۔ قربانی سے کتنے لاکھ روپے کا نقصان ہوا۔ یہ سوچ کا نیا دھارا ہے ہر دور کا مزاج کچھ خصائص رکھتا ہے۔ موجودہ دور مادی تخمین و حساب کا ہے۔ ہم لوگ اس دور کی پیداوار ہیں۔ لہٰذا ہم میں سے کچھ لوگ کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔

میں کہتا ہوں ہم اس وقت ہم ہیں جب تک ملّی روایات کے چاند ماند نہیں پڑتے۔ اگر ہم بعض عزیز اعمال کو جو پوری ملّت کی شناخت ہیں ترک کر دیں تو ہوتے ہوتے بے مرکز و محور رہ جائیں گے۔ بات لمبی کیوں کی جائے! یہیں سے کیوں نہ شروع ہو کہ آخر عید الاضحیٰ پر جو قربانی ہم دیتے ہیں اس کا رواج کس عہد میں ہوا۔ میری مراد اس قربانی سے ہے کہ ایک شخص حج پر نہیں گیا۔ گھر پر بیٹھا ہی قربانی دے رہا ہے۔ اگر قربانی فقط حاجیوں ہی پر فرض ہو تو غیر حاجی لوگ کب سے قربانی عمل پیرا ہیں؟ سیدھی سی بات ہے کہ تاریخ ہمیں ہزاروں ایسے امور کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ تاریخ کی رو سے ہمیں پتہ چل جانا چاہیے کہ غیر حاجی کب سے اور کس کے حکم سے قربانی کی رسم ادا کر رہے ہیں۔

اگر حضرت ابوبکرؓ نے یہ سلسلہ شروع کیا ہوتا تو ہمیں معلوم ہو جاتا۔ اگر حضرت عمرؓ نے اس کی طرح ڈالی ہوتی تو آثار اخبار رہبری کرتے۔ پھر اگر یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نہیں تھی تو ساری ملّت نے اسے قبول کیوں کر لیا۔ اگر خلیفۂ اول نے اس کی ابتدا کی ہوتی تو اس غیر مسنون عمل کو عمرؓ بند کر دیتے۔ اگر عمرؓ نے اس کی بنیاد ڈالی ہوتی تو حضرت عثمانؓ اس پر عمل پیرا نہ ہوتے۔ اگر بنوامیہ اس کے موید ہیں تو عباسیوں اور علویوں نے کیوں اس کے خلاف آواز نہ اٹھائی۔ حد یہ ہے کہ اسلامی فرقوں میں قربانی کے مسئلہ پر تو اتنا اختلاف بھی نہیں جتنا آمین بالجہر

Marfat.com

کے بارے میں ہے۔

اگر خدانخواستہ قربانی، غیر حاجی لوگوں کی قربانی، غیر مسنون بات ہوتی، بالفاظِ دیگر اگر ہم اسے بدعت جانیں تو پھر اختلافی امور اس کی پیدائش کے ساتھ ہی پیدا ہونے چاہئیں تھے۔لیکن ایسی بات کوئی نہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود ہی اپنے اوہام کا شکار ہو رہے ہیں۔

دوسری بات کہ قربانی کا مقام مکہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ قریش کو حج کے ذریعے سے روزی کے وسائل مہیا کرنا چاہتے تھے۔گویا قربانی بھی ایک طرح سے قریش کی (جو ملّت خلیل اللہ کی اولاد تھے) ضیافت تھی۔قریش وادیٔ غیر ذرع میں آباد تھے اور خدا تعالیٰ نے انہیں گرما و سرما کے سفر سے بچا لیا اور بھوک اور خوف سے مامون کر دیا۔اگر ہم قرآنی آیات کی تشریح یوں کرنے لگیں تو پھر سرے سے حج ہی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔اس وقت عرب والے ہم سے زیادہ دولت مند ہیں۔ حج کے جملہ ٹیکس مل کر حکومت کی روغنی کمائی کا عشر عشیر بنتے ہوں گے۔پھر حج کا تردد کیوں کیا جائے؟

دیکھو اے یارو! عقل بڑی شے ہے مگر ہر جگہ کارآمد نہیں۔محبت کی معمولی سی رمزیں بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔فاروق اعظمؓ نے حجر اسود سے کیا کہا تھا؟ قربانی کے بارے میں معترضین کچھ بھی کیوں نہ کہیں۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے لہٰذا واجب الاتباع ہے۔حضورؐ نے خلیل اللہ کی یاد کو تازہ رکھا۔اور پھر حضور ایسے دائمی نوعیت کے احکام اپنی طرف سے کب دے رہے تھے۔قرآن شاہد ہے۔

یورپ اور امریکہ میں جتنے جانور عموماً ذبح ہوتے ہیں ان کے مقابلے میں یہ قربانی جو سال میں ایک بار ہوتی ہے، کتنے جانور چاہتی ہے؟ یورپ والے جانوروں کو ختم نہیں ہونے دیتے اور وہ بڑھاتے چلے جا رہے ہیں۔ہم نکمے لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے والے خوراک بخش جانوروں کی کمی پر چلّائے جا رہے ہیں اور حل یہ سوچا ہے قربانی بند کر دو۔ایسا کیوں نہیں کہتے کہ ہم اس یاد کو ہمیشہ تازہ رکھنے کے لیے افزائش حیوانات میں کمی نہ آنے دیں گے اور اگر ضرورت پڑی بھی تو عام خوراک میں گوشت کی کمی کر کے بھی اس قربانی کے جانور بچا لیا کریں گے۔بعض نکتہ چیں کہیں گے کہ یہ تو کوئی عقل کی بات نہ ہوئی۔میں کہتا ہوں کہ فرزند کے گلے پر چھری رکھ دینا کہاں سمجھ آتا ہے۔عقل تو ہمیشہ لب بام ہی رہتی ہے۔

Marfat.com

غزوۂ بدر کا پیغام

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ہجرت فرمائی۔ یثرب کو مسکن بنایا، یثرب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے مدینۃ الرسول اور پھر مدینہ منورہ کہلایا، حتیٰ کہ اس شہر کو یثرب کہنا ترک کر دیا گیا۔ ہجرت میں یہ درس پوشیدہ تھا کہ اسلام مکی الوطن نہیں۔ اگر دین اور وطن میں تصادم ہو جائے تو مردِ مومن کے نزدیک بلاتردد ترجیح دین کو حاصل ہے۔ اس لیے کہ اس کا وطن اس کا اسلام ہے۔ مگر اس موضوع پر مفصل پھر کبھی عرض کروں گا۔ آج غزوۂ بدر کی اہمیت پر اس زاویے سے روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا کہ اس غزوے نے ملّتِ اسلامیہ کو کس طرح خون اور نسل سے بلند تر ایک روحانی اور اصولی برادری ثابت کر دیا۔

مگر پہلے ملّت کے لفظ کی وضاحت ضروری ہے۔ ملّت کا لغوی معنٰی دین و مذہب ہے اور قرآن کریم میں یہ لفظ دین و مذہب ہی کے معنوں میں آیا ہے چنانچہ ''ملّتِ اسلامیہ'' کا اصلاً معنٰی ہے ''دین اسلام''۔ مگر ہوتے ہوتے ملّتِ اسلامیہ کی جگہ خالی ''ملّت'' رہ گیا اور اس طرح ملّت، دین و مذہب کے بجائے ''امت'' کا مفہوم ادا کرنے لگا۔ گویا اب پورے عالم کے مسلمانوں کو ''ملّت''، بمعنٰی امت کہہ کے یاد کیا جاتا ہے۔ پورے عالم ہی پر کیا موقوف، ہر اسلامی ملک میں بسنے والوں کا یہی لقب ہونا چاہیے۔ لہٰذا جب ہم ملّتِ ایران کہیں تو تمام ایرانی مسلمان مراد ہوں گے جن میں بلوچ، بھی شامل ہیں کرد بھی، ترکمان بھی اور عرب بھی۔ قبائلی اور نسلی امتیازات سے بالا وحدت۔ اسی طرح پاکستان کو لے لیں۔ یہاں بھی اہلِ ایمان کی نظروں میں ''ملّت'' کا وہی مفہوم ہے۔ یعنی پاکستان کے تمام مسلمان خواہ وہ کسی بھی قبائلی جمعیت کے افراد ہوں اور خواہ کسی بھی علاقہ میں آباد ہوں، یاد رہے کہ ملّت قبائل اور قومیتوں کی یکجائی کا نام نہیں، یہ اتحاد بھی نہیں، یہ اتحاد سے برتر ایک شے ہے۔ یہ وحدت ہے، خدائے واحد کے بندوں کی اجتماعی شان وحدت ہے۔

غزوۂ بدر نے اس وحدت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کر دیا اور بتا دیا کہ امت یا ملّت اور

Marfat.com

شے ہے اور قوم یا قبیلہ کوئی اور شے۔ وہ اس طرح کہ غزوۂ بدر نے دین کے مقابل خون کے رشتوں کو بڑی بے نیازی سے کاٹ کر پرے پھینک دیا۔ یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کو ترک کر کے مدینے میں اقامت گزیں ہو گئے تو قریش مکہ نے وہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ انہوں نے اہلِ مدینہ پر (خواہ وہ بنو اوس تھے خواہ بنو خزرج، اور خواہ مختلف قبائل میں منقسم یہودی) بار بار دباؤ ڈالا کہ وہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینے میں نہ ٹھہرنے دیں۔ ان کی یہ کوششیں کھلے بندوں بھی جاری رہیں اور خفیہ سازشوں کی شکل میں بھی۔

بہر حال قریش مکہ کا ایک قافلۂ تجارت جس کے تحویلدار ابوسفیان تھے، اس غزوے کا فوری سبب بن گیا۔ قریش مکہ تک یہ افواہ پہنچی کہ مسلمان ابوسفیان کے اس قافلے کو لوٹنے والے ہیں لہٰذا اے قوم قریش جلد پہنچو۔ اس تجارتی قافلہ میں ہر قبیلہ کا کچھ نہ کچھ حصہ تھا، علاوہ ازیں اسلام کے خلاف بغض پہلے سے بھی دلوں میں جاگزیں تھا۔ چنانچہ قریش محض اپنے تجارتی قافلے ہی کے تحفظ کے خیال سے نہیں بلکہ مسلمانوں کو نابود کر دینے کی نیت سے پوری طرح تیار ہو کر نکلے تھے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو غزوے سے قبل جب انہیں پتہ چل گیا تھا کہ ان کا قافلہ بسلامت چلا گیا ہے تو وہ مکے کو لوٹ جاتے۔ نہیں وہ مسلمانوں کا خاتمہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینے سے نکلے تو آپ کو پتہ تھا کہ کس قوت کے خلاف نبرد آزما ہونے جا رہے ہیں۔ یہ خیال درست نہیں کہ آپ تین سو سے کچھ متجاوز تعداد میں اپنے جانثاروں کو لے کر ان قافلے والوں سے لڑنے چلے تھے جن کی تعداد چالیس کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ چالیس آدمیوں کی خاطر تین سو سے متجاوز افراد کی جمعیت کی ضرورت کہاں تھی؟ زیادہ سے زیادہ چالیس پچاس کی جمعیت مدینے سے جا کے انہیں ہراساں کر سکتی تھی۔

اب اصل بات کی جانب آتا ہوں۔ اس میدان بدر میں جمع ہونے والے دو عساکر کی تشکیل اور تکوین میں بڑا فرق تھا۔ ایک جانب قریش کے قبائل کی چیدہ جمعیت تھی اور دوسری طرف تقریباً اڑھائی سو باشندگانِ مدینہ تھے۔ جو قریشی نہ تھے۔ اُن اڑھائی سو کے روحانی اور دینی بھائی تقریباً ستر مہاجرین قریش تھے۔ ان مہاجرین میں حضرت بلالؓ بھی شامل تھے۔ مسلمانوں کی کل تعداد تین سو دس، تین سو تیرہ اور تین سو سترہ بتائی جاتی ہے۔ بہر حال وہ تین سو نے زیادہ اور سوا تین سو سے کم تھے۔

Marfat.com

مکہ والوں کو مدینہ والوں سے کوئی پُرخاش نہ تھی۔ اُس دور کے اعتبار سے دونوں بستیوں کے مابین بڑا فاصلہ تھا۔ کوئی باضابطہ علاقائی حکومت نہ مکے میں تھی اور نہ مدینے میں کہ حکومتی سطح پر توسیعی ہوس کے باعث ٹکراؤ ہو جاتا۔ مکے اور مدینے والوں کے مابین کوئی طبقاتی کشمکش بھی نہ تھی۔ مکے والے مدنی قبائل کا کوئی استحصال نہیں کر رہے تھے۔ پھر مدینے والوں کی اتنی بڑی تعداد قریش مکہ سے لڑنے کے لیے کیوں چل دی۔ وہ مہاجرین سے تین گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ تھے۔ سیدھی سی بات ہے کہ مسئلہ مقامی اور مہاجر کا نہ تھا۔ مسئلہ قریش اور غیر قریش کا نہ تھا۔ مسئلہ مکی اور مدنی کا نہ تھا۔ مسئلہ حق اور باطل، کفر اور اسلام، نور اور ظلمت کا تھا۔ مدینے سے نکلنے والی جمعیت ملّتِ اسلامیہ اور امتِ رسول مقبول تھی۔

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ابوسفیان کی مکہ پر چڑھائی کی خبر پہنچنے پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحابؓ سے مشورہ فرمایا۔ حضرت ابوبکرؓ نے بات کی۔ آپؐ نے توجہ نہ فرمائی۔ پھر حضرت عمرؓ نے بات کی۔ آپؐ نے توجہ نہ فرمائی۔ اس پر سردار انصار مدینہ حضرت سعد بن عبادہؓ بولے اور عرض کیا: شاید حضور کا اشارہ میری ہی جانب ہے تو میری عرض یہ ہے کہ آپ ہمیں حکم دیں کہ سمندر میں کود جاؤ۔ ہم سمندر میں کود جائیں گے۔ حکم ہو تو ہم سینے سے جگر کے ٹکڑے نکال کر دور پھینک دیں گے۔ ایک اور روایت یہ ہے کہ اسی موقع پر حضورؐ کے اصحاب نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ ہم وہ لوگ نہیں جنہوں نے اپنے پیغمبر سے کہا تھا: ''تم اور تمہارا خدا جا کے لڑ لیں۔ ہم تو یہ بیٹھے ہیں''۔

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میدانِ بدر میں پہنچے تو پتہ چلا کہ لشکر کفار میں ابوسفیان شامل نہیں۔ اس لشکر کی سرداری عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور امیہ بن خلف کے ہاتھ میں ہے اور ابو جہل سب سے زیادہ پُرجوش ہے۔

یہاں ایک بات کی جانب توجہ بہت ضروری ہے وہ یہ کہ عہدِ جاہلیت کے صحرائی عربوں میں کوئی منضبط حکومت نہ تھی۔ قبائلی نظام تھا اور گروہی نقطہ نظر۔ جسے عصبیت کہا جاتا تھا۔ یہ عصبیت وہ اساسی جذبہ تھا جس پر قبائلی زندگی کا انحصار تھا۔ چنانچہ اپنے قبیلے اور اپنے عصبہ کے افراد کو جن سے وہ دس پشت کہیں اوپر جا کے ہم جد ہوتے تھے، اپنے چچازاد بھائی ہی کہتے تھے۔ ان لوگوں کا معیارِ خیر و شر بین القبائلی معاملات میں یہ تھا کہ اپنے قبیلہ کے ہر فرد کی بات صحیح اور قصور فقط دوسرے قبیلے

Marfat.com

والے کا۔

شدید خاندانی تعصب رکھنے والے ان عربوں کو جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم اخوت دی، انہیں دینی برادری اور روحانی دوستی کے مفہوم سے سرشار فرمایا تو وہ خود اپنے ہی قریب ترین عزیزوں کے مقابل صف آرا ہو گئے۔ خود بھی انہیں قتل کیا، قید کیا اور دوسرے کے ہاتھوں بھی انہیں قتل ہوتے اور اسیر بنتے دیکھا۔ اس لیے کہ اسلام کے رشتے نے اپنے اور غیر کا مفہوم ہی بدل دیا تھا۔ اگر قریب ترین رشتہ دار مسلمان نہیں تو وہ بیگانہ۔ اور اگر حبشہ سے آنے والا کوئی فرد مسلمان ہے تو وہ اپنا۔

اب ان دو مخالف صفوں کی کیفیت عجیب تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف تھے اور ان کے حقیقی چچا عباس دوسری طرف نیز چچازاد بھائی عقیل دوسری طرف۔ داماد ابوالعاص بن ربیعہ (حضرت زینبؓ کے خاوند) دوسری طرف حضرت عمرؓ، ایک طرف ان کا حقیقی ماموں دوسری طرف اور وہ ماموں خود حضرت عمرؓ کے ہاتھوں ہی قتل ہوا۔ حضرت علیؓ ایک طرف اور حقیقی محسن چچا عباس اور حقیقی بھائی عقیل دوسری طرف۔ حضرت ابوحذیفہؓ ایک طرف اور ان کے والد عتبہ بن ربیعہ دوسری طرف، حضرت ابوعبیدہؓ ایک طرف اور ان کے والد جراح دوسری طرف، حضرت حکم بن سعید بن العاص ایک طرف اور ان کا بھائی عبیدہ بن سعید بن عاص دوسری طرف۔ یہ عبیدہ سرتا پا لوہے میں غرق تھا۔ حضرت زبیرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبیدہ کی آنکھ میں نیزا مارا اور اسے مار گرایا۔ اور ہاں حضرت ابوبکر صدیقؓ ایک طرف اور ان کے حقیقی فرزند عبدالرحمٰن دوسری طرف۔ اور پھر ان قریشی اصحابِ رسولؐ کے علاوہ حضرت بلال حبشی اور انصاری حضرات رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ بالفاظِ دیگر امت اور ملّت ایک طرف تھی اور قوم دوسری طرف۔ روح ایک طرف تھی، خون دوسری طرف۔ حضرت فاروق اعظمؓ کا ارشاد ہے: ''قرابت خون ہے اور قرب روح۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے''۔ وہاں قرابت یعنی خونی رشتہ داری کو روحانی قرب پر قربان کر دیا گیا تھا۔

اب ذرا سوچیے! جو رشتے اوپر بیان ہوئے کیا ان سے قریب تر بھی کوئی رشتہ ہے۔ باپ، بیٹا، بھائی، چچا بھتیجا، ماموں بھانجا، سسر اور داماد۔ تو یہ سب رشتے دینی اور روحانی رشتوں پر وار دیے گئے۔

Marfat.com

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے بقول دونوخیز انصاری ابوجہل سردار قریش پر جھپٹ پڑے۔ اوراس کوخاک وخون میں لتھیڑ دیا۔ اس لیے کہ ابوجہل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ ان انصاری بچوں کوابوجہل سے کسی قسم کا کوئی ادنیٰ انتقام تک نہ لینا تھا۔ ابوجہل نے ان کی صلاحیت یا ان کے قبیلے کے حقوق کا کوئی استحصال نہ کیا تھا۔ مہاجرین قریش نے یہ بھی دیکھا کہ ایک مختصر سا انصاری شخص ہے جو عباس بن مطلب جیسے عالی شان سردار قریش کو اسیر کر کے لا رہا ہے۔ اس ابوالنصیر کے مقابل عباس بن مطلب کی قوت کا عالم یہ تھا کہ ایک روایت کی رو سے عباس تو ابوالنصیر کو اٹھا کے ہتھیلی پر رکھ سکتے تھے۔

المختصر غزوۂ بدر کا سب سے بڑا درس یہ ہے کہ امت مسلمہ ایک دینی، روحانی، اصولی اور نظریاتی برادری ہے۔ اس کی اساس نہ وطن ہے نہ خون، نہ نسل نہ دولت، نہ اقتدار نہ زبان بس ایک بات اور پکی بات **قل آمنت باللّٰہ ثم استقم**۔ ''کہہ میں ایمان لایا اور پھر اپنے کہے پر پکا ہو جا''۔

آج وہ لوگ جو اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتے ہیں اور حج بھی کیے ہوئے ہیں، نمازیں بھی پڑھتے ہیں، وضع بھی اور انداز بھی مسلمانوں کے سے ہیں مگر اس کے باوصف کبھی زبان کی عصبیت کو ہوا دیتے ہیں، کبھی علاقائی جذبات ابھارتے ہیں، کبھی اسلامی اداروں کے انہدام کے درپے ہیں اور کبھی اسلامی وحدت کے تصور کو مضحکہ خیز جانتے ہیں۔ خدارا اپنے آپ سے سوال کریں کہ وہ کہاں کھڑے ہیں؟ کیا فقط ان کی زبان مسلمان ہے؟ کیا ان کا وہ دل مسلمان نہیں جو سینے میں ہے؟ اللہ دلوں کو دیکھتا ہے، زبان کا قول تصدیق قلب کے بغیر بے معنی ہے۔ اگر اللہ پر ایمان لانا پکی بات ہے تو پھر مومن کا دوسرے مومن سے عزیز ترین رشتہ فقط دین اسلام کے حوالے سے ہے۔ اگر دیگر کوئی رشتہ اسلام سے متصادم ہے تو غزوۂ بدر کا فیصلہ یہ ہے کہ ایسا ہر رشتہ اسلام کے رشتہ پر قربان کیا گیا ہے۔

Marfat.com

سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

عیدالاضحیٰ ہر سال آتی ہے اور ہر سال کچھ یاد دلاتی ہے۔ وہ سبق اور یاد دہانی یہ ہے کہ اللہ سے محبت کرنے والا اللہ کی محبت پر سب کچھ نچھاور کر دیتا ہے۔ وطن چھوڑنا پڑے تو چھوڑ دیتا ہے۔ عزیزوں کو ترک کرنا پڑے تو کر دیتا ہے۔ اولاد تک کو حق کی راہ میں قربان کرنا پڑے تو کر دیتا ہے اور اگر خود اپنی جان کو بھی نچھاور کرنے کی ضرورت پڑے تو بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کود جاتا ہے۔

ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ ایمان و عشق کا مرحلہ امتحان پیش آئے تو مردِ مومن مول تول نہیں کرتا وہ مادی مفاد کو نہیں دیکھتا، عشق کا جذبہ اور اس کا اظہار مادی میزان سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ حضرت ابراہیمؑ مشاہدۂ کائنات کرتے ہوئے خدا تک پہنچے تھے۔ ستارے، مہتاب اور آفتاب کو زوال پذیر پایا اور اس تک رسائی حاصل کی جو لازوال ہے۔ یہ علم کی راہ تھی، مگر علم کی راہ جب عشق کی منزل سے جا کر مل جائے تو سوچ کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ علم تلاش اور جستجو کا نام ہے۔ یہ جاننے اور پہچاننے کی اہلیت و صلاحیت کا نام ہے مگر عشق فرمان کی تعمیل ہے اور بس۔ وہاں علم و عقل دخل نہیں دیتے ورنہ حضرت ابراہیمؑ نہ آگ میں کود جاتے اور نہ فرزند نونہال کی گردن پر چھری رکھ دیتے۔

اس عید سے ایک سبق ہمیں اور بھی ملتا ہے مگر اس سبق کی جانب ہماری توجہ بہت کم مبذول کی جاتی ہے، وہ ہے حضرت اسماعیلؑ کا اپنی گردن پیش کر دینا، حضرت ابراہیمؑ کا ایمان تو روز بروز محکم ہوتا جا رہا تھا۔ اب تو فقط یہ آزمایا جانا باقی تھا کہ آیا وہ اولاد کو بھی جو خود جان سے عزیز تر ہوتی ہے محبوب کے اشارے پر قربان کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اشارے پر اس لیے کہا ہے کہ یہ حکم نہ تھا۔ حضرت جبریل نے از روئے وحی یہ پیغام نہیں دیا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے تو صرف خواب دیکھا تھا۔ جب وہ خواب دوسری اور تیسری بار بھی دیکھا تو اسے ایمائے محبوب جانا اور پھر جان سے عزیز تر تحفہ بھی بحضور خداوندی بصد خلوص و رغبت پیش کر دیا۔ تاہم حضرت ابراہیمؑ اس مرحلے سے قبل

Marfat.com

اللہ کی رحمت کو آزما چکے تھے مگر حضرت اسمٰعیل تو معصوم تھے۔انہوں نے کیا جان کے گردن جھکا دی اور کیا سمجھ کے جان دینے پر آمادہ ہو گئے!

علامہ اقبال نے اس نکتے پر بالفاظِ ذیل استفسار فرمایا ہے:

وہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

یہ شعر بظاہر استفسار ہے۔ درحقیقت جواب ہے اور جواب یہ ہے کہ علم سے فقط معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔علم سے ایمان و ایقان حاصل نہیں ہوتا۔حضرت اسمٰعیلؑ نے صاحبِ ایمان و ایقان ہونے کا ثبوت دیا اور یہ دولت کتابوں سے کم ہی حاصل ہوتی ہے۔ یہ دولت تو مثال ہی کی بدولت میسر آتی ہے۔ جب حکم دینے والا صاحبِ ایمان ہو، صاحبِ ایثار ہو، عاشقِ الٰہی ہو تو اس کے الفاظ ٹالے نہیں جا سکتے۔ وہاں خوشی کے ساتھ تعمیل جلوہ دکھاتی ہے مگر جہاں ایثار کا حکم دینے والا خود بے آداب ہو، خود بے ایثار اور دنیا پرست ہو وہاں خوشی سے تعمیل نہیں کی جاتی۔ بصورت دیگر لالچ کے باعث تعمیل کی صورت پیدا ہو گی یا خوف و سزا کے سبب سے تعمیل ظہور میں آئے گی۔ مطلب یہ کہ وہ احکام جو کسی غیر مخلص شخص کے منہ سے نکلیں انہیں خوشی سے تسلیم نہیں کیا جاتا اور ان کو برضا و رغبت قبول نہیں کیا جاتا۔لہٰذا ایسے اشخاص جبر کا ڈنڈا پھیرتے ہیں۔ چنانچہ تعمیل حکم مجبوری کا مظہر ہوتی ہے اور ناگواری و بیزاری کی تصویر! اس کے برعکس حکم دینے والا اگر صاحبِ کردار اور صادق القول فرد ہو تو اس کے قلب کی صفائی اس کی نظروں میں سے جھانکتی ہے۔ایسے فرد کو تو زبان بھی نہیں ہلانا پڑتی۔اس کا اشارۂ چشم کافی ہو رہتا ہے۔اسی لیے تو بزرگانِ امت میں ایک کا قول ہے: **من لم ینفعك لحظه لم ینفعك لفظه.** (جس شخص کی نگاہ تمہیں نفع نہیں پہنچاتی اس کی زبان سے بھی کوئی فائدہ حاصل نہ ہو گا۔) تو اے اہلِ دل یہ حضرت ابراہیمؑ کا حسنِ کردار تھا جو حسنِ ایمان پر استوار تھا۔جس نے حضرت اسمٰعیل کو برضا و رغبت گردن جھکا دینے اور موت کو گلے لگا لینے پر تیار کر لیا تھا۔غالب کا شعر ذیل خواہ اپنے اصل سیاق و سباق کی رُو سے کہیں بھی منطبق ہوا ہو بہر حال ایک روشن سبق عطا کرتا ہے۔

فرزند زیز تیغِ پدر می نہد گلو
گر خود پدر در آتش نمرود می رود

Marfat.com

مطلب یہ ہے کہ اس باپ کا فرزند چھری کے نیچے ضرور گردن رکھ دیتا ہے جو خود آتش نمرود میں کود گیا۔ غالب اور اقبال کا یہ اشارہ بڑا خوبصورت تجزیہ ہے اس امر کا کہ ایمان کے استحکام اور قول و فعل کی یگانگت جس شخصیت کو تعمیر کرتی ہے اس شخصیت کی نگاہ میں، ادا میں اور زبان میں بھرپور اثر ہوتا ہے لہٰذا جو باپ خود سگار منہ میں لٹکائے ہوئے ہو مگر بیٹے کو سگریٹ نوشی سے منع کرتا ہو اسے اس نکتے پر غور کر لینا چاہیے۔ جو استاد خود ایمان فروش ہو اور شاگردوں کو درس خودداری دیتا ہو اسے بھی اس نکتے کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ اسی طرح ہر افسر، حاکم اور پولیس کو بھی یہ باریک رمز سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

خطیبوں کے خطبے کیوں ضائع جا رہے ہیں؟ ماں باپ کی تلقین کیوں برباد ہو رہی ہے؟ اساتذہ کی نصیحت کیوں دلوں میں راسخ نہیں ہوتی؟ اہلِ سیاست کے اقوال و ارشادات کیوں اِس کان سے سن کر اُس کان سے اڑا دیے جاتے ہیں؟

عیدالاضحیٰ کی خوشیوں میں اس سبق کو نظر انداز مت کیجیے اس لیے کہ یہ عید ہمیں یہی سبق یاد دلاتی ہے اور عبرت سکھاتی ہے۔

Marfat.com

عصبیت :- کسی ناجائز معاملے میں اپنی قوم کی مدد کرنا

معرکۂ بدر

تاریخ اسلام میں معرکۂ بدر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مگر میں اس کے فقط ایک پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ اس معرکے نے خون کے جملہ رشتوں کو روح پر قربان کر دیا۔ اس معرکے نے ''ملّت'' کے تصور کی عملاً تشریح کر دی۔

ہمیں معلوم ہے کہ عرب کی عمومی زندگی قبائلی تھی اور قبائلی زندگی کی محکم ترین رگ عصبیت ہوتی ہے۔ یہی باعث ہے کہ عرب بیس بیس پشت اوپر جا کر ہم نسب ہو جانے والے کو ''بنوعم'' ہی کہا کرتے تھے۔ ان کے قبیلے کا ہر فرد خواہ چھوٹا ہوتا خواہ بڑا، ایک دوسرے کی نگاہوں میں یکساں اہمیت کا حامل ہوتا تھا۔ اس لیے کہ قبیلے کی ہستی جملہ افراد کے اتحاد پر مبنی ہوتی تھی۔ کوئی بھی اپنا شخص جو کسی غیر کے ہاتھوں مارا جاتا ایسا نہ ہوتا جس کا خون رائیگاں جانے دیا جاتا۔ ان کا تصور یہ تھا کہ جس مقتول کا انتقام نہ لیا جائے اس کی روح بے قرار رہتی ہے۔ علاوہ ازیں قصاص کا نہ لیا جانا ایک بہت بڑی توہین اور ذلت بھی تھی۔

مگر اس جاہلی عصبیت کو اسلام نے منقلب کر دیا۔ جاہلی خونی عصبیت کو اب ملّی اور روحانی رنگ عطا ہو گیا۔ معرکۂ بدر نے بتا دیا کہ اسلامی معاشرے کی بنیادی صفت اس کی روحانی اساس ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کا قول ہے: القرب روح والقرابة دم وشتان ما بینهما (قرب روح ہے اور قرابت خون، دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔) اس معرکے نے روحانی قرب کے ہاتھوں خونی قرابت کو کٹوا کر رکھ دیا۔ یہ بہت بڑی آزمائش تھی مگر اصول کی روشن بنیاد رکھنے والوں نے حق کو سامنے رکھا اور باقی ہر لحاظ کو ہیچ جانا۔

قریش کی مدینہ شریف پر یورش بہت سے قریشی قبائل کا اجتماعی فعل تھا۔ یہ محض ہاشمیوں کی ہاشمیوں کے خلاف یا امویوں کی ہاشمیوں کے خلاف چڑھائی نہ تھی۔ یہ کسی بھی ایک قبیلے کی دوسرے قبیلے کے خلاف جنگی کارروائی نہ تھی۔ نہ علاقائی تعصب کارفرما تھا۔ نہ زبان کا جھگڑا تھا۔ فقط ایک بات تھی اور وہ یہ کہ باطل حق کے خلاف متحد ہو گیا تھا۔ دوسری طرف سے مہاجرین وانصار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک علم تلے نکلے۔ انصار اور مہاجرین کی باہمی دوستی نسلی،

Marfat.com

علاقائی اورلسانی یا کسی دیگر مادی اساس پر استوار نہ تھی۔انصار بہت سے عرب مدنی قبائل کے مسلم افراد کا اجتماعی لقب تھا۔انصار قبیلہ نہ تھے ملّت کی شاخ تھے۔وہ قریش مکہ کے خلاف محض اصول کی مدافعت میں صف آرا تھے۔کوئی اور جھگڑا نہ تھا۔مہاجرین کی آزمائش سخت تر تھی۔انہیں اپنے عزیزوں کے خلاف شمشیر بکف ہونا تھا۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدمقابل ان کے حقیقی چچا عباس اور اپنی لختِ جگر زینبؓ کے خاوند ابوالعاص تھے۔حضرت علیؓ اپنے چچا عباس کے علاوہ اپنے حقیقی بھائی عقیل کو مخالف صف میں دیکھ رہے تھے۔حضرت ابوبکر صدیقؓ ایک طرف تھے اور ان کے فرزند عبدالرحمٰن دوسری طرف۔حضرت عمرؓ ایک جانب تھے اور ان کے ماموں ابوالعاص بن ھشام بن مغیرہ دوسری جانب، حضرت حمزہ ایک جمعیت کے حامی تھے اور ان کے بھائی عباس اور بھتیجے عقیل دوسری جمعیت کے حامی۔اسی طرح حضرت مصعب بن عمیرؓ لشکر اسلام کے سالار تھے اور لشکر کفار کے ہوادار ان کے بزور ابوعزیز، حضرت ابوحذیفہ توحید پر گواہی دینے کو حاضر تھے اور ان کا حقیقی والد عتبہ لشکر کفار کا سپہ سالار تھا۔

اور پھر ہوا یہ کہ بہت سے عزیز، عزیزوں ہی کے ہاتھوں شہادت پا گئے۔یا موت کے گھاٹ اتر گئے۔معرکہ بدر سے بڑھ کر ''ملّت'' کا درس اور کون سا واقعہ دے سکتا ہے۔اصول پرستوں کے اتحاد کا نام ''ملّت'' ہے اور بس، اور اصول کی راہ میں وطن، رشتہ داری، املاک، زبان غرض کوئی اور لحاظ حائل نہیں ہوتا۔مہاجرین قریش نے ہجرت کر کے اصول کی خاطر وطن، قبیلہ اور املاک پہلے ہی ترک کر دی تھیں اور جب خونی رشتے اصول کو فنا کرنے پر تل گئے تو انہوں نے ان کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہ دی۔آخر باپ، بیٹا، بھائی، چچا، ماموں، بھتیجا، بھانجا اور داماد سے بڑھ کر مردوں کے مردوں سے کیا رشتے ہو سکتے ہیں۔ان تمام رشتوں کے لحاظ کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا گیا۔

گویا بدر کا سب سے بڑا درس یہ ہے کہ ''ملّت'' ایک روحانی اور اصولی رشتے کا نام ہے اور اسلام کی اصل اساس یہی عقیدہ ہے۔علاقائی، لسانی، خونی اور دیگر جملہ مادی اعتبارات ملّت پر قربان کر دینا ہی ایمان کی روشن ترین علامت و دلیل ہے۔جو لوگ ''ملّت'' کے مقابلے میں نسب، رنگ، علاقوں اور زبانوں کے تعصبات کو ترجیح دیتے ہیں وہ فقط یہی نہیں کہ ملّت کے مفہوم سے ناواقف ہیں بلکہ شرک و بت پرستی کے مرتکب ہیں۔مگر اسلام کے نام لیوا آخر کس راہ پر گامزن ہیں۔ان کی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے اسی ہمہ وطنی، ہمہ قومی، ہمہ لسانی رنگِ بے رنگ کی ضرورت ہے۔اور اس راہ کے سالک کی معرکۂ بدر نہایت صحیح رہبری کرتا ہے۔

Marfat.com

سامان اور صولتِ ایمان

جنگ ستمبر جاری ہے تاہم تمام کام معمول کے مطابق ہو رہے ہیں۔ فائٹر طیارے فضا میں محوِ پیکار ہیں اور مرد و زن محوِ تماشا ہیں۔ کون ان مناظر کو دیکھ کر یقین کرے گا، کیا وہ مان لے گا کہ یہ قوم زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی ہے؟ ذالک فضل اللہ۔

جس کام کا انجام نیک مقصود ہو اللہ تعالیٰ یہاں اس کا آغاز بھی غلط نہیں ہونے دیتے۔ میں کہتا ہوں وہ لمحہ الہامی لمحہ تھا جس دن کے ساڑھے گیارہ بجے صدر مملکت پاکستان نے اعلان جنگ کیا۔ میں اس وقت جے سی او میس تھا۔ صدر کے منہ سے دورانِ خطاب اچانک کلمہ طیبہ نکلا ''لا الہٰ الا اللہ محمد رسول اللہ''۔ یہ خالص عنایت ایزدی تھی۔ اس وقت میس میں بہت سے جے سی او اور چند آفیسر موجود تھے۔ کلمہ طیبہ کا سننا تھا کہ سبھی بیٹھے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چہروں پر جلال دمکنے لگا۔ آنکھیں چھلکنے لگیں۔ صاحب صدر کے خطاب کے بعد ہر ایک کی زبان پر تقریباً ایک ہی جیسا کلمہ تھا ''اگر معاملہ لا الہ پر مبنی ہے تو پھر غم کیسا''؟ حد ہے لا الہ نے سننے والوں کے تنوں میں بجلی دوڑا دی تھی اور دلوں کو گرما دیا تھا۔ فوجی ہی نہیں غیر فوجی بھی جو ملا اور جس سے بات ہوئی اس نے کلمہ طیبہ کا ذکر ضرور کیا اور کہا یہ کہ اللہ نے اپنی عنایت سے صدر مملکت اسلامیہ کے منہ سے اس موقع پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ نکلوایا ہے۔ یہ نیک شگون ہے۔ یہ فتح کی خوشخبری ہے ورنہ صدر مملکت سیکولر قسم کی ڈینگیں مار کر بھی اعلان جنگ کر سکتے تھے۔

پاکستان لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے کلمے نے بنایا تھا۔ وہی کلمہ اس کے دفاع کا ضامن ہو گیا۔ اس کے سوا اور کوئی صورت نہ تھی۔ خالص سرزمین کا واسطہ یا جنگجو ذاتوں اور برادریوں کا واسطہ، اپنی دکانوں اور ملوں کا واسطہ، مزدوروں اور کسانوں کا واسطہ کوئی کام نہ دیتا۔ قرآن کا فیصلہ برحق ہے کہ کلمة اللہ ھی العلیا (کلمۂ الٰہی کا بول سب سے بالا ہے)

اب ۲۴ ستمبر کا ایک رنگ پیش کرتا ہوں۔ جنگ بند ہو چکی ہے۔ ایک دوست مجھے راولپنڈی کے ایک محلے میں لے گئے۔ وہاں ایک میجر صاحب شہید ہو گئے تھے وہ دوست ان کے گھر والوں

Marfat.com

سے تعزیت کرنا چاہتے تھے۔ جب ہم اس شہید کے مکان پر پہنچے تو دروازے پر بارہ برس کا ایک خوبرو لڑکا بڑے اطمینان سے کھڑا پایا۔ وہ شہید میجر صاحب کا فرزند تھا۔ میرے دوست نے اسے گلے لگایا اور کہا: گھر میں اطلاع دے دیں کہ یوسف صاحب آئے ہیں۔ وہ بولا: گھر میں کوئی نہیں، ساتھ والے محلے میں ابا جان کے ایک دوست جو کپتان تھے شہید ہو گئے اور ہمارے گھر والے ابھی ابھی ان کے یہاں چلے گئے ہیں۔ اکیلا میں یہاں ہوں اور ''گارڈ'' ڈیوٹی دے رہا ہوں۔ یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔ فوجی افسر کا بیٹا اور شہید کا فرزند..... یہ رنگ دیکھ کر میرے آنسو نکل آئے۔ میں نے کہا: شاباش بیٹا! ڈٹے رہو۔ بہادر باپ کی طرح بہادر بنو۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ خدا کی رحمت کا سایہ باپ کی شفقت کا سایہ بن جائے گا۔ لڑکے نے جواب دیا: ''میں تو اتنا بڑا ہو گیا ہوں۔ میرے ابا جان میری بارہ برس پرورش کر کے مجھ سے جدا ہوئے ہیں مگر ہمارے رسولؐ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے کہ ان کے ابا جان کا انتقال ہو گیا تھا''۔ سبحان اللہ۔ لائق صد تبریک ہیں وہ گھرانے جنہوں نے اپنے بچوں کو اس انداز سے تربیت دے رکھی ہے۔ یہ جواب میرے لیے غیر متوقع تھا مگر نہایت خطرناک حد تک حوصلہ افزا تھا۔ اگر قوم کے بچوں کے دلوں میں روحِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہے تو پھر انہیں دنیا کی کوئی طاقت بھی نہیں ڈرا سکتی۔ ہمیں جنگ کے دوران میں باہر سے بھی مدد ملی تھی۔ بیرونی دوستوں نے بھرپور اعانت کی تھی مادی بھی اور اخلاقی بھی۔ مگر اس ہر اعانت و حوصلہ افزائی کی حیثیت ثانوی سے بھی کمتر تھی اس لیے کہ اگر ہم خود حوصلہ ہار دیتے، محاذ خالی چھوڑ کر بھاگ گئے ہوتے تو ہمارے دوست اور ان کا بھیجا ہوا مال یا وعدۂ مال کیا کمال کر دکھاتا؟ پوری قوم کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنانے والی شے اسلام تھا۔ وہ نعرۂ تکبیر تھا، وہ کلمہ طیبہ تھا، وہ صحیح معنوں میں روحِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھی۔ اس روح کو مزید تقویت دینے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ وہی قوم کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اگر سینہ روحِ جہاد سے خالی ہو تو اسلحہ سے بھرے ہوئے صحرائے سینا سے کیا سُود؟

ساماں کے ساتھ صولتِ ایماں بھی ہے ضرور
بے فائدہ ہے دستِ قوی دل ہو گر ضعیف

Marfat.com

اپنی ذات سے فرار کیوں؟

شاہ صاحب سے میں نے پوچھا: کل آپ سائیکل پر تیز تیز جا رہے تھے، سخت لُو چل رہی تھی، گھر سے نکلنے کی آپ نے کیونکر ہمت کی۔ بازار بے رونق اور سڑکیں ویران، خیریت تھی؟ مجھے آپ کو دیکھ کر پریشانی سی لاحق ہوگئی۔ پھر یہ کہ آپ کے پاس کار بھی ہے، سکوٹر بھی، اگر جلدی کا کوئی دھندا تھا تو کار یا سکوٹر کو کام میں لاتے؟ نہ کہ سائیکل پر زور صرف فرماتے۔ قصہ کیا تھا؟

شاہ صاحب نے فرمایا: بس اپنے ہاتھوں سزایاب ہونے کی ایک کوشش تھی۔ میں مزید پریشان ہوا لہٰذا پوچھا: مطلب؟ بولے: مطلب وطلب کیا، بھئی دفتر سے گھر پہنچا، تھکا ماندہ تھا، نہایا، کھانا کھایا اور حسبِ معمول اپنے کمرے میں آرام کرنے کے خیال سے چلا گیا۔ نیند نہ آئی۔ ریڈیو سننا چاہا۔ بات نہ بنی۔ نغموں کے ٹیپ لگائے جی نہ بہلا۔ ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب اٹھائی۔ طبیعت مطالعہ کی طرف راغب نہ پائی۔ یہ کتاب بھی پھینک دی۔ وہ بھی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کسی غزل کی تیاری میں محو ہونا چاہا۔ طبیعت قائل نہ ہوئی۔ کیا کروں، تنہائی کو بہلانے کا کوئی بھی میسر وسیلہ سازگار ثابت نہ ہوا۔ آخر تنگ آ کے فیلٹ سر پر رکھی، سائیکل اٹھائی اور سڑک سوار ہو گیا۔

میں نے پوچھا: رخ کدھر کا تھا؟ کوئی سنیما گھر مقصود تھا؟ بولے: نہیں، میں نے اخبار میں سنیما گھروں کے اشتہار بھی دیکھ ڈالے تھے۔ کوئی پکچر پُرکشش نہ محسوس ہوئی۔ میں نے پھر پوچھا: آخر آپ جا کہاں رہے تھے ضرور کسی تاش یا شطرنج والے دوست کو جا پکڑا ہوگا۔ بولے: نہیں بھائی میں ہر شوق سے خالی اور ہر ذوق سے عاری سا ہو گیا تھا۔ بالکل کھوکھلا، یک قلم برباد، سائیکل تو دلِ وحشی نے تجویز کی تھی۔ میں نے تجویز پسند کی چنانچہ کئی سڑکوں پر دو گھنٹے تک بے مقصد سائیکل چلائی اور غصے کے عالم میں چلائی لہٰذا وہ بہت تیز چلی۔ پچیس میل سے کم تو سفر طے نہیں کیا ہوگا۔ جب اچھی طرح تھک، ٹوٹ گیا تو گھر کی راہ لی۔

حق یہ ہے کہ مجھے شاہ صاحب پر بڑا رحم آیا۔ شاہ صاحب کو خوشی کے ظاہر وسائل کثیر تعداد

Marfat.com

میں حاصل ہیں۔حلقۂ دوستی بھی وسیع ہے مگر میں جانتا ہوں کہ ان کو وحشت کے یہ دورے پڑتے رہتے ہیں۔اپنے آپ سے اتنی دوری؟ تنہائی سے گھبرا کے گھر چھوڑنے اور بھاگ اٹھنے والے لوگ وہی ہیں جو اپنا سامنا نہیں کر سکتے۔جونہی اپنی ذات سے پالا پڑا گویا کسی بھیانک ماحول اور جان لیوا منظر سے واسطہ پڑ گیا۔

میں نے کئی بار سوچا ہے کیا مادی مسرت کے ذرائع واقعی دل کو بہلائے رکھنے کی صلاحیت کے مالک ہیں؟ فلسفی کرکے گارنے نیرو کی اس بے بسی کا بڑی دردمندی سے ذکر کیا ہے۔وہ کہتا ہے کہ اس نے وزرائے نشاط مقرر کر رکھے تھے جو حصولِ مسرت کے باب میں اختراع و جستجو سے کام لیتے، نئے نئے کھیل تماشے تجویز کرتے، مگر وہ لمحات گزر جاتے، اور اپنے پیچھے شدید اداسی چھوڑ جاتے۔حتیٰ کہ بات شہرِ روم کو جلا کر تماشا دیکھنے تک پہنچی۔دھواں پھیلا۔پھر شعلے چھا گئے۔ لوگ بھاگے، چیخے، گرے، مرے، واہ واہ کیا نظارہ ہے بس مزا آ گیا۔خوشی کی بانسری بجی۔مگر روم کو جلانے والی آگ کو دوام کی دولت نہیں ملی تھی۔شعلے بجھتے گئے اور اداسی کے سائے بڑھتے گئے۔ نیرو کے لیے پھر وہی مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ اب کیا کیا جائے۔خوشی کی اور کون سی صورت باقی رہ گئی ہے۔بلند شعلوں نے اپنے پیچھے شہر کی راکھ چھوڑی اور نیرو کے دل میں گہری ٹھنڈی آہیں۔اپنے آپ سے بھاگ کے نیرو کہاں جاتا؟ کرکے گار کہتا ہے نیرو ہمارا ہی خون ہے، ہمارا ہی گوشت پوست ہے۔مطلب ہے ہم میں سے ہر آدمی اپنی لذت یابی کی حدود کے مطابق اداس اور ویران ہے۔تنہا ہے اور وحشی، کوئی بانسری کام نہیں دیتی۔نغمہ کام نہیں دیتا، کوئی نہیں لبھاتا، کوئی مصاحبت اور قربت تسلی کا باعث نہیں بنتی۔ہمارے شاہ صاحب بھی اس روز نیرو ہی کا ایک روپ تھے۔فرق اتنا تھا کہ روم ان کے قبضے میں نہ تھا۔ان کے قبضے میں اپنا شہرِ جسم تھا اسے انہوں نے دھوپ اور لو میں خوب جلایا۔

مجھے شاہ صاحب کی بے بسی پر بہت ترس آیا۔اب میری نظریں اصل صورت حال سے آگاہ ہوئیں۔ورنہ میں انہیں اپنے مقابل بدرجہا خوش حال تر سمجھا کرتا تھا۔پتہ چلا کہ وہ مادی وسائل تو رکھتے ہیں مگر خوش حال نہیں ہیں۔آدمی کی ظاہری حالت کو دیکھ کر خوشی اور غم کا اندازہ بخوبی نہیں لگایا جا سکتا۔ہمیں تاجِ زر نظر آتا ہے، دردِ سر دکھائی نہیں دیتا۔ہمیں خرقۂ درویشی نظر آتا ہے، اطمینانِ قلب دکھائی نہیں دیتا۔میں محسوس کیا کرتا تھا کہ شاہ صاحب کی رہائش میری رہائش کے مقابل

Marfat.com

بہت شاندار ہے۔ان کے ہاں وہ سامان جوضرورت کانہیں بلکہ شان کا اعلان ہوتا ہے بقدر فراواں تھا۔دل بہلاوے کے وسائل متعدد تھے۔لیکن اس سہ پہر کی روداد سن چکنے کے بعد معلوم ہوا کہ اللہ میاں یوں بھی کرتے ہیں کہ سامان کسی کو دے دیتے ہیں اور اطمینان کسی اور کو، ہر کرا این دہند آن نہ دہند، میر تقی میر نے اس صورتِ انتظام کو بے ربطی قرار دیا تھا۔

مے خانۂ ہستی ہے وہ بے ربط کہ اس میں!
ہووے ہے صراحی جو کہیں، جام کہیں ہو

گویا ساری خوشیاں اکٹھی نہیں ہوتیں۔

بہر حال ایک قسم ایسے افراد کی۔ہے جو اپنا سامنا نہیں کر سکتے۔خالص تنہائی اور فراغت کے لمحے انہیں کھانے کو دوڑتے ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ ان کی توجہ کو کوئی امر اپنی طرف کھینچے رکھے تا کہ اپنی ذات کی ملاقات کے عذاب سے محفوظ رہیں۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے کہ جن کو رفتہ رفتہ تنہائی لطف دینے لگتی ہے اور وہ اپنے من میں وہ لذت محسوس کرتے ہیں جو محفل میں میسر نہیں آتی۔حضرت علامہؒ نے فرمایا تھا:

بہ چشم کم مبیں تنہائیم را !!!
کہ من صد کارواں گل در کنارم

میری تنہائی کو بہ چشم حقارت نہ دیکھو۔سینکڑوں بہاریں میری بغل میں ہیں۔وہ لوگ جو اپنی ذات سے تعارف پیدا کر کے رفتہ رفتہ اپنے دوست آپ بن جاتے ہیں ان کی خوش حالی کے کیا کہنے۔دوسروں کی خوشی، ان کی خوش حالی، یہ افراد اپنے آپ سے دور ہوں تو گھبرانے لگتے ہیں۔ محفل میں بھی داؤ لگا کر اپنے من میں ڈوب جاتے ہیں مگر من کی ملاقات اور پھر ملاقات سے بڑھ کر دوستی آسانی سے ہاتھ نہیں لگتی۔یہ ریاضت ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ریاضت تو بعد کا قصہ ہے پہلے یہ تو پتہ چلے کہ من کی دوستی کی ضرورت اور حاجت کتنی شدید ہے۔نیرو کو کوئی اس طرف نہ لگا سکا ورنہ اسے وزرائے نشاط نہ مقرر کرنا پڑتے۔اصل خوشی روحانی ہے اور وہ دیر سے اور بڑی محنت و ریاضت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔وہ مرحلہ جو بزبانِ عرفی ''دستِ چمن گرفتہ بہ مسکن در آورم'' یعنی باغ کا ہاتھ پکڑ کے اسے اپنے بسیرے میں لا بٹھانا.....آتے آتے آتا ہے لیکن اس کے باب میں ایک بات بہر طور قابلِ اطمینان ہے کہ یہ عالم یا کیفیت ایک بار ہاتھ آجائے تو

Marfat.com

پھر جاتی نہیں۔علامہ اقبالؒ نے بھی تو یہی کہا تھا

دل کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں

ایسے ''دل یار'' یا ''من پریمی'' لوگوں میں سے ایک کو جانتا ہوں۔وہ ایک بڑے کاؤں یا یوں کہیے کہ ایک قصبے میں مقیم تھے۔دنیا پرست اور دھن پریمی اشخاص سے ملتے تو بے مزہ ہوتے، کہتے: یہ لوگ ملاقات فرماتے ہیں تو پھر دیر تک میرا من مجھ سے منہ موڑے رہتا ہے۔یہ دنیا والے، یہ منصب والے بڑے افتراقی اور فسادی لوگ ہیں۔رفتہ رفتہ حال یہ ہو گیا کہ انہوں نے اپنے کمرے کے باہر تالا ڈلوانا شروع کر دیا۔ایک چابی ملازم کے پاس ہوتی اور ایک خود ان کے اپنے پاس۔دروازے میں ایک سوراخ اتنا نکلوالیا تھا کہ جب کسی ایسے شخص کی آمد محسوس کرتے جو افتراقی نہ ہوتا یعنی ان کے اور ان کے من کے مابین افتراق پیدا نہ کرتا تو خود اندر سے آواز دے کر آنے والے کو روک لیتے اور سوراخ میں سے چابی پکڑا دیتے۔

من بدبودار، گندہ، کریہہ المنظر اور منحوس ہو تو فرار کے بغیر چارۂ کار نہیں ہوتا۔تنہائی بے سبب نہیں کاٹنے کو دوڑتی، افیون، چرس، شراب اور راکٹ وغیرہ سب خود فراریت کے اور اپنی ذات سے پناہ حاصل کرنے کے وسیلے ہیں حتیٰ کہ وہ مرحلہ بھی آجاتا ہے جب ہپّی مزاج لوگ اپنے انسانی روپ سے تنگ پڑ کر حیوانی اصل کی طرف لوٹنے کو ایک طریقِ گلوخلاصی جانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم فطرت کی جانب لوٹ رہے ہیں۔یہ نہیں کہتے کہ انسان بننا بس میں نہ تھا لہٰذا ہم حیوانیت کا آسرا لے رہے ہیں۔نتیجہ یہ کہ وہ لباس سے بھی نجات پانے کے خواہاں رہنے لگتے ہیں جو انہیں ظاہراً حیوانوں کے بجائے انسانوں سے قریب تر قرار دیتا ہے۔چنانچہ وہ شہروں میں ننگے بدن گھومنا چاہتے ہیں جس طرح ہردوار میں بندر، انہوں نے ذوقِ برہنگی کے نفاذ کی خاطر سوسائٹیاں بنالی ہیں جن کو Nude Societies کہتے ہی یعنی ناگا سبھائی۔مجالسِ برہنگی..... یہ کوئی مجذوب یا مخبوط لوگ نہیں۔یہ اپنی کوتاہ دانشی اور من کو دوست نہ بنا سکنے کے باعث اور اس طرح خود اعتمادی کی نایابی کے سبب سے حیوانی ماحول کی طرف بھاگتے ہیں یا حیوانی ماحول پیدا کر لیتے ہیں۔

انسانی وجود محض جسم نہیں، وہ محض روح بھی نہیں، دونوں کا امتزاج ہے اور یہ امتزاج ہر ذرۂ جسم اور ذرۂ خون میں موجود ہوتا ہے۔آدمی کے جسم کے لیے جس طرح مسرت، راحت اور قوت

Marfat.com

ضروری ہے اسی طرح کم از کم روح کو بھی یہ ضرورت لاحق رہتی ہے۔ وہ بھی قوت، مسرت اور اطمینان چاہتی ہے۔ مگر جسم کے پیمانے اور روح کے پیمانے ایک نہیں۔ روح کا رشتہ بہر حال اللہ سے ہے اور اللہ ہی کی محبت اور اللہ ہی کی یاد سے روح شاد اور آباد ہوتی ہے۔ آدمی کی فطرت میں ذوقِ عبادت شامل ہے۔ عبودیت بے عبادت نشو ونما نہیں پا سکتی۔ عبادت گمراہ ہو جائے، خدا کے تصور سے محروم ہو تو بت پوجنے لگتی ہے۔ سیارے معبود بن جاتے ہیں، درخت، سانپ اور گائے بھی، اسی طرح دیگر وجود۔ اور نہیں تو اپنے خاندان، قوم اور تاریخ کے اکابر کے بت پوجے جانے لگتے ہیں۔ ان کے ذریعے ذوقِ پرستش کی تسکین کے طالب رہتے ہیں۔

جو افراد اپنا سامنا نہیں کر سکتے وہ کتنے قابلِ رحم لوگ ہیں جن کو تنہائی کے لمحات بھیانک نظر آئیں وہ کس قدر محروم افراد ہیں۔ خدا کا ارشاد ہے جو ہمیں بھلا دیتے ہیں ہم ان سے ان کا اپنا آپ بھلوا دیتے ہیں۔ اس سے تو ظاہر ہے کہ آدمی کا اپنی ذات سے رابطہ خدا ہی کی معرفت پر استوار ہوتا ہے۔ جسے یہ رابطہ میسر ہو وہ تنہائی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ خلوت اسے مزا دیتی ہے۔ وہ تنہائی سے گھبرا کر بھیڑ بھاڑ میں پناہ تلاش نہیں کرتا۔ وہ کسی بھی مادی نشے کا محتاج نہیں ہوتا۔ مادی نشہ اس کی روحانی مستی کو نقصان پہنچاتا ہے۔ وہ حیوانیت کی جانب لوٹنے کا خواہاں نہیں ہوتا۔ ننگا پن اختیار نہیں کرتا۔ وہ ہپّی نہیں بن سکتا۔ وہ خودکشی کے منصوبے نہیں بناتا۔ وہ تو زندگی کو اللہ کی نعمت جانتا ہے لہٰذا ہر سانس کے شعور سے لذت یاب ہوتا ہے۔

Marfat.com

ہمارا تجارتی اخلاق

آج سے کوئی اٹھارہ انیس برس پہلے کی بات ہے۔ میں ایم اے کا طالب علم تھا اور وولنر ہاسٹل میں مقیم تھا۔ اس ہاسٹل اور انارکلی بازار کے مابین بمشکل ایک فرلانگ کا فاصلہ ہوگا۔ ایک روز بلیڈوں کا ایک پیکٹ ایک اچھی خاصی معتبر دکان سے خریدا۔ واپس ہاسٹل میں پہنچا اور روئے منور پر خوب جھاگ ابھار چکنے کے بعد اس خوبصورت پیکٹ کو گھورا تا کہ بلیڈ نکالوں۔ مگر اس میں بلیڈ کے بجائے ایک ننھی سی ٹھیکری برآمد ہوئی۔ جس کے گرد کاغذ بڑے سلیقے سے لپیٹا گیا تھا۔ اب یہ بتانے کی تو چنداں ضرورت نہیں کہ مجھے کس بیچارگی سے دوچار ہونا پڑا۔ بہرحال میں اسی دکان پر واپس گیا اور جا کے وہ پیکٹ اس کے اوپر والے چمکیلے کاغذ سمیت دکھایا۔ معتبر دکاندار نے سنی ان سنی کر دی۔ میں نے بات دہرائی تو حضرت نے مجاہدانہ لہجے میں فرمایا: ''ہم نے پیکٹ خود تیار نہیں کیے''۔

میں اپنا سا منہ لے کر لوٹ گیا۔ اگر ذرا بھی زیادہ اصرار کرتا تو منہ بھی اپنا سا نہ رہتا کچھ اور سا ہو جاتا اس لیے کہ عموماً ہمارا تاجر اور دکاندار گرم مزاج واقع ہوا ہے۔ ایک پرانا چینی مقولہ کیا خوب ہے کہ ''جس شخص کے چہرے پر تبسم نہ سجے اسے دکانداری نہیں کرنی چاہیے''۔ ہاں تو واپسی پر میں یہی سوچتا رہا کہ اس اتنی بڑی دکان کے مالک کو اپنی دکان کی ساکھ کا بھی کوئی خیال نہیں! اس کا فرض تھا کہ مجھے نیا پیکٹ کھول کر اور تسلی کر کے دے دیتا۔ ساتھ معذرت بھی کرتا بلکہ اس کا فرض تھا کہ میری شکایت پر بلیڈوں کا سارا سٹاک چیک کرتا۔ خراب پیکٹ نکال پھینکتا تا کہ ساکھ مزید خراب ہونے سے بچ جائے۔ پھر خیال آیا، کیا پتہ حضرت نے خود ہی یہ بندوبست کر رکھا ہو۔ ذرا سی بات تھی مگر اس کا تاسف انگیز اثر آج بھی طبیعت پر موجود ہے۔

مسلمان ملت اس ذاتِ قدسی صفات صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے جسے کفار و مشرکین عرب نے ''امین'' کا خطاب دیا تھا۔ تجارتی معاملات میں آپ کی امانت داری نے آپ کی شخصیت کو بطور خاص محترم و مکرم بنا دیا تھا۔ حق یہ ہے کہ آدمی دولت کے لالچ میں جس قدر اپنے آپ کو رسوا

Marfat.com

کرتا ہے دیگر مقاماتِ ہوس میں شاید نہیں کرتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علی ہوسلم نے تجارتی امانت داری کی وہ روشن مثال پیش کی تھی کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے متاثر ہوکر اپنے آپ کو عمر بھر کے لیے حضورؐ کے ساتھ وابستہ نکاح کرلیا۔ کوئی زمانہ تھا کہ مسلمان قوم تجارت کو نبی اکرم صلی اللہ علی ہوسلم کا دعا یافتہ پیشہ جان کر اپناتی تھی اور اسے بددیانتی اور ہیرا پھیری کے داغ سے پاک رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ مسلمان تاجر مناسب سے زیادہ منافع خلافِ امانت جانتے تھے۔ حضرت فاروق اعظمؓ کے ضمن میں بیان گیا ہے کہ آپ اجناس اور ان کی قیمت فروخت پر نگاہ رکھتے تھے۔ اگر کسی دکاندار کے یہاں قیمت فروخت قیمت خرید سے بہت زیادہ نظر آتی یا جنس اس قیمت سے بہت زیادہ فروتر ہوتی تو آپ فرماتے: ''یا قیمت کم کردو یا ہمارے بازار سے دکان اٹھالو''۔

مشہور متقی بزرگ یونس بن عبید نماز پڑھنے گئے اور اپنی کپڑے کی دکان پر کسی عزیز کو بٹھا گئے۔ اس نے ایک ملبوس چار سو درہم میں ایک گاہک کے ہاتھ بیچا۔ وہ لے کر خوش خوش جارہا تھا اس لیے کہ جس علاقے سے وہ آیا تھا وہاں وہ ملبوس پانچ سو درہم میں ملتا تھا۔ یونس بن عبیدؒ مسجد سے نکلے تو اس گاہک کے ہاتھ میں وہ ملبوس دیکھا۔ پہچان لیا اور قیمت پوچھی۔ اس نے بتائی۔ آپ اسے واپس دکان پر لائے اور آکے اپنے عزیز کو ڈانٹ پلائی۔ دوسو درہم گاہک کو واپس کر دیے۔ گاہک ہکا بکا چلا گیا۔ یونس بن عبید نے اپنے عزیز سے کہا میری غیر حاضری اور بے خبری میں تم مال حرام میری کمائی میں شامل کرنے لگے تھے۔ خدا نے مجھے بروقت بچالیا۔ ورنہ کیا پتہ اس تھوڑے سے سے حرام کے باعث میرا سارا کاروبار تباہ ہوجاتا۔ کیا تم خود دوسو کی چیز چار سو میں لینا چاہو گے؟ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول تم نے کیوں بھلا دیا کہ ''جو کچھ تم اپنے لیے پسند کرو، وہ اپنے بھائی کے لیے بھی پسند کرو''۔

یہ اخلاق اور یہ انداز امانت محض کسی تعزیری دفعہ کی مدد سے پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایمان و تقویٰ کا عطیہ ہے۔ یہیں حضرت ابن سیرینؒ کا ایک واقعہ بیان کردوں۔ آپ نے چالیس ہزار درہم کا روغن زیتون لیا اور کپوں میں بھروا کے بغرض تجارت لے چلے۔ کسی منزل پر کسی کپے سے مرا ہوا چوہا برآمد ہوپڑا۔ آپ کو وہم گزرا کہ مبادہ چوہا کو لہو میں گرا ہو اور سارے کپوں پر اس کا اثر پڑا ہو۔ اس خیال کے آتے ہی آپ نے چالیس ہزار درہم سے خرید کردہ روغن زیتون زمین پر انڈلوا دیا۔۔ وہ یوں بھی کرسکتے تھے کہ جس کپے سے چوہا برآمد ہوا تھا اسے برباد کردیتے باقی بیچ

Marfat.com

دیتے اورلطف یہ ہے کہ وہ رقم جواس مال تجارت پر صرف ہوئی تھی قرض کی تھی جو ادا نہ ہوئی اور حضرت ابن سیرینؒ کو قید بھگتنا پڑی۔ یہاں بھی وہی ایمان وتقویٰ والی بات تھی جو محض کسی ملکی اور اقتصادی قانون سے پیدا نہیں ہوتا۔

یہی باعث ہے کہ غیر مسلم افراد بھی مسلم تجار کی امانتداری پر اعتماد کرتے تھے۔ان کی امانت وصداقت کا اثر اتنا گہرا ہوتا تھا کہ بے دین لوگ ان کی روش دیکھ کر اسلام کے حلقہ بگوش ہو جاتے تھے۔آج جب ہم ٹامس آرنلڈ، ترسنگھ یا دوسرے مستشرقین کی کتب پڑھتے ہیں جن میں دعوت و تبلیغ اسلام کی وسعت واثر انگیزی سے بحث کی گئی ہے تو حیرت ہوتی ہے۔ وہ علاقے جہاں مسلمانوں نے چڑھائی کی اور فرمانروائی فرمائی وہاں بھی اسلام کی تبلیغ زبان تیغ نے نہ کی تھی، سب سے بڑا تبلیغی حربہ مسلمانوں کی امانت وخوش خلقی تھا۔مگر جہاں مسلمانوں نے باہر سے کبھی فوج کشی نہیں کی وہاں اسلام کس طرح پھیلا۔انڈونیشیا، فلپائن، تھائی لینڈ، ویت نام، برما، ملیشیا، کانگو، انگولہ، ٹوگولینڈ وغیرہ علاقوں میں اسلام کس طرح پہنچا؟ جب بھی اس امر کا تاریخی اور تحقیقی جائزہ لیا گیا یہی پتہ چلا کہ مسلمان تاجر یہاں آتے تھے اور لوگ ان کے اثر سے اسلام قبول کر لیتے تھے۔ صوفیا اور درا ویش کی باری بالعموم بعد میں آتی رہی۔

اگر وہ تاجر آج کے مسلمان تاجروں اور دکانداروں کی اکثریت کی طرح کے ہوتے تو اغیار ان سے متاع دین ہرگز قبول نہ کرتے۔اس لیے کہ آج تو ان سے مال تجارت بھی بامر مجبوری لیا جاتا ہے۔ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں قدیم تاجروں سے واسطہ رکھنے والے غیر مسلم سوچتے ہوں گے کہ وہ دین جس کے ماننے سے آدمی کے دل میں اس قدر خوفِ خدا اور جذبہ امانت وتقویٰ راسخ ہو جائے یقیناً برتر دین ہے۔ یہ بات آج ہماری قوم کے افراد کو یاد نہیں رہی کہ دل نشین ترین وعظ سے زیادہ اثر آفرین امانت دار تاجر کی روشن مثال ہے۔الفاظ بھی اثر کرتے ہیں لیکن روشن مثال جو اثر کرتی ہے اس کا کوئی اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔

---☆---☆---

جب کسی ملک کے بازاروں میں ایک ہی قسم کی بہت سی صنائع اور اشیا موجود ہوں تو ظاہر ہے کہ ان میں سے جو مقابلتاً زیادہ بکے وہ عموماً بہتر تصور کی جاتی ہے۔اس امر میں اس چیز کا معیاری ہونا اس کی صنعت کا پائیدار وجمیل ہونا وغیرہ شامل ہے۔خالی سستا ہونا کوئی معیار نہیں اس

Marfat.com

پسندیدگی کو جمہوریت کی زبان میں یوں کہہ لیجئے کہ فلاں فلاں صنائع یا اشیا کو زیادہ تر ووٹ ملے۔ یہ ووٹ، دلالت کرتے ہیں اس امر پر کہ مال میں کوئی دھوکا نہیں۔ نتیجتاً جس ملک میں وہ مال آتا ہے وہاں کے باشندوں کی تجارتی امانت داری کو تسلیم کر لیا جاتا ہے اور اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہو تو جس ملک سے وہ مال آتا ہو وہاں کے باشندوں کے بارے میں مجموعی رائے خراب ہو جاتی ہے۔

اس اشتہار سے تاجروں کو ہر وقت یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ وہ اندرون و بیرون ملک میں اپنی قوم کی معاملاتی دیانتداری کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ملک کے باہر کا معاملہ اور بھی نازک ہوتا ہے۔ وہاں درجنوں رقیب ممالک کے ساتھ مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ باہر اگر ہماری کپاس، پٹ سن، کپڑا، جوتے، خام چرم، کھیلوں کا سامان، سامان جراحی، سلائی کی مشینیں، پنکھے، ٹرانسٹر وغیرہ ناقص اور غیر معیاری برآمد ہوں تو پورا ملک بدنام ہوتا ہے۔ تجارتی مالی خسارہ اور زرمبادلہ کا بے پناہ زیاں الگ۔ پھر جب یہ سننے میں آئے کہ فلاں تجارتی معاملے میں سعودی عرب کو ہم سے شکایت ہے۔ فلاں معاملے میں عراق اور لبنان کو۔ فلاں معاملے میں لیبیا کو۔ فلاں معاملے میں جاپان کو۔ تو کتنی ذہنی کوفت ہوتی ہے۔ جس قوم کے تاجر لین دین کے معاملات میں بددیانت ہوں اس کا سارا معاشرہ وحشت کدہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت سعید بن المسیب نے فرمایا تھا کہ جس علاقے میں لوگوں کو ناپ تول کے معاملے میں دیانت دار نہ پاؤ وہاں پڑاؤ کو مختصر کر دو اور جتنی جلدی ممکن ہو وہاں سے نکل جاؤ۔ اس کے برعکس جہاں اس امر میں دیانت نظر آئے وہاں پڑاؤ طویل کر دو۔ آج ذرا معاملات اور ناپ تول کی ''دیانت داری'' کا رونق میلہ ملاحظہ کیجئے، کیا ہمارا معاشرہ، وحشت کدہ نہیں ہو چکا۔

حضرت علامہ اقبال نے فرمایا تھا ''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی'' سیاست ہی سے نہیں زندگی کے جس بھی شعبے سے دین خارج ہو جائے وہاں افراتفری مچ جاتی ہے۔ خصوصاً تجارت تو لوٹ کھسوٹ بن کر رہ جاتی ہے۔ ایک امریکی مصنف آر۔ ایچ ٹانی اپنی کتاب ''مذہب اور سرمایہ داری کا عروج'' میں رقم طراز ہے: ''یہ تنقید کہ کلیسا کو اقتصادی روابط اور اجتماعی تنظیموں سے کوئی واسطہ نہیں۔ ایسی جدت طرازی ہے جس کی تائید تاریخ ماضی نہیں کرتی۔ یہ معاملات مذہب ہی کا حصہ رہے۔ جب عہد اصلاح کا آغاز ہوا اس وقت بھی معاشیات، مذہبی اخلاق کی

Marfat.com

ایک شاخ تھی۔افسوس ہے کہ مذہب کو جو معاشرتی قوس کا مرکزی پتھر ہے اور اسے سنبھالے رکھنے کا ذمہ دار ہے، محض ایک ترکیبی جزو میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ راست روی کی جگہ اقتصادی مصلحت نے قدم جما لیے ہیں اور اب اقتصادی مصلحت ہی اخلاق و کردار کا معیار بھی ہے اور حکمت عملی بھی۔'' اسی طرح ایک اور امریکی صاحب نظر وکٹر اوبن ہاس کہتے ہیں کہ ''مختلف شعبۂ حیات کی مذہب سے آزادی امریکہ کی قومی یک جہتی کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے''۔

اس فقرے کی تشریح خود ایک مقالہ بن جائے گی۔ بہر حال فکری انداز میں ہی سہی، اگر امریکہ والوں کا یہ عالم ہے تو کیا ہم مسلمانوں کو، جن کا اٹھتے بیٹھتے دعویٰ ہی یہ ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، اپنی تجارت اور دیگر جملہ معاملات کو دین کے تابع نہیں کرنا چاہیے! وہ دین جس کی روح ہی ''میزان'' ہے ہماری کتاب ہدایت ہمیں بار بار حکم دیتی ہے کہ پورا تولو، ڈنڈی نہ مارو، پورا ناپو، لین دین میں لوگوں کو نقصان نہ پہنچاؤ، نبی آخر الزمان ﷺ نے خود تجارت کر کے ''میزان'' کی روشن مثال پیش کی تھی اور جھانسے کے عطا کردہ غیر مناسب نفع کو سود کا ہم درجہ قرار دیا تھا۔ نیز حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ ناجائز طریقے سے کمالا ہوا تجارتی نفع برکت سے محروم ہوگا۔ مگر آج ''برکت'' کا مفہوم ہی کون سمجھے اور کیسے سمجھائے! راتوں رات امیر بن جانے کی ہوس میں اندھے ہو جانے والوں کا شعور تو اس لطافت کو پا ہی نہیں سکتا۔

Marfat.com

نمود و نمائش

میں چوک نیلا گنبد لاہور سے گزر رہا تھا۔ ایک صاحب تانگے پر سوار ہوئے اور نہایت غیر ضروری بلند آہنگی کے ساتھ کوچوان سے کہا ''پیپلز'' لے چلو۔ میں نے ان صاحب کی طرف دیکھا۔ دو چار دیگر افراد نے بھی جو پاس سے گزر رہے تھے، اس آواز کے باعث ان کی زیارت کر لی۔ وہ صاحب مطمئن نظر آ رہے تھے۔ ان کی صدا رائیگاں نہ گئی تھی۔ ظاہر ہے ''پیپلز'' میں ایم۔ پی۔ اے صاحبان کا ڈیرہ ہوتا ہے چنانچہ وہ صاحب کوچوان پر بھی اور دوسرے افراد پر بھی یہ ضرور واضح کرنا چاہتے تھے کہ ان کی ہستی لائقِ توجہ ہے اس لیے کہ یا تو وہ بنفسِ نفیس ایم۔ پی۔ اے ہیں یا کسی ایم۔ پی۔ اے سے کوئی نسبی، نسبتی، دوستانہ یا غرض مندانہ تعلق رکھتے ہیں۔ پھر اگر اس تعلق کا اظہار نہ ہو تو خاک ایسی معتبری پر۔

اولادِ آدم اس معاملے میں بڑی ہی بے بس ہے۔ نمود کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ خنساء عرب کی مشہور شاعرہ تھی۔ اس کا بھائی صخر آسمانی بجلی کی نذر ہو گیا۔ خنساء کو دکھ ہوا۔ اس نے اپنے دکھ کو خوب خوب اچھالا۔ بھرپور مرثیے کہے۔ جب وہ عکاظ کے میلے میں جاتی تو اپنی اونٹنی کے ہودے کے ساتھ ایک علم بندھواتی جس کے پرچم پر یہ فخریہ کلمات درج ہوتے تھے: ''میں عرب بھر میں سب سے زیادہ غمگین ہوں''۔ کچھ عرصے کے بعد جنگ بدر رونما ہوئی۔ ہند زوجۂ ابوسفیان کے بہت سے اعزہ اس جنگ میں کھیت رہے لہٰذا اس نے بین کر کر کے عرب کی سرزمین سر پر اٹھالی اور عکاظ کے اگلے میلے پر بصد طمطراق اپنے ہودے کے ساتھ علم بندھوایا جس پر بصد ناز یہ الفاظ مرتسم کرائے: ''بلکہ میں عرب بھر میں سب سے زیادہ غمگین ہوں''۔

چھ سات برس ادھر کی بات ہے۔ میں جناح کالونی لائل پور سے گزر کر گورنمنٹ کالج جا رہا تھا۔ ایک کوٹھی کے پاس سے گزر ہوا جو زیرِ تعمیر تھی۔ وہ خاصے وسیع رقبے میں پھیل رہی تھی۔ اسی اثناء میں ایک کار میرے پیچھے سے آئی اور مجھ سے کوئی بیس پچیس گز آگے نکل کر رک گئی۔ اس کار تک پہنچتے پہنچتے کار کے مالک کار سے برآمد ہو چکے تھے۔ انہوں نے نگاہیں بڑے انہماک سے

Marfat.com

کوٹھی پر جمار کھی تھیں۔ ہاتھ پیچھے کی طرف بڑھا کر کار کا دروازہ بند فرمایا تھا۔ جب میں ان کے قریب پہنچا تو انہوں نے کار کی چابی والا چھلا انگلی میں ڈال کے گھمایا اور بڑبڑائے: ''یہ کمبخت مستری بڑے ہی ست ہیں''۔ وہ ابھی سڑک پر ہی کھڑے تھے۔ کوٹھی سڑک سے ہٹ کر تھی۔ بظاہر یہ فقرہ انہوں نے اپنے آپ سے کہا تھا مگر حقیقتاً پاس سے گزرنے والے کو یہ احساس دلانا مقصود تھا کہ زیرِ تعمیر کوٹھی ان کی ہے۔ میں نے یہ فقرہ سنا تو نہ چاہا کہ ان کی محنت ضائع جائے لہٰذا میں نے دو تین بار کوٹھی کی طرف اور دو تین بار ان صاحب کی طرف دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری اس کارروائی سے ان کی کسی حد تک تسکینِ نخوت ہوگئی ہے۔ اگر راہ چلتے کسی کی اتنی سی دلجوئی ہو جائے تو کیا حرج ہے؟

شادی بیاہ اور خوشی کے مواقع تو خیر نمود و نمائش کا سبب بنا لیے جاتے ہیں مگر آپ نے دیکھا ہوگا کہ جن اصحاب میں ذوقِ نمود و نمائش کی استطاعت ہوتی ہے وہ بیماری و موت کو بھی اپنی حیثیتِ عرفی کے چمکانے کا وسیلہ بنا لیتے ہیں۔ چھینک آئی اور چوٹی کے ڈاکٹروں سے معائنے کے لیے وقت لیا گیا۔ مہنگی سے مہنگی دوا تلاش کی گئی۔ نہ ملی تو یورپ و امریکہ تار روانہ کیے گئے۔ آپ نے شاید یہ بھی دیکھا ہوگا کہ بڑے آدمی کی بیماری کو بارعب و باوقار بنانے کے لیے گھر میں جس قدر بھی دوائیں بیکار پڑی ہوتی ہیں لا کے مریض کے پلنگ کے اردگرد میزوں اور تپائیوں پر سجا دی جاتی ہیں۔ سنا ہے اس سے بھی رعب پڑتا ہے۔ ڈاکٹروں کے معاملے میں ہمیشہ بڑے بڑے ڈاکٹروں کا نام بے ضرورت اور بار بار لیا جاتا ہے تاکہ امارت کی دھونس بھی جمائی جائے اور اخراجات کی بھی۔ ہوسکتا ہے کہ مریض ایسے ابا جان ہوں، دادا جان یا نانی، دادی صاحبہ ہوں جن کا وجود نہایت بوجھل ہو۔ جن کی زندگی کے خاتمے کے لیے دل سے دعا نکل رہی ہوں اور جنہیں ویسے زندگی کی ذرا ذرا سی سہولت کے لیے ترسایا جاتا ہو مگر جب وہ نمائش کا سبب بن سکیں تو ضرور بنا لیا جاتا ہے۔ اے کاش وہ بیمار ہوں، اے کاش وہ مریں تاکہ اس بیماری و موت کو منایا جا سکے۔

مجھے ایک شخص کا واقعہ اچھی طرح یاد ہے۔ وہ ماشاء اللہ زندہ و سلامت بھی ہے۔ اس کے والد ایک طرح سے اس کے مکان میں نظر بند تھے۔ اس کے خیال میں وہ اس لائق نہ تھے کہ ان کے تہذیب یافتہ، منصب دار اور رئیس دوستوں کے سامنے آتے۔ اسی سے ظاہر ہے کہ ان سے عام سلوک کیا روا رکھا جاتا ہوگا۔ وہ نہ بدشکل تھے نہ پاگل۔ فقط یہ کہ زندگی میں انہوں نے جس قدر

Marfat.com

محنت کی تھی اور جس طرح غریبی سے امیری تک پہنچے تھے، اس کی روئیداد سنانے کے شائق تھے۔ لڑکے کو یہ بات دکھ دیتی تھی۔ اس کے ملنے والے ''آسمان جاہوں'' کو یہ کیوں پتہ چلے کہ اس کے والد صاحب کسی زمانے میں غریب بھی تھے۔ بہرحال وہ والد بیمار پڑ گئے اور لڑکے نے ان کی بیماری کو خوب منایا۔ بیمار پرسیاں کرائیں، ہمدردیاں حاصل فرمائیں اور جب وہ بزرگ چل بسے تو اخبارات میں خبریں شائع کرانے کے علاوہ ریڈیو سے بھی مقامی خبروں میں اعلان کرایا۔ جنازے کو بے ضرورت لمبے راستے سے گورستان کی طرف لے جایا گیا۔ ٹیلیفون اور تار کے ذریعے وصول ہونے والے تعزیتی پیغاموں کو گن گن کے اپنی مقبولیت کی پیمائش کی گئی۔ اس امر کا چرچا دیر تک رہا کہ عیادت و تعزیت کرنے والوں میں قابلِ ذکر لوگ کس قدر تھے۔

بڑے لوگوں کی موت پر غریب عزیزوں اور دوستوں کے آنسو تو بطور خراج وصول کیے جاتے ہیں۔ اصل قیمت اس تعزیت کی ہوتی ہے جو بڑوں کی طرف سے ہو۔ خواہ وہ کتنی ہی رسمی اور غیر مخلصانہ ہو۔ ہمارا وتیرہ ہے کہ جب ہم عزیزوں یا دوستوں کا تعارف کراتے ہیں یا غائبانہ ذکر کرتے ہیں تو ہمارے پیشِ نظر ان کی مادی اور منصبی حیثیت ہوتی ہے۔ اس اہمیت کی کمی نزدیک والوں کو دور اور دور والوں کو نزدیک کر دیتی ہے۔ قریب ترین رشتہ دار اگر وہ غریب ہوں تو بیشک بستر مرگ پر سے پیغام بھیجتے رہیں ہمارے پاس فرصت ہی نہیں۔ حقیقتاً ایسی ہمدردی کو وقت کا ضیاع سمجھا جاتا ہے جہاں پرسش کرنے والوں میں شامل ہونا مفید اور باعثِ افتخار ہو وہاں ہمدردی کا مفہوم ادا کرنے والے جملہ کلمات نثار کر دیے جاتے ہیں۔

میرے ایک رفیق نے جو آج کل لاہور میں وکالت فرماتے ہیں ایک دوست کا ذکر کیا کہ اس کے پاس دو شخص آئے۔ ایک کا نام اسلم فرض کر لیں دوسرے کا انور۔ اس نے اسلم کو انور سے ملایا اور ظاہر کیا کہ وہ سیکرٹریٹ میں سپرنٹنڈنٹ ہے۔ انور کو ڈی۔ ایس۔ پی ظاہر کیا۔ جب انور چلا گیا تو اسلم نے کہا: ''بھائی تم نے غضب کیا۔ میں سینئر کلرک ہوں تم نے مجھے سپرنٹنڈنٹ بنا دیا۔ اگر خدانخواستہ وہ برانچ اور شعبہ پوچھ بیٹھتا اور مزید خدانخواستہ اگر وہ اس برانچ کے سپرنٹنڈنٹ سے متعارف بھی ہوتا تو کیا بنتا''۔ اس پر وہ تعارف کرانے والا بولا: ''چھوڑو یار اسلم، میں نے ذرا اپنی ہوا باندھی تھی۔ اسے احساس دلایا کہ میری پہنچ سیکرٹریٹ تک ہے۔ پھر یہ کہ وہ خود کب ڈی۔ ایس۔ پی ہے۔ اس کے سوٹ بوٹ پر مت جاؤ۔ وہ تو ہیڈ کانسٹیبل ہے''۔ یہ نمود کی

Marfat.com

کون سی قسم ہے؟

شاعر سٹیج پر چڑھ کر ذوقِ نمائش کی تسکین کر لیتا ہے۔ واعظ اور مقرر منبر پر تشریف لا کر، افسر اور حاکم دھونس جما کر، رند رندی کو وجہ مباہات بنا لیتا ہے اور زاہد زہد کو، گونگا گونگے پن کی منادی کرتا ہے اور لنجا لنجے پن کی۔ کسی میں کوئی جوہر لائقِ اظہار ہو سہی، کوئی اظہار کے معاملے میں ہٹیا ثابت نہیں ہوتا۔ لکھنؤ کے بانکے کوئی نہ کوئی منفرد حرکت کرتے تھے تا کہ نمایاں نظر آئیں اور کچھ نہ ہوا تو سر پر مونڈھا رکھ کے چل کھڑے ہوئے یا دائیں مونچھ منڈوا دی اور بائیں رخسار پر سے ڈاڑھی کتروا دی۔ آدمی اپنے آپ کو پہچانے تو اپنے آپ میں رہے مگر آدمی نے اپنے آپ کو کب پہچانا اور کب پہچانے گا؟

Marfat.com

صاحب دیانت عہدہ دار.....مجرم یا مجاہد؟

ڈیڑھ دوسال اوپر کی بات ہے میں کرشن نگر سے بس کی اوپر والی منزل میں نشست یاب ہوا۔ جب بس دفتر لاٹ صاحب کے سٹاپ پر رکی تو دو تین افراد جو بڑی طراریٔ گفتار سے تبادلہ خیال کر رہے تھے، میرے قریب والی خالی نشستوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ گفتگو بتا رہی تھی کہ وہ ایک مجسٹریٹ کی عدالت سے کسی عزیز کی سزایابی کا فیصلہ سن کر آ رہے تھے۔ ایک آواز نے مجسٹریٹ کا نام لے کر شکایت کے لہجے میں کہا کہ اگر آپ لوگ اس شخص تک کسی مناسب طریق سے رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ جواباً آواز گرجی: ''ہم نے ہر کوشش کی، رشوت کی بھی اور سفارش کی بھی.....مگر تم دیکھتے نہیں کہ وہ کمبخت ایک تنگ گلی میں ایک تنگ مکان میں رہتا ہے اور ٹوٹی ہوئی سائیکل پر سوار ہو کر کچہری پہنچتا ہے۔ جو اس انداز سے زندگی بسر کرے وہ سفارش کیوں مانے اور رشوت کیوں قبول کرے''۔ یہ الفاظ سن کر میری آنکھیں خوشی سے نم آلود ہو گئیں۔ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔ مجھے اس مجسٹریٹ کا نام یہاں لینا چاہیے مگر شاید مناسب نہ ہو۔ میں اس لیے بھی خوش تھا کہ وہ ایم۔اے میں میرا کلاس فیلو تھا اور اپنی ذاتی محنت سے اس منصب تک پہنچا تھا اور بڑے صبر و استقلال سے دیانت کے اس مقامِ عزت تک رسائی حاصل کی تھی۔ میں اس کے رہن سہن سے آگاہ تھا اور اس کی سادہ و غریبانہ بود و بوش کا قدر دان تھا۔ چنانچہ میں نے اس واقعے کے بعد پہلی ملاقات میں اس کو مبارک باد دی اور کہا: ''بھائی مجھے تم پر فخر ہے۔ اصل امانت وہ ہے کہ ایک ناکام اور زک اٹھانے والی پارٹی اس کا اعتراف کرے''۔ اس دوست کے پتلے سے چہرے پر خوشی کی سرخی دوڑ گئی۔ وہ خوشی جو رشوت و بے امانتی کے عطا کردہ ہر خزانے سے زیادہ گراں بہا اور طمانیت بخش تھی۔ لیکن اس نے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ'' بھائی تم اس راہ کی مشکلات سے بھی آگاہ ہو گے۔ روشِ عام سے ہٹ کر چلنے والے کو کون پسند کرتا ہے؟ بھائی میں تو بتیس دانتوں میں زبان کی طرح ہوں۔ ماتحت مجھ سے بیزار، بعض اوقات افسر بھی ناخوش، عوام کا خود غرض طبقہ ویسے ہی نالاں''۔

Marfat.com

یہ بات بالکل بجا ہے۔ اقدار اس طرح تہ و بالا ہوئی ہیں کہ ہر محکمے میں صراط مستقیم پر چلنے والے چھپے ہوئے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ بد دیانت ملازم بطور سزا دور افتادہ، کٹھن اور مشکل اسامیوں اور مقاموں پر رکھے جاتے، لیکن مشاہدہ یہ ہے کہ بد دیانت حضرات اپنے ''ایمان افروز'' وسائل کی مدد سے عموماً انعامی اسامی (Prize Post) پر فائز رہتے ہیں۔ کوئی محکمہ ہو اہلِ دیانت نکو بھی بنتے ہیں اور سزا بھی پاتے ہیں۔ نکو یوں بنتے ہیں وہ اس برادری کے رئیسانہ مطالبات کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ نہ شام کو ان کے ہم دم ہو سکتے ہیں۔ نہ صبح کو اور نہ چھٹی کے روز کی تفریحات میں موزوں رفیق ثابت ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ الگ الگ سے رہتے ہیں اور اپنی برادری سے ہٹ کر اور کٹ کر اپنے ڈھب کا کوئی جلیس و رفیق ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ گلی محلے میں کوئی نہ کوئی خانہ خراب اس دور میں بھی مل ہی جاتا ہے۔

میں جب بھی غور کرتا ہوں مجھے احساس ہوتا ہے کہ دیانت داری اس دور میں نہایت سنگین ذمہ داری ہے۔ میں اپنے ہر اس دوست اور شاگرد اور واقف کار کی بخلوص خاطر عزت کرتا ہوں جس کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ وہ اپنی حدود میں رہتا ہے اور دیانت دار مفلسی کو بد دیانت امارت پر ترجیح دیتا ہے اور یہ اس کا محض مجبوری کا فیصلہ نہیں بلکہ سوچا سمجھا فیصلہ ہے۔ بالیقین ایسا ہر شخص بہت بڑا مجاہد ہے۔ مگر میں ساتھ ہی یہ بھی سوچتا ہوں کہ ایسے دیوانوں کی حوصلہ افزائی کس طرح ہوتی ہے؟ مثلاً اگر وہ اپنے ماتحت عملے کو بد دیانتی سے روکنا چاہیں تو وہ سب ان کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیتے ہیں اور وہ متحدہ محاذ سیاسی پارٹیوں کے متحدہ محاذ سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ گویا ماتحتوں کے لیے دیانت دار افسر ایک ناگوار ترین بار ہے جس سے وہ جلد از جلد نجات پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کوشش کی ایک صورت حکام بالاتر کی خدمت میں گمنام چٹھیوں کی ترسیل ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اسے ناکام کرنے کے لیے اس کے کام میں رکاوٹ ڈالی جاتی ہے۔ تیسری صورت یہ کہ اس کے یہاں سے تبادلے کی درخواستیں دی جاتی ہیں اور چوتھی صورت یہ کہ کسی برتر حاکم مختار کی ہوس امانت داری کی رگ کو بھڑکایا جاتا ہے۔ چنانچہ دیانت دار افسر کو اپنے سے بالاتر افسر کی طرف سے اس کے ذاتی اعمالنامے (Personal File) میں ایسی تصریحات کا اندراج انعام میں ملتا ہے جن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص رفقائے کار اور ماتحتوں سے بنا کے نہیں رکھتا۔ ایک ایڈمنسٹریٹر کے لیے ''بنا کے رکھنا'' ضروری اہلیت ہے اور اگر وہ اس

Marfat.com

اہلیت سے محروم ہے تو بہر حال اس کی انتظامی صلاحیت ناقص ہے۔ لہٰذا آئندہ اس کا نام کسی برتر اور بہتر اسامی کے لیے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یہی نہیں بلکہ بار ہا ایسے ناگوار شخص کو اپنی اسامی سے ہٹا دینے کے لیے اس پر جھوٹے مقدمات کھڑے کر دیے جاتے ہیں۔ اور اپنے بداعمال اس کے گلے ڈال کے اس کو سزا دلائی جاتی ہے۔ باضمیر آدمی کے لیے ہر دم اور ہر سانس یوم حساب ہے۔ آپ نے ایسے جلوے دیکھے ہوں گے جب بددیانتوں نے دیانتداروں کو معطل، معزول اور قید کروا دیا اور خود یوم حساب سے بے پرواہ بہ صد غرور دندناتے پھرے۔

میرا ایمان تو یہ ہے کہ اس دور حیات میں باضمیر آدمی کا ہر قدم ایک اعلانِ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اس لیے کہ حق دبکا ہوا ہے۔ باطل بپھرا ہوا ہے۔ خیر منفعل ہے۔ شر فعال ہے۔ دروغ کو فروغ ہے اور راست کو کاست، حضرت مجدد الف ثانی اپنے مکاتب میں بار ہا یہ مثال دیتے ہیں کہ ہزیمت و شکست کے عالم میں جب فرار عام کا بازار گرم ہو جو سپاہی متردد ہو کر، ٹھہر ٹھہر کر بھاگ رہا ہو، وہ بھی قابلِ قدر ہے۔ چنانچہ اس اخلاقی افراتفری میں جو شخص لوٹ کر اپنے ضمیر کی کسی وقت خیریت پوچھ لیتا ہے۔ وہ گویا اپنے اندر اصلاح کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس سپاہی کی طرح ہے جو راہِ فرار تو اختیار کرتا ہے مگر رکتا ہے، لوٹ لوٹ کر دیکھتا ہے تا کہ کوئی قابلِ اعتماد للکارے تو پھر سے جم جائے۔ پھر ان کے تو کیا کہنے جن کو خدا نے ثبات و استقلال عطا کر رکھا ہو۔

انسان مزاجاً بے صبر ہے اور ہوس کا پتلا ہے۔ مقاماتِ ہوس سے دامن کشاں گزر جانا اس کے لیے بہت بڑا امتحان ہے۔ ایسے مواقع پر حوصلہ افزا مثبت مثالوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح بدی متعدی ہے اسی طرح نیکی بھی متعدی ہے۔ اگر بدی ''لگ'' جاتی ہے تو نیکی بھی ''لگ'' جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات بدی کی مثالیں اتنی عام ہو جاتی ہیں کہ انہی کو رواج و رسوخ حاصل ہو جاتا ہے اور آدمی کی تقلیدی حس اس کو فوراً نقل پر آمادہ کر لیتی ہے اور یہ خیال دل آواز لبھانے لگتا ہے کہ بھائی سبھی تو عیش کر رہے ہیں میں نے کیا گناہ کیا ہے؟ میں اپنے بچوں کو کیوں نیم فاقہ دیے رکھوں۔ ساتھ ہی یہ خوف بھی لاحق ہو جاتا ہے کہ میں اتنے بڑے ہجوم بے اماناں میں اکیلا گھر کر پامال ہو جاؤں گا۔ گویا کچھ ہوس اور کچھ اصلی و نقلی خوف ایک متدین آدمی کو بھی مروجہ ''آداب و رسوم'' کا عادی بنا دیتا ہے۔

خدا کا خوف اور جزا و سزا کا خیال دور کی بات ہے۔ اس لیے کہ ایسے وسوسوں کو ہوس اور

Marfat.com

خوف کے پردے ڈھانپ لیتے ہیں اور جوں جوں گناہ کا غلبہ بڑھتا جاتا ہے خدا کا تصور بھی دلوں سے محو ہوتا چلا جاتا ہے کیونکہ آدمی کے لیے اپنی عیش کو بے کدورت رکھنے کی خاطر خدا کے تصور سے نجات پانا ضروری ہوتا ہے۔ نہ خدا ہو اور نہ اس کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے۔ قرآن نے اگر گنہگاروں کو باغی اور منکر قرار دیا ہے تو اس کا سبب یہی ہے۔ بد دیانت ضمیر اپنے اطمینان کی خاطر ہر شے کو مباح چاہتا ہے۔ لہٰذا ہر اخلاقی ڈھانچے کو تہس نہس کر دینے کا خواہاں رہا ہے۔ وہ ہر انتشار کا یار و فادار رہتا ہے تا کہ اس کی اپنی ہوس رانی کی عمر دراز ہو جائے۔ ننگوں کا حمام جس قدر طویل المیعاد ہو گا اسی قدر وہاں کا ہر ننگا اپنے لیے ننگے پن کو ننگ نہ جانے گا۔

اس دور میں ہر صاحبِ دیانت عہدہ دار گویا ننگوں کے حمام میں ایک باحیا وجود کی طرح سہما اور گھبرایا ہوا ہے۔ مگر صاحبِ دیانت کو ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسے میرے مذکور الصدر دوست کی طرح دنیا غائبانہ کیا کہتی ہے۔ یہ غائبانہ ذکر خیر روح کے لیے کتنی تقویت کا باعث ہوتا ہے اور کتنی خود اعتمادی پیدا کرتا ہے۔ لہٰذا اے اہلِ دیانت! خدا تمہیں مجاہدوں کی سی جزا دے گا۔ ڈٹے رہو۔ تم اس ضمیر فروشی کی شب تار میں روشنی کے نار ہو۔

Marfat.com

حقوقِ ہمسائیگی..... نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں

دکھ کی بات تو یہ ہے کہ انسان ایک زندہ حقیقت کی حیثیت سے باقی نہیں رہا۔اب وہ زندہ حقیقت کے بجائے ایک علمی موضوع بن کر رہ گیا ہے۔علم الانسانیات اور علم المعاشرہ وغیرہ موضوعا ت پر بڑی توجہ دی جارہی ہے۔مگر علم سے کیا فرق پڑتا ہے۔علم سے تو فقط معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔محض معلومات عمل آفریں نہیں ہوتیں۔عمل پر ابھارنے والی کوئی ایسی ہی شے ہوسکتی ہے جو علم سے بڑھ کر ایمان ویقین کی صورت اختیار کرلے۔

آدمی کے بارے میں یہ آگاہی میسر ہے کہ بنیادی طور پر یہ ایک دوپایہ ہے اور حیوان ہے۔ جبلتوں کا محکوم ہے۔جبلتوں پر جب فرمانروائی کرنے لگتا ہے تو اس میں توازن واقع ہوتا ہے۔یہ توازن اسے انسان بناتا ہے مگر یہ خودشناسی کی منزلیں آسانی سے طے نہیں ہوتیں۔جب خودشناسی کسی حد تک حاصل ہوجاتی ہے تو پھر دوسروں کی شناخت کی اہلیت پیدا ہوتی ہے۔جبلت کا محکوم محض ایک دوپایہ کیا جانے ہمدردی کسے کہتے ہیں اسے تو اپنی ہوس پرستی سے مہلت نہیں۔جبلت کا محکوم ایک حیوان انسان کیا جانے ایثار میں کیا مزا ہے۔اور جبلت کا محکوم ایک معاشرتی وحشی کیا سمجھے کہ دوسروں کے حقوق کیا ہوتے ہیں۔

یہی بات باعث تشویش ہے کہ علوم کی فراوانی کے باوصف زوالِ آدم پوری سرعت کے ساتھ جاری ہے۔یہ ٹھیک ہے کہ انسان ایک مجلسی اور معاشرتی جانور ہے لیکن مجالس اور معاشروں کا حال کیا ہے۔آئین اور قانون اور ضوابط معاشروں کو سنبھالے رکھنے کی کوشش کررہے ہیں مگر قانون کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں اگر ان کے چلانے والے برے ہیں، مزاجاً وحشی ہیں، فطرتاً کج ہیں، طبعاً بے رحم اور خونخوار ہیں تو وہ قانون معاشرے کا کیا سنوار سکتے ہیں؟ اس لیے یہ قواعد وضوابط کے اچھا ہونے کی بات نہیں یہ انسانوں کے اچھا ہونے کا مسئلہ ہے۔

Marfat.com

کوئی بھی معاشرہ مجموعی طور پر معزز نہیں ہوسکتا جب تک ہر فرد احترامِ آدمیت کا بخلوصِ خاطر ایمان کی حد تک قائل نہ ہو۔ جب آدمی آدم کے مقام واجب الاکرام کو پہچانے گا تو پھر اس کی ترقی، بہتری اور خوشی کا اہتمام بھی کرے گا اور اسی مخلصانہ احساس کے باعث بصد مسرت ایثار سے بھی کام کرے گا۔

علم المعاشرہ پر لکھنے والوں نے تفریحوں پر زور دیا، انتظامی ڈھانچوں کے بارے میں تجویزیں پیش کیں۔ رفاہی اداروں کی افادیت پر روشنی ڈالی مگر حقوق ہمسائیگی کی اہمیت کو کماحقہٗ نہ پہچانا لہٰذا اس امر پر ویسا زور نہ دیا جس کا وہ مقتضی ہے۔

معاشرہ خاندانوں کے مل جل کر رہنے سے وجود میں آتا ہے۔ ہر گھر یا ہر کنبہ ایک اکائی اور وحدت ہے لہٰذا معاشرے کو مضبوط کرنے کی خاطر لازم ہے کہ معاشرے کی اکائیوں میں ضبط موجود ہو۔ اسی طرح معاشرے کو مربوط بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی اکائیوں کو باہمی ربط میسر ہو۔ اب ظاہر ہے کہ اس کا آسان ترین طریقہ یہی ہے کہ ہر اکائی اپنی قریب ترین اکائی سے ربط پیدا کرے اور ربط قائم رکھے۔ وہ اکائی آگے اپنی قریب ترین اکائی کو سنبھالے۔ اس طرح ہوتے ہوتے پورا معاشرہ مضبوط و مربوط ہوسکتا ہے۔

یہی باعث ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''حقوقِ ہمسائیگی'' کے احترام پر بڑا زور دیا ہے۔ ایک ہمسایہ دوسرے ہمسائے کا ہمدرد ہو اور وہ تیسرے کا اور وہ چوتھے کا تو پورا شہر ایک کنبہ بن سکتا ہے۔ یہ حقیقت کتنی واضح ہے اور اس پر عمل نسبتاً کتنا آسان ہے۔ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مجھے جبریل امینؑ ہمسائے کے بارے میں اس قدر تاکید کرتے رہے کہ مجھے گمان گزرا وہ ہمسائے کو ورثاء میں شامل کردیں گے۔ گویا ہمسایہ ورثاء سے ذرا ہی کم رہ گیا اور آپ جانتے ہیں کہ وارث کون لوگ ہیں؟ بیٹے، بیٹیاں، بھائی، بھتیجے، ماں باپ علیٰ ہذا القیاس۔ بالفاظِ دیگر یوں سمجھ لیا جائے کہ ہمسایہ قریب ترین رشتہ داروں کا تقریباً ہم مرتبہ ہے۔

ہم اقرارِ ایمان کرتے ہیں یہ کہہ کر کہ میں ایمان لایا اللہ پر، اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں پر، رسولوں پر اور اسی طرح تا آخر۔ اس باب میں حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ وہ شخص مجھ پر ایمان نہیں لایا جس نے سیر شکم ہو کر رات بسر کردی اور اسے علم تھا کہ اس کے پہلو میں اس کا ہمسایہ بھوکا پڑا ہوا ہے۔ یہ حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ غور

Marfat.com

کا مقام ہے کہ ہمارا کلمہ طیبہ کا ورد یعنی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار بالتکرار محض باطل ہے اگر ہمسایہ بھوکا ہے اور ہمارے علم میں ہے کہ وہ بھوکا ہے۔ دورِ حاضر کے روشن بصر خادمانِ معاشرت اپنی خدمت کا آغاز اس ''وحدت'' سے کیوں نہیں کرتے جسے ہمسایہ یا ہمسائیگی کہتے ہیں۔

مگر آج صورتِ حال کیا ہے؟ ہمسایہ ہمسائے سے آگاہ ہی نہیں، اسے رشتہ دار اور اہلِ خاندان کے برابر مقام دینا تو دور کی بات ہے اور اگر ہمسایوں سے کوئی واقفیت ہے تو اس کی نوعیت کاروباری ہے۔ یعنی غریب ہمسایہ خلوص کے ساتھ امیر ہمسائے کو اپنی تسکین نخوت کا ایک شعبہ جانتا ہے۔ امیر یا طاقتور ہمسایہ یہ چاہتا ہے کہ میں گھر سے نکلوں تو گلی میں جو کمتر حیثیت کا ہمسایہ ہے وہ جھک کر سلام کرے یا اس کی انگلی کے اشارے پر بھاگا چلا آئے، خادم کی حیثیت سے تعمیل ارشاد کرے۔

جسے خلوص اور ہمدردی کہتے ہیں وہ کہاں ہے؟ یہاں تک تو آپ میں سے ہر ایک جانتا اور دیکھتا ہے کہ شادی اور غم کی تقاریب پر باہر سے مہمان آتے ہیں مگر ہمسائے مدعو نہیں ہوتے۔ اگر غریب ہیں تو اس قابل نہیں سمجھے جاتے کہ بلائے جائیں اور اگر امیر ہیں تو وہ غریب کی کسی تقریب میں شامل ہونا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ وہ غریب ہمسائے کی تقریب کو رد کر کے عین اسی وقت شہر کے کسی دور ترین مقام پر بلکہ کسی دوسرے شہر میں جا کر کسی ایسی تقریب میں شریک ہوں گے جو ان کی شان کے شایاں ہوں۔ اور اگر امیری غریبی کا مخمصہ نہ بھی ہو تو ہمسایوں سے بے تعلقی بہر حال حائل ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ہمسائے کے تم پر کچھ حقوق ہیں۔ یہ محض کمزوری ممنونیت نہیں ہے۔ یہ ایک طرح سے حقوق کی بات ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ ہمسایہ بیمار ہو تو اس کا حق ہے کہ تو اس کی بیمار پرسی اور خبر گیری کرے۔ اس کا حق ہے کہ جب وہ رحلت کرے تو تو اس کے جنازے کے ساتھ رہے۔ اس کا حق ہے کہ اسے قرض کی ضرورت ہو تو تو وہ ضرورت پوری کرے۔ اسے حق ہے کہ وہ ننگا ہو تو تو اسے لباس مہیا کرے۔ یہ دونوں معنٰی میں ہے کہ اگر مالی اور مادی وسائل کی کمی اسے ہو رہی ہے تو ہمسائے کا فرض ہے کہ اس کی برہنگی کو ڈھانپے اور اگر وہ مظلوم ہے یا رسوا ہو رہا ہے تو تو اسے پناہ بھی دے اور اس کے عیوب پر پردہ بھی ڈالے۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمسائے کا حق ہے کہ اگر وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہو تو تو اس کی غم گساری

Marfat.com

کرے۔ تیرا یہ بھی فرض ہے کہ تو اگر اپنی عمارت کو بلند کرے تو دیکھے کہ ہمسائے تک پہنچنے والی تازہ ہوا کا رستہ تو مسدود نہیں ہوتا۔ اسی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فرمایا کہ اگر تیری ہنڈیا کے دھویں سے یا محض اسے چڑھا دینے سے ہمسائے کو تکلیف پہنچی ہے اور اس طرح تو نے اسے مشقت میں ڈالا ہے تو اس ہمسائے کا اس ہنڈیا پر ایک طرح سے حق ہو گیا ہے اور تیرا فرض ہے کہ تو اس ہنڈیا میں سے اس ہمسائے کے لیے حصہ نکالے۔

مگر آج ہمارا عمومی رویہ کیا ہے۔ ہمسائے میں کوئی بیمار ہے ہمیں خبر تک نہیں۔ ہنڈیا میں سے حصہ نکالنے کی کیفیت بڑی محبت کی طلب گار ہے۔ ہم تو الٹا اذیت کا باعث بنتے ہیں۔ ہم کوڑا کرکٹ اپنے دروازے پر پھینکنے کی بجائے کوشش کرتے ہیں کہ دوسرے کے دروازے پر رکھ دیں۔ حضور نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے برے ہمسائے ملے تھے۔ میری ایک طرف ابولہب تھا اور دوسری طرف عقبہ بن ابی معیط۔ وہ گھر کا کوڑا کرکٹ حتیٰ کہ گندگی بھی میرے دروازے پر ڈال دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ابولہب اور عقبہ آپ کو محض اسلام کے باعث ستاتے تھے۔ آپ ﷺ رنگ و نسل کا امتیاز مٹا رہے تھے۔ وہ لوگ رنگ و نسل کے غرور میں مبتلا تھے۔ آپ امیر و غریب کو یکساں جانتے تھے اور وہ لوگ سرداری کی نخوت میں گرفتار تھے۔ اگر وہ حضور کو اذیت دیتے تھے تو بات سمجھ میں آتی ہے مگر ہم میں جو لوگ ہمسایوں کو ستا کر ابولہب اور عقبہ بنتے ہیں، ان سے پوچھا جانا چاہیے کہ آیا آپ لوگ بھی اسلام دشمنی کے باعث یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ یہ روایت تو اسلام دشمنوں کی ہے۔

آپ نے اکثر دیکھا ہو گا، کیا ہو گا اور بھگتا ہو گا کہ شور مچ رہا ہے۔ ریڈیو کا شور، ٹی وی کا شور، دروازے کے سامنے گپ کے لا یعنی خرافات کا شور اور آپ کو نیند آ رہی ہے۔ یا آپ بیمار ہیں یا آپ کو کچھ سوچنے یا لکھنے پڑھنے کا مرحلہ درپیش ہے۔ آپ جھلاتے ہیں، سٹپٹاتے ہیں مگر کچھ کر نہیں پاتے۔ کبھی کبھی کچھ فریاد بھی کرتے ہیں مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شور مزید بڑھ جاتا ہے۔ بلکہ جب ریڈیو پر یہ اعلان ہو کہ ریڈیو آہستہ بجایئے ممکن ہے آپ کے ہمسائے میں کوئی بیمار ہو جسے آرام کی ضرورت ہو کوئی طالب علم ہو جسے سکون اور خاموشی کی ضرورت ہو تو اس اعلان کو سن کر تعمیلاً آواز اور اونچی کر دی جاتی ہے۔ اور ساتھ ہی اعلان کرنے والے کی شان میں بھی کچھ فرما دیا جاتا ہے۔ جس معاشرے میں بے مہری اور بے دردی کی کیفیت یہ ہو اس معاشرے

Marfat.com

میں مجموعی ربط کیسے جلوہ گر ہوگا اور احترامِ آدمیت کا جوہر کیسے جلوہ ریز ہوگا اور ان لوگوں کو واقعی آدمی کیسے جانا جائے گا۔

حضور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مکان کو بلند کرتے وقت ہمسائے کے یہاں پہنچنے والی ہوا کا خیال رکھنے کی بھی تلقین کی تھی مگر ہمارے یہاں اتنی نزاکتِ حس تو رہی ایک طرف ہم اونچا مکان بنا کر الٹا دوسروں کی گھریلو اور خانگی اور شخصی آزادی تک کو برباد کر دینے کی کوشش کرتے ہیں گویا بالانشینوں کا فرض ہے اور یہ ''حق ہمسائیگی'' ہے کہ وہ زیرنشینوں کے گھروندوں میں وقتاً فوقتاً جھانکتے رہیں اور انہیں خود ان کے گھر میں بھی آزادی کا سانس نہ لینے دیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اس بارے میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر کوئی شخص کسی کے گھر میں جھانکے اور وہ گھر والا سنگریزہ مار کے اس کی آنکھ پھوڑ ڈالے تو مجرم نہ متصور ہوگا۔ مگر آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا حضورؐ کے اس ارشاد کو مانتے ہیں؟

Marfat.com

حصّہ سوم

خاص ہے ترکیب میں

قومِ رسولِ ہاشمی

Marfat.com

Marfat.com

یونانی اور مزدکی کے مضمرات

روحِ اخوت

خدا ایک ہے۔ رسول ایک ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) اب کوئی اور رسول آ بھی نہیں سکتا۔ قرآن ایک ہے اور یہ آخری کتاب ہے جس کی حکمت لازوال اور قدیم ہے۔ اسے قیامت تک زندہ رہنا ہے اور پھر وہ کتاب پوری نوع انسانی کے لیے ہے، نہ کسی خاص مکان کے لوگوں کے لیے ہے اور نہ کسی خاص نسل سے تعلق رکھنے والوں کے لیے اور نہ کوئی خاص زبان بولنے والوں کے لیے۔ اس لیے کہ آدم کی اصل ایک ہے۔ مادی اعتبار سے بھی ایک کہ وہ سب آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوا تھا۔ روحانی اعتبار سے بھی ایک کہ سب میں ایک ہی نفس کارفرما ہے۔ ''ونفخت فیه من روحی''۔ ''میں نے اس میں یعنی آدم کے پیکر میں اپنی روح پھونکی''۔ آدم کا ایک رشتہ آفاق سے ہے، ایک انفس سے اور پھر لوٹ کر بھی سب کو ایک ہی مقام پر پہنچنا ہے اور وہ ہے حضور ذاتِ حق۔ فالق الاصباح، فالق الافلاک اور مالك یوم الدین واضح ارشاد ہے: ''والیه المصیر''۔ منبع بھی ایک معاد بھی ایک اور درد بھی ایک:

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند!
کہ در آفرینش زیک جوہر اند!

یوں دیکھیں تو قرآن وحدت آدم کا سب سے بڑا مبلغ اور ہادی ہے۔ اور قرآن جس ذات اقدس پر اترا اس سے بھی قرآن اتارنے والے نے یہی کہا کہ ''اعلان کر دیجیے کہ آپ پوری اولاد آدم کے لیے مبعوث ہوئے ہیں''۔ قل یا ایّھاالنّاسُ اِنّی رسولُ اللهِ الیکُمْ جَمِیْعًا۔ ''کہہ دو کہ میں تم سب کی طرف پیغام دے کر بھیجا گیا ہوں''۔

اگر وطن سے دین کا تعلق ہوتا تو ابولہب اور ابوجہل، ولید ابن المغیرہ، عتبہ بن ربیعہ اور امیہ بن خلف بڑے معتبر مکی تھے۔ لیکن نہیں، اسلام مکی الوطن نہیں، بقول حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ

Marfat.com

اگر دیں از وطن بودے، محمدؐ
نہ دادے دعوتِ دیں بو لہب را

اسی طرح دین کسی خاص نسل کے لیے بھی نہ تھا۔ دین تو قاطع نسب تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **آتونی باعمالکم ولاتاتونی بانسابکم**۔ ''میرے پاس اپنے اعمال لے کر آؤ میرے پاس اپنے نسب لے کر نہ آؤ۔

مطلب یہ کہ اسلام قریشی النسب نہیں۔ وہ انسانی الاصل ہے۔ حضورؐ کی اسی تعلیم اخوت کے خلاف حضرت علامہ نے ابوجہل کی زبانی ''جاوید نامہ'' کے طاسین محمدؐ میں یہ نوحہ درج کیا ہے:

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب
از قریش و منکر از فضلِ عرب!!
در نگاہِ او یکے بالا و پست!
با غلام خویش بر یک خواں نشست!
قدرِ احرارِ عرب نشناختہ!
با کلفتانِ حبش در ساختہ!
احمراں با اسوداں آمیختند
آبروئے دودمانے ریختند!

صاف بات ہے کہ اگر فلاں ابن فلاں ابن فلاں کہہ کر کسی کی رگِ نخوت پھولتی ہے تو یہ عمل ''وحدت آدم'' کے بنیادی عقیدے کے خلاف اور ''**خلقناکم من نفسٍ واحدۃ**''۔ (ہم نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا) کے مبدأ سے مزاحم ہے۔ چنانچہ حضرت سلمان فارسیؓ نے اپنا نسب نامہ یہ بتایا تھا: ''سلمان ابن اسلام ابن اسلام ابن اسلام ابن آدم''..... جب اسلام ''باوا'' بن گیا تو باقی آباء ایک طرف ہو گئے، قرآن کے پیش نظر جغرافیہ، نسل اور لسان نہیں، قرآن کے پیش نظر انسان ہے۔ اور اسلام جسے اخوت کہتا ہے وہی اپنے ہمہ نوعی معنوں میں قرآنی تعلیم کا مغز ہے۔ یہی اخوت درحقیقت انسانیت کا شفقت آمیز نام ہے۔ حضرت علامہ لکھتے ہیں: ''اس میں کوئی شک نہیں کہ: ''اسلام سے بہت پہلے عیسائیت نے بھی انسان کو مساوات کا سبق دیا۔ لیکن یہ احساس کہ نوعِ انسانی ایک جسم نامی ہے مسیحی روما کی سمجھ میں کبھی نہ آیا۔ فلنٹ (Flint) کہتا ہے:

Marfat.com

زیادہ سے زیادہ جو بات عیسائی یا دولتِ روما کے کسی مصنف کے حق میں بالخصوص کہی جاسکتی ہے یہ ہے کہ اس کے ذہن میں وحدتِ انسانی کا ایک فخریہ تصور موجود تھا۔

تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصولِ اخوت کی تلقین فرمائی۔ اس کی تبلیغ و تکمیل کی خاطر وطن چھوڑ دیا۔ گویا ترجیحی ترتیب یہ ہوئی کہ اگر وطن اور دین میں تصادم ہو تو وطن کو دین پر قربان کر دیا جائے گا۔ اس لیے کہ وطن محدود ہے اور دین لامحدود۔ حضرت علامہ اقبال کی زبانی یوں کہہ لیجیے:

ہجرت آئین حیاتِ مسلم است!
ایں ز اسباب ثباتِ امت است
معنی او از تنک تابی رم است
ترکِ شبنم بہر تسخیرِ یم است

یعنی ہجرت وہ اصول ہے جس پر مسلم کی حیات مبنی ہے اور اسی اصول کے باعث امت مسلمہ کو تقویت و استحکام نصیب ہوا ہے۔ اس کا معنی ہے تھوڑے پانیوں سے دوری اختیار کرنا، یوں کہیے کہ شبنم چھوڑنا اور سمندر اختیار کرنا۔

برعکس اس کے وطنی قومیت کے نشو و نما نے جس کا سارا زور نام نہاد قومی خصائص پر ہے وسیع انسانیت کا جو عنصر مغربی ادب اور فن میں کام کر رہا تھا برابر دب رہا ہے۔ لیکن اس سے کس قدر مختلف ہے عالمِ اسلام کی تاریخ، یہاں وحدت انسانی کا خیال نہ تو کوئی فلسفیانہ تصور تھا نہ شاعرانہ خواب، بلکہ روزمرہ زندگی کا ایک زندہ اور قائم عنصر تھا جو چپکے اور غیر محسوس طریق پر اپنا کام کرتا رہا ہے۔

اس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت فرما کر امت کو ایک مستقل درس دے دیا کہ "الاسلام غریبٌ"۔ اسلام غریب الوطن ہے۔ بقول حضرت علامہ:

از حدیث مصطفیٰ داری نصیب
دینِ حق اندر جہاں آمد غریب

دینِ اسلام پردیسی ہے۔ پردیسی کا معنی یہ ہے کہ کسی ایک خطے سے وابستہ نہیں۔ ہر وطن اس کا وطن ہے گویا یہ پردیسی ہے۔ اس اصول کی تلقین عملی مثال کے ذریعے لازم تھی، ورنہ خدائے

Marfat.com

تعالیٰ مکہ میں مغلوب نہ تھا۔ ہر جگہ وہی غالب ہے۔ مگر اسلام کو آفاقی بنانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسلام پر وطن کو قربان فرماتے۔ مشرکین اور مستشرقین اپنی کوتاہ بینی کے باعث ہجرت کو ''فرار'' قرار دے دیتے ہیں۔ اگر یہ فرار تھا تو فتح مکہ کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واپس مکہ میں آ کے قیام پذیر ہونے کی راہ میں کون سے موانع تھے؛ اس وقت تو تمام کفار و مشرکینِ مکہ سر تسلیم خم کر چکے تھے۔

ہاں مگر ترکِ وطن ایک بہت بڑی آزمائش ہے۔ اصول کی خاطر اور نظریئے کی خاطر ترکِ وطن..... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے: ''احب شیء عنداللہ الغرباء قیل من الغرباء. خدا کو پردیسی سب سے زیادہ عزیز ہیں۔ پوچھا گیا کون سے پردیسی؟ بات تو ٹھیک ہے۔ تجارت کے لیے بھی لوگ پردیس میں جاتے ہیں، تعلیم کے لیے بھی، شادی کی خاطر بھی، منصب کے باعث بھی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمائی: قال الفرّارون بدینھم یجتمعون الی عیسیٰؑ بن مریم یوم القیامۃ''۔ وہ لوگ جو دین کو بچائے رکھنے کی خاطر بھاگے پھرتے ہیں۔ اس جگہ کی تلاش میں رہتے ہیں جہاں ان کا دین محفوظ رہ سکے۔ وہ قیامت کے روز عیسیٰؑ بن مریم کے درجے میں ہوں گے''۔

از روئے اسلام یہ تھا وطن کا مسئلہ۔ دوسرا مسئلہ نسل و نسب آتا ہے۔ اس ضمن میں غزوۂ بدر کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ تاریخ کی رُو سے وہ ذرا سی جنگ تھی۔ مگر اصولی اعتبار سے دیکھنا چاہیے کہ اس جنگ نے فیصلہ کیا صادر کیا تھا۔ ایک فیصلہ ہجرت نے صادر کیا تھا کہ مسلم ملّت کا پیوند خاک سے نہیں، افلاک سے ہے۔ دوسرا فیصلہ جو بدر کے غزوے نے صادر کیا وہ یہ تھا کہ اسلام کے علمبردار ایک اصولی برادری ہیں۔ ان کا رشتہ روحانی ہے۔ چنانچہ امت ایک طرف تھی، قوم دوسری طرف تھی۔ امت میں انصار تھے اور غیر عرب بھی مثلاً حضرت بلالؓ، اور قوم میں اہل مکہ اور خونی رشتہ دار۔ اس غزوے نے بتایا کہ والد، بھائی، چچا، بیٹا، ماموں، بھانجا، داماد وغیرہ کوئی رشتہ دین سے عزیز تر نہیں۔ خون کو نظریئے نے کاٹ کر رکھ دیا۔ قوم کو ملّت نے پرے پھینک دیا:

دل بہ محبوب حجازیؐ بستہ ایم
زیں جہت با یک دگر پیوستہ ایم

باقی رہا زبان کا بیان تو ظاہر ہے کہ اہلِ مکہ کی بھی وہی زبان تھی جس میں قرآن نازل ہوا:

Marfat.com

لسانٌ عربیٌ مبین ..... بڑی واضح اور صریح عربی زبان۔خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی یہی زبان تھی بلکہ آپ کی زبان تو عرب میں فصیح ترین تھی۔''انا افصح العرب''، مطلب یہ کہ مادہ پرستوں کا نیشنلزم جن سہاروں پر استوار ہے اور جس نیشنلزم کے باعث نوع انسان نوع انسان کی شکاری ہے قرآن اسی فساد کو برباد اور اسی شرارت کو غارت کرنے کے لیے آیا تھا.....قرآن کا اعلان تمام انسانی برادری کے لیے حریت اور آزادی کا پیغام ہے اور خود اعتمادی کا درس ہے کہ انسانی برتری مال منال، نسب و نسل اور رنگ و لسان کی لعنت اور حوالے سے نہیں ناپی جائے گی۔ جو جتنا صاحبِ اتقا ہوگا جتنا بدی سے بچے گا خدا کے نزدیک اتنا ہی زیادہ مکرم ہوگا۔اور جو بدی سے دور ترین ہوگا وہ خدا کے حضور مکرم ترین ہوگا۔ان اکرمکم عنداللّٰہ اتقاکم. (49/13) قرآن نے اس طرح اولادِ آدم کی بلندی و پستی کے معیار ہی بدل کر رکھ دیے.....باقی ہر قدر کو اخلاق اور آدمیت کے تابع کر دیا۔اصل فسادِ آدمیت، آدم کی ناخود شناسی ہے۔وہ مقامِ آدمیت سے ناآگاہ ہو کر وحشی ہو جاتا ہے۔اور ہوس کا پتلا بن کر دوسروں کا خون پینے لگتا ہے۔جو زیادہ قوت والا ہے اور زیادہ وسائل کا مالک ہو وہ نسبتاً زیادہ تکلیف دہ ثابت ہو سکتا ہے لہٰذا اصل فتنہ طبقاتی کشمکش نہیں، اصل فتنہ ہوس اور بہیمیت ہے جو ایسے شاخسانے پیدا کرتی ہے۔ یہ بہیمیت کمزوروں میں بھی ہے، ہاں ان کی ضرر رسانی کی حدود محدود ہیں۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مزاجاً اور طبعاً متقی ہیں۔ان کی ''عصمت'' از بے چادری.....انسانی اخلاق میں ناتربیت یافتہ غریب ہو یا امیر وہ اپنے اختیار کا ناجائز فائدہ اٹھائے گا۔لہٰذا اصل بات یہ ہے کہ آدمی کے مزاج سے حیوانی ہوس نکال دی جائے اور یہ اس کی روحانی قوت کو بیدار اور بااقتدار کیے بغیر ممکن نہیں۔ مادی بیماریوں کا علاج مادی ذرائع سے نہ ہو سکے گا۔

جمال الدین افغانی

ظلم اور استحصال کی امنگ ختم کرنے کی ضرورت ہے۔پھر نہ طبقے بنیں گے نہ ان میں جنگ ہوگی۔ چنانچہ علامہ اقبال بزبان جمال الدین افغانی ملت روسیہ کو یہی پیغام دے رہے ہیں کہ قرآن کی روشنی میں اور خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ شریعت کے مطابق پیدا کردہ اخوت اصل شے ہے۔جس میں قیصری و کسرائی ناپید ہو کر رہ جاتی ہے۔مگر اس کے لیے روس کے

Marfat.com

اندر انقلاب پیدا کیا جائے اور وہ بالقلوب خدا پر ایمان لائے بغیر اور ہر دم خدا کی یاد کو دل میں تازہ رکھے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے کہ یاد خدا کی برکت اور روشنی کے بغیر افکار بھی صحیح راہ کی جستجو میں ناکام رہتے ہیں۔ بہرحال حضرت علامہ نے مولانا جمال الدین افغانی کی زبان سے روس کو خطاب کر کے کہا:

داستان کہنہ سُستی باب باب
فکر را روشن کن از ام الکتاب
با سیہ فاماں یدِ بیضا کہ داد!
مژدۂ لاقیصروکسریٰ کہ داد!
جز بقرآں ضیغمی روباہی است
فقر قرآں اصل شاھنشاہی است!!
فقر قرآں اختلاطِ ذکر و فکر!
فکر را کامل نہ دیدم جز بذکر!!

اگر عالمِ انسانیت کا مصدر ایک ہے۔ معاد ایک ہے۔ تو معاش ایک کیوں نہیں، ان کی زندگی کے مسائل اور وسائل کو بھی تو کسی ایک ضابطے کا پابند کرنا ہوگا، اور یقیناً وہی ضابطہ مفید اور کامیاب ترین قرار دیا جاسکتا ہے جو قرآن کی بنیادی اور اصولی ہدایات کے تحت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نافذ فرمایا تھا اور جسے آپ ﷺ کے خلفائے راشدین نے پھیلتے ہوئے تقاضاؤں کے مطابق وسعت سے ہم کنار کر کے آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے بڑے نمایاں خطوط متعین کر دیے اور خاکے بنا دیے۔ لہٰذا عالمِ انسانیت کے لیے یہ بات قطعاً مفید نہ ہوگی کہ اسے اخلاقی اور روحانی تعلیم قرآن کی روشنی میں دی جائے اور اس کی معاش غیر قرآنی اصولوں پر استوار کی جائے۔ یہ تو قرآن پر جزواً ایمان لانے والی بات ہوگی۔ ''افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض''۔(2/85).....عالمِ انسانیت، عالمِ قرآن بنے گا تو جب ہی انسان کے عذاب ختم ہوں گے اور وہ عالمِ قرآن مختصراً یہ ہوگا۔ ذیل میں درج کردہ اشعار حضرت علامہ نے مولانا جمال الدین افغانی کی زبان سے کہلوائے ہیں اور زندہ رود کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہلوائے ہیں، زندہ رود علامہ خود ہیں

Marfat.com

سوال زندہ رود:

''زورقِ ماخاکیاں بے ناخداست
کس نداند عالمِ قرآں کجاست''

جواب افغانی:

عالمے در سینۂ ما گم ہنوز
عالمے در انتظار قم ہنوز
عالمے بے امتیاز رنگ و خوں!
شام او روشن تر از صبح فرنگ!
عالمے پاک از سلاطین و عبید!
چوں دلِ مومن کرانے ناپدید!!
عالمے رعنا کہ فیضِ یک نظر!
تخم او افگند در جانِ عمر!
لایزال و دارد آتش نو بنو
برگ و بارِ محکماتش نو بنو!
باطنِ او از تغیر بے غمے
ظاہر او انقلابے ہر دمے !!
دل بآیاتِ مبیں دیگر بہ بند
تابہ گیری عصر نو را در کمند!

مختصراً یہ کہ وہ جہاں یعنی جہانِ قرآں ابھی انتظارِ حکمِ ''قم'' کر رہا ہے، جلوہ نمائی کے لیے بے تاب ہے۔ اس جہاں میں رنگ وخون اور آقا وغلام اور شاہ وگدا کی تمیز ختم نہ ہوگی۔ وہ عالمِ حسیں جس کی ایک جھلک نے حضرت فاروق اعظمؓ کے دل کو متغیر کر دیا تھا۔ وہ دائمی عالم جس میں نئے نئے جلوے اور نئے نئے تماشے جنم لیتے رہیں گے اور اس کی آیات محکمات کی شان خوب سے خوب تر ہو کر سامنے آتی رہے گی۔ اس کے مبادی واصول بڑے محکم ہیں۔ بظاہر خارجی تقاضے بدلتے رہیں گے اور وہ اصول ان خارجی تقاضوں سے بخوبی نبٹتے رہیں گے۔ عصر نو کی زمام جبھی

Marfat.com

تھام سکو گے کہ قرآن پر از سرِ نو بتمام و کمال عمل پیرا ہو جاؤ۔ حضرت علامہ نے ابلیس کی مجلس شوریٰ میں بھی

''خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں''

کہہ کر بعض غلط فہمیوں کی وضاحت کی کوشش کی تھی۔

اشتراکی فلسفہ

علامہ اقبال نے ابلیس کی زبانی اپنا یہ عقیدہ واضح کر دیا کہ اسلام ہی دنیائے آدم کا وہ دین ہے جس نے صحیح معنوں میں انسانی معاشرے کے اندر اخوت کی روح پھونکی اور ایک اصولی برادری کو جنم دیا۔ پھر یہ وہ دین ہے جو پختہ اصولوں پر مبنی ہے۔ بس کسر اتنی ہے کہ جن لوگوں کو اس دین کا حامل جانا جاتا ہے وہ خود غافل ہیں۔ وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں اس لیے کہ انہیں معلوم ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سلطانیٔ لولاک کے لیے ابدی دستور عطا فرما رکھا ہے۔ اور وہ دستور قرآن ہے جو ہر زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیتا ہے اور ہر عصر کے مسائل کا جواب پیش کرتا ہے۔ وہ دستور قرآن ہے جو ایک بے مثال، مثالی سوسائٹی کی تعمیر کا واضح نقشہ پیش کرتا ہے۔ وہ سوسائٹی جس میں ''آدمیت احترام آدمی'' کی روح اصل الاصول ہو لہٰذا کوئی کسی کا حق نہ چھینے، کوئی کسی کو اپنے سے کمتر نہ جانے، کوئی کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرے۔ وہ سوسائٹی جس سے تعلق رکھنے والے افراد ایمانِ محکم کے باعث فقط ایک اللہ سے ڈریں لہٰذا موت کو خاطر میں نہ لائیں۔ حضرت علامہ نے ابلیس کی زبانی یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اشتراکی نظریات کی اساس محض ایک ردِ عمل ہے، ذہنی ژولیدگی ہے، ایک ہلچل ہے اور بس۔ یہ انسان کے دائمی ہمہ نوعی تقاضوں کا جواب نہیں۔ چنانچہ کہا ہے:

دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد!
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو

Marfat.com

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس ملّت سے ہے!
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطن قیام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے!
ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے!!
وہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے!

آخری شعر میں عجیب طنز پوشیدہ ہے کہ قرآن کی بدولت مسلم کو دنیا کے اقتدار کی زمام اپنے ہاتھ میں لینا تھی۔ یہ اسی قرآن کو غلط سلط نئے معنی پہنانے اور اس کے ''باطنی'' معنی تلاش کرنے کے شوق میں الجھ کر رہ گیا ہے اور اس طرح جہاد زندگانی سے فارغ ہو گیا ہے۔

ان اشعار کی روشنی میں حضرت علامہ کا وہ بیان اور بھی بیّن ہو جاتا ہے جو انہوں نے 24 جون 1923 کے ''زمیندار'' میں شائع کرایا تھا۔ جس میں اس الزام کی تردید بالتاکید کی گئی تھی کہ وہ بالشویک خیالات کے مالک ہیں۔ اس بیان کی آخری سطور یہ تھیں:

''مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا، ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے۔ فأصبحتم بنعمته اخوانا..... میں اسی نعمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں بن سکتے جب تک کہ وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں۔

موجودہ صورت میں روسیوں کا اقتصادی نصب العین خواہ کیسا ہی محمود کیوں نہ ہو ان کے طریق عمل سے کسی مسلمان کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان یورپ کی پولیٹکل اکانومی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآن کریم کی اقتصادی تعلیم پر نظر ڈالیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل اس کتاب میں پالیں گے''۔ (گفتار اقبال۔ جنوری 1996ء ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب صفحہ 7,8)

Marfat.com

حضرت علامہ بالشویک خیالات کے مالک تو کیا ہوتے، وہ تو خود بالشویکوں کو قرآن کے نور سے ہدایت یاب ہونے کی تلقین کرتے ہیں تا کہ انہیں پتہ چلے کہ ان کے آئین کی حیثیت کیا ہے۔

آفریدی شرع و آئین دگر
اندکے با نور قرآنش نگر
از بم و زیر حیات آگہ شوی!
ہم ز تقدیر حیات آگہ شوی!

مگر حضرت علامہ کو دکھ اس بات کا ہے کہ خود مسلمان یورپ کی پولیٹکل اکانوی کے نظری بحوث دیکھ کر اور سطحی مطالعہ کے زور پر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں۔

فلسفۂ یونان

یونانی فلسفہ یورپ کے مزاج بلکہ نفسیات میں اس طرح داخل ہوا کہ مسیحیت بھی اس کا تدارک نہ کر سکی۔ الٹا مسیحیت بھی ''یونانیت'' کی نذر ہو گئی۔ ''یونانیت'' کا پیر تسمہ پا خود مسلمان مفکرین، معلمین اور فلاسفہ کے لیے بھی بہت سے معاملات میں الجھنیں پیدا کرنے کا باعث بن گیا۔ قرآن کی صریح تعلیمات یونانی استدلال اور نقطہ نظر کی پیدا کردہ دھند میں دھندلا کر رہ گئیں۔

اس بارے میں خود حضرت علامہ کی اپنی تشریح ملاحظہ فرمایئے۔ وہ کہتے ہیں: ''فلسفۂ یونان کی حیثیت تاریخ اسلام میں ایک زبردست ثقافتی قوت کی سی رہی ہے۔ لیکن جب ہم علمِ کلام کے ان مختلف مذاہب پر نظر ڈالتے ہیں جن کا ظہور فلسفۂ یونان کے زیر اثر ہوا اور ان کا مقابلہ قرآنِ پاک سے کرتے ہیں تو یہ اہم حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ یونانی فلسفے نے مفکرین اسلام کے مطمح نظر میں اگرچہ کچھ وسعت پیدا کر دی تھی مگر بحیثیت مجموعی قرآن مجید میں ان کی بصیرت محدود ہو کر رہ گئی۔ سقراط کی توجہ صرف عالم انسانی پر تھی۔ اس کے نزدیک انسان کے مطالعے کا بہترین موضوع انسان ہی ہو سکتا ہے، نہ کہ نباتات اور حشرات یا ستاروں کی دنیا، مگر اس سے کس قدر مختلف ہیں قرآن پاک کی تعلیمات، جس کا ارشاد ہے کہ شہد کی مکھی ایسی حقیر شے بھی وحیٔ الٰہی سے بہرہ ور ہوئی اور جس نے بار بار اس امر کی دعوت دی کہ ہواؤں کے مسلسل تغیر و تبدل کا مشاہدہ

Marfat.com

کیا جائے۔ نیز دن رات کے اختلاف، تاروں بھرے آسمان اور بادلوں کا جو فضائے لامحدود میں تیرتے پھرتے ہیں۔ سقراط کے شاگرد رشید افلاطون کو بھی ادراک بالحواس سے شدید نفرت رہی۔ اس کا خیال تھا کہ ادراک بالحواس سے کوئی علم تو حاصل نہیں ہوتا تاہم اس کی بنا پر صرف ایک رائے قائم کر سکتے ہیں۔ برعکس اس کے قرآن مجید نے سمع و بصر کا شمار اللہ کے گراں قدر انعامات میں کیا اور ان صلاحیتوں کو انسانی سمع و بصر کو عنداللہ اپنے اعمال و افعال کا جواب دہ ٹھہرایا۔ یہ وہ حقیقت تھی جسے شروع شروع کے مسلمانوں نے قرآن مجید میں یونانی ظن و تخمین سے مسحور کر نظر انداز کر دیا۔ بہ الفاظ دیگر انہوں نے اس کا مطالعہ بھی فکرِ یونانی ہی کی روشنی میں کیا اور پھر کہیں دو سو برس میں جا کر سمجھے اور وہ بھی پورے طور سے نہیں کہ قرآن پاک کی روح اساسات یونانیت کے منافی ہے۔

''یونانیت'' کا ایک یہی نقص کیا کم ہے کہ خدا کا واضح تصور نہیں ابھرتا، یونانیوں کا خدا بے بس سا خدا ہے۔ جو اپنی مرضی نافذ کرنے کا 'محتاج'' نہیں۔ اس کا کائنات میں تغیر و تبدل چاہنا گویا اس کی محتاجی پر دال ہے۔ وہ محرکِ غیر متحرک ہے۔ وہ ایک بار کارخانہ کی مشین کو چالو کر کے بیٹھ رہا ہے۔ ایسا خدا تو مجیب الدعوات نہیں ہو سکتا۔ قرآن کا خدا سمیع الدعا ہے اور دعا قبول کرتا ہے۔ ''اجیب دعوۃ الداع اذا دعان''۔

پھر یہ کہ خدائے یونان، ''فاطر السموات والارض ''نہیں یعنی وہ وہی خلاق نہیں جس نے عدم سے وجود پیدا کیا۔ یونانیت کا تصورِ خدا خلاقی کی صفت سے تقریباً خالی ہے اس لیے کہ یونانیت مادے کو بھی ازل سے موجود مانتی ہے۔ خدا نے مادے سے اسی طرح کام لیا جس طرح کوئی صناع اپنی صنعت کے لیے پہلے سے موجود مادے کو کام میں لاتا ہے۔ مثلاً بڑھئی، جو لکڑی کا خالق نہیں مگر لکڑی کو مختلف صورتیں عطا کر دیتا ہے۔ گویا خدا بھی ایک بہت بڑا یا سب سے بڑا صناع ہے۔ خلاق اور مبدع نہیں۔ خلاق اور صناع میں تو زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پھر یہ کہ قرآن کے خدا نے نہ صرف ہر شے پیدا کی بلکہ ہر شے کا ایک ضابطہ و اندازہ اور قاعدہ و تخمینہ بھی مقرر کر دیا جس کے مطابق ہر شے کو اپنی تکمیل کرنا ہے۔ گویا ہر شے پر اس کا حکم چل رہا ہے۔ ''سبح لله مافی السموات وما فی الارض ''۔ ہر شے کی تقدیر کے مقرر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شے کی تخلیق کا کوئی مقصد ہے۔ اور اس طرح گویا پوری کائنات کا کوئی مجموعی مقصد ہے: ''ما خلقنا السموات والارض وما بینهما لا عبین ''۔ کائنات کی تخلیق محض کھیل تماشے کی

Marfat.com

بات نہیں جیسا کہ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ دیوتاؤں نے اپنے دل بہلاوے اور تفریح کی خاطر یہ کھیل پیدا کر دیا جس کو دنیا کہتے ہیں۔ اس طرح گویا آدمی محض ایک ''کردار'' ہے جسے ایک رول دے دیا گیا ہے اور اس میں اس کی اپنی مرضی ہرگز کارفرما نہیں۔ وہ ذمہ دار فرد نہیں کہ جزا و سزا کا مستوجب ہو۔ اس کی تخلیقی قوتیں گویا اس کی اپنی مرضی اور عزم اور انتخاب سے کوئی نسبت نہیں رکھتیں۔ قران ایک ایک فرد بشر کو جوابدہ جانتا ہے اور متنبہ کرتا ہے کہ تمہیں خدا کے حضور حساب دینا ہوگا: ''اِنَّ الینا ایابھم ثم اِنَّ علینا حسابھم'' اور ہر ایک کو اپنی اپنی جواب دہی کے لیے اکیلے جانا ہوگا۔ وکل آتِیہِ یوم القیامۃ فردا۔ خواہ کسی فرد کا عمل اس کی انفرادی حیثیت سے زیادہ تعلق رکھتا ہے یا اس کی اجتماعی حیثیت سے، سزا و جزا کے لیے اسے اکیلے ہی حاضر ہونا ہوگا۔ چنانچہ اسلام کسی موروثی گناہ کا قائل نہیں نہ کسی ایک فرد کا دوسرے کے گناہ پر مستوجب سزا ہونے کا۔ غرض کہاں خدائے یونان اور کہاں خدائے قرآن۔ مگر یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ مسلمان مفکرین اور فلاسفہ، کلاسیکی یونانی فلسفہ سے اس طرح مرعوب ہوئے کہ قرآن کی آیات کو اسی کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرنے لگے جس طرح وہ آج کے مادی افکار سے متاثر ہو کر قرآن کو مارکس اور لینن کی تعلیمات کی توضیح کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے ہمیشہ ان ''تجاوزات'' کے خلاف احتجاج کیا ہے چنانچہ تفسیر رازی کو علامت بنا کر ہدایت کرتے ہیں کہ روح قرآن کو دیکھیے اور اصل قرآن کی صداقت کو دیکھیے۔ مفسرین و شارحین کی نکتہ آرائیاں اور باریکیاں ایک طرف رکھ دیجیے۔

چوں سرمۂ رازی را از دیدہ فروشستم
اسرار جہاں دیدم پنہاں بکتاب اندر

یونانی فلسفہ اور اس کی فکری ذریت کا ایک ''وصف'' اور ہے وہ یہ کہ وہ قلب کو کھا جاتی ہے، اور وہ عقل ہی کے خیالات و مشاہدات کو سب کچھ جاننے لگتی ہے۔ علامہ اقبال کو عقل سے کوئی عداوت نہیں، وہ بھی عقل کو اللہ کی دین جانتے ہیں۔ وہ بھی عقل کو نور مانتے ہیں۔ البتہ ہر شے کی ایک حد ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ عقل سب کچھ نہیں ہے کوئی شے اور بھی ہے جو عقل سے بہت آگے لے جاتی ہے۔ اور وہ قلب ہے۔ قلب وجدان کا مصدر ہے اور قلب وحی الٰہی کا مہبط ہے۔ عقل کی نظر محدود ہے۔ قلب کی نظر غیر محدود ہے۔

Marfat.com

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں !
دل بینا بھی کر خدا سے طلب!
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں!

ترے سینے میں دم ہے دل نہیں ہے
ترا دم گرمی محفل نہیں ہے !!
گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور!
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

Marfat.com

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب

قلبِ مطمئن

عقل ادراک بالحواس کی گدی نشین ہے۔ لیکن حقیقت مطلق کے تمام و کمال مہم کی خاطر، ادراک بالحواس کے ساتھ ساتھ اس چیز کے مدرکات کا اضافہ بھی ضروری ہے جسے قرآنِ پاک نے فؤاد یا قلب سے تعبیر کیا:

الَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ. ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ. ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ. (32/7-9)

ترجمہ: ''وہی ہے جس نے جو چیز بنائی خوب ہی بنائی۔ اور انسان کی پیدائش گارے سے شروع کی پھر چلائی اس کی نسل نچڑے ہوئے بے قدر پانی سے پھر اسے درست کیا اور اس میں اپنی طرف سے روح پھونکی اور تم کو آنکھ اور کان اور دل دیے۔ مگر تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو''۔

اور جب علامہ اقبال نے یہ فرمایا کہ:

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

تو اس میں ایک یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ ادراک بالحواس اس وقت تک قابلِ اعتماد نہیں جب تک عقل کی بادشاہی کے ساتھ ساتھ دل کی شہنشاہی کارفرمانہ ہو۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

لاتعمی الا ابصار ولکن تعمی القلوب الّتی الصدور

ترجمہ: ''آنکھیں نہیں اندھی ہو جاتیں وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں''۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا

ترجمہ: ''تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل لگ رہے ہیں''۔

Marfat.com

دل اندھے ہوجائیں تو سامنے کی چیزیں بھی دکھائی نہیں دیتیں۔خیروشر میں فرق نہیں رہتا۔نوروحکمت میں امتیاز ختم ہوجاتا ہے۔اس لیے کہ دل کے اندھے ہونے کا مطلب ہے کہ بدن کی حکمرانی، حیوانی پہلو کا حاوی اور مسلط ہونا، جبلت کی وحشت اور ہوس کی ظلمت۔حسّی قویٰ کے علم سے تحلیل وتجزیہ کرکے اصول اخذ کرنا عقل کا کام ہے مگر اس اصول پر قائم ہوجانا، اس اصول کے لیے ہر طرح کی قربانی پیش کرنا یہ مرحلہ عقل کی قلمرو سے باہر ہے۔یہ مرحلہ ایمان کا مرحلہ ہے اور قلب کی ہدایت اور فیصلے کے بغیر ممکن نہیں۔ایمان ہی کی مزید لطیف اور شدید صورت عشق ہے۔ گویا عقل تو معلومات حاصل کرنے تک اور تجزیہ وتحلیل تک رہ گئی، معلومات کے جذبہ بننے، جزو جان بننے، ایمان وایقان بننے اور جنون وعشق بننے کی ساری کیفیتیں آگے کی کیفیتیں ہیں۔ان کا کارخانہ دماغ نہیں۔ان کا کاشانہ دل ہے۔قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَّ رَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ

ترجمہ:''اور ہم نے ان کے دل مضبوط کردیے تھے جب وہ لوگ پختہ اور مستعد ہو گئے تو بولے ہمارا پروردگار وہی تو ہے جو زمینوں اور آسمانوں کا پروردگار ہے''۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِكُمْ

ترجمہ:''لیکن اللہ نے ایمان کو محبوب بنادیا اور اسے تمہارے دلوں میں سجادیا''۔

اس طرح واضح ہوا کہ جسے اللہ پر ایمان لانا کہتے ہیں وہ محض اقرارِلسانی نہیں۔۔۔۔ایمان تو اسی وقت ایمان بنا جب دل میں راسخ ہوا۔خدا، وحی، فرشتہ، رسالت اور رسول، عقل کے بس کی بات نہیں۔یہ امر عقلیین کے تجزیے کی ہر گرفت سے آزاد ہے۔اللہ کی طرف سے آنے والی وحی کا نور اسی نور کی مدد سے پہچانا جاسکتا ہے جو''نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوْحِیْ'' کی بدولت آدمی کے اندر موجود ہے۔اور اس کا مقام قلب ہے یعنی وحی کا رابطہ براہ راست قلب سے ہو تو بات سمجھ میں آ گئی۔اگر قلب سے بے تعلق ہو تو الفاظ کی ایک نادر ترتیب سے زیادہ کچھ نہیں۔یہ ٹھیک ہے کہ خود وحی کا حکم یہ ہے کہ غور وفکر کرو۔عقل کو کام میں لاؤ۔شعور کی شمع جلاؤ۔غور وتدبر کرو، مگر پہلے وحی کی صحت پر ایمان بالغیب ہو تو بات بنے۔مطلب یہ ہوا کہ عقلی دلیلوں اور منطق کے اصولوں اور فلسفے کی باریکیوں سے ایمان نہیں سیکھا جاسکتا۔اکتساب عشق نہیں کیا جاسکتا۔جبھی تو حضرت علامہ نے فرمایا تھا:

Marfat.com

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف

مگر ضمیر پر قرآن کس طرح نازل ہو اور وہ ضمیر کس طرح تیار ہو۔ اس ضمن میں حضرت علامہ ہی کا بیان پیش کیا جاتا ہے۔ اقتباس طویل ہے مگر ضروری، حضرت علامہ فرماتے ہیں:

''یہ حقیقت اس طرح سمجھ میں آئے گی کہ یہ کالج میں میری تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا۔ میرا معمول تھا کہ ہر روز نماز فجر کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا۔ اس دوران میں والد ماجد بھی مسجد سے تشریف لے آتے اور مجھے تلاوت کرتا دیکھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ میں کبھی ایک منزل ختم کر چکا ہوتا کبھی کم۔ ایک روز کا ذکر ہے والدِ ماجد حسب معمول مسجد سے واپس آئے۔ میں تلاوت میں مصروف تھا مگر وہ جیسے کسی خیال میں میرے پاس بیٹھ گئے۔ میں تلاوت کرتے کرتے رک گیا، اور منتظر تھا کہ مجھ سے کیا ارشاد فرماتے ہیں، کہنے لگے: تم کیا پڑھا کرتے ہو؟ مجھے ان کے اس سوال پر نہایت تعجب ہوا۔ بلکہ ملال بھی۔ انہیں معلوم تھا کہ میں قرآنِ پاک کی تلاوت کر رہا ہوں۔ بہر حال میں نے مودبانہ عرض کیا: قرآنِ پاک۔ کہنے لگے: تم جو کچھ پڑھتے ہو سمجھتے بھی ہو۔ میں نے کہا: کیوں نہیں، تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں۔ کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں۔ انہوں نے میرا جواب خاموشی سے سنا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں حیران تھا آخر اس سوال سے ان کا مطلب کیا ہے۔ کچھ دن گزر گئے اور یہ بات جیسے آئی گئی ہو گئی۔ لیکن اس واقعہ کو چھٹا روز تھا کہ صبح سویرے میں حسب معمول قرآنِ پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔ والد ماجد مسجد سے واپس آئے اور میں نے تلاوت ختم کی تو انہوں نے مجھے بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے کہنے لگے:
''بیٹا! قرآنِ مجید وہی سمجھ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو''۔ مجھے تعجب ہوا حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآنِ پاک کیسے کسی پر نازل ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ میرے دل کی بات سمجھ گئے۔ کہنے لگے: تمہیں کیسے یہ خیال گزرا کہ اب قرآنِ مجید کسی پر نازل نہیں ہوگا۔ کیوں نہ تم اس کی تلاوت اس طرح کرو کہ جیسے یہ تم پر نازل ہو رہا ہے۔ ایسا کرو گے تو یہ تمہارے رگ و پے میں سرایت کر جائے گا۔ میں ہمہ تن گوش والد صاحب کی بات سنتا رہا بلکہ اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا کہ قرآنِ مجید کی تلاوت ویسے ہی کروں جیسے ان کا ارشاد ہے۔ انہوں نے کہا: سنو اللہ تعالیٰ کا ارادہ عالمِ انسانیت کو جس معراج پر پہنچانے کا تھا اس کا آخری کامل اور مکمل نمونہ ہمارے نبی اکرم محمد

Marfat.com

مصطفیٰ احمد مجتبیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ ستودہ صفات میں ہمارے سامنے پیش کر دیا لہٰذا ہم کہیں گے کہ آدم علیہ السلام سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک کہ خاتم الانبیاء ہیں جتنے بھی نبی مبعوث ہوئے ان میں سے ہر ایک کا گزر مدارج محمدیہ ہی میں سے ہو رہا تھا، وہ گویا ایک سلسلہ تھا جس کا خاتمہ ذاتِ محمدؐ کی تشکیل پر ہوا۔

والد ماجد نے پھر خود ہی اپنے اس ارشاد کی تشریح کی۔ انہوں نے کہا: شعورِ انسانی کی تکمیل کے ساتھ ساتھ بالآخر جب وہ مرحلہ بھی آ گیا کہ زندگی اپنے مقصود کو پالے تو ذاتِ محمد بھی اپنی پوری شان سے جلوہ گر ہو گئی۔ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ بابِ نبوت بند ہوا۔ انسانیت اپنے معراجِ کمال کو پہنچی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسوۂ حسنہ کاملہ بھی ہر اعتبار سے ہمارے لیے حجت، مثال اور نمونہ ٹھہرا۔ اب جتنا بھی کوئی اس رنگ میں رنگتا چلا جائے گا اتنا ہی قرآنِ مجید اس پر نازل ہوتا رہے گا۔ یہ مطلب تھا میرے اس کہنے کا کہ قرآنِ مجید اسی کی سمجھ میں آ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو"۔ (اقبال کے حضور۔ سید نذیر نیازی)

خود آگاہی

ظاہر ہے کہ جب قرآن ضمیر پر اترے اور وحی کی طرح اترے تو جبھی صحیح معنوں میں اس کا مفہوم سمجھ میں آئے گا اور جبھی قرآنی احکام اور ہدایات کو یقین کے ساتھ اور انشراحِ صدر کی کیفیت میں قبول کیا جائے گا۔ اس کے بغیر قرآن ضابطہ زندگی اور دستور و آداب اور آئینِ آدمیت نہیں بن سکتا۔ اس کے بغیر قرآن کی خاطر اہلِ قرآن کے لیے اور آئین قرآن کے نفاذ و تحفظ کی غرض سے نہ سر دھڑ کی بازی لگائی جا سکتی ہے نہ راہِ جہاد کھلتی ہے نہ شرفِ شہادت حاصل ہو گا۔ سرگرمی، سرشاری اور عزم، قرآن کو جزوِ جان بنائے بغیر یہ ممکن نہیں۔ حدیث میں آتا ہے: "رُبَّ تال للقرآن والقرآن یلعنه"۔ ترجمہ: "بعض لوگ قرآن پڑھتے ہیں اور قرآن ان پر لعنت بھیج رہا ہوتا ہے"۔

مقامِ شوق بے صدق و یقیں نیست
یقیں بے صحبتِ روح الامیں نیست
گر از صدق و یقیں داری نصیبے!!
قدم بیباک نہ کس در کمیں نیست!

Marfat.com

حضرت روح الامین کا جلیس و ہمدم ہونے کا مطلب واضح ہے اور وہ ہے قرآن سے قلبی لگاؤ۔اس کے بغیر یقین وایمان کی منزل تک رسائی بے معنیٰ کوشش ہے۔

آدم کی بے بصری کے بارے میں حضرت علامہ نے فرمایا تھا:

نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں
یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا ؟

خود آگاہی، جہاں آگاہی اور خدا آگاہی گویا تین منزلیں ہیں۔پہلی منزل خود آگاہی ہے اور یہ دوسری دونوں کے بغیر کچھ قرار نہیں پاتی۔

شاہد اوّل شعور خویشتن
خویش را دیدن بہ نورِ خویشتن!
شاہد ثانی شعور دیگرے
خویش را دیدن بنورِ دیگرے!
شاہدِ ثالث شعورِ ذات حق
خویش را دیدن بنور ذاتِ حق

پہلی کیفیت مطالعہ ذات کے ذریعے اور دوسری مطالعہ کائنات کے توسط سے اور تیسری تقربِ الٰہی کی روشنی میں حاصل ہوگی۔پھر پہلی دونوں کیفیتیں بھی تو تیسری کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتیں۔کل کا تصور نہ ہو تو کبھی جز و کی حیثیت، ضرورت، عمل، فرض اور اہمیت سمجھ میں نہیں آسکتی۔خالق کے حوالے کے بغیر مخلوق کی ماہیت کیا کھلے اس لیے کہ وہ تو موجود ہی اسی کے باعث ہے۔ بقول غالب:

پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

کتاب ہدایت کی سب سے پہلی آیت جو نازل ہوئی وہ تھی'' اقـــرا بســم ربك الـذی خلق '' پڑھو اللہ کے نام سے وہ اللہ جس نے پیدا کیا۔گویا اصول طے ہو گیا کہ کائنات اللہ کی خلاقی کی مظہر ہے اور اس خلاقی کے باب میں روشن ترین کتاب ہدایت و معلومات اللہ کے نام یا یوں کہہ لیں کہ اس کی صفات کی تفہیم کے بغیر سمجھ میں نہ آئے گی۔غرض آدمی اللہ کے حوالے کے بغیر نامکمل ہے اور اللہ کے حوالے کے بغیر کائنات کی صحیح شناخت بھی محال ہے اللہ کے احکامات اور اس کی

Marfat.com

کائنات کو اللہ کے عطا کردہ نور کی روشنی میں دیکھا جانا ممکن ہے گویا قرآن کو انسان اس لیے پڑھتا ہے تاکہ وہ قرآن کی روشنی میں اپنا جائزہ لے اور جو کچھ وہ ہوا سے پھر قرآن کی روشنی میں ہی پرکھے:

چوں مسلماناں اگر داری جگر
درضمیرِ خویش و در قرآں نگر

بال جبریل کا یہ شعر بڑا دلچسپ ہے۔ کم از کم اس شعر کی جو تعبیر میں کرتا ہوں اس کی رُو سے یہی محسوس ہوتا ہے۔

محمدؐ بھی ترا جبریلؑ بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

میں اس شعر کو ہمیشہ اس طرح سمجھتا ہوں کہ اے خدا قرآن تیرا ہے جو تیرے بھیجے ہوئے فرشتے نے تیرے بھیجے ہوئے رسول مقبول حضرت احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیا۔ مگر اے خدا یہ بتا کہ قرآن کی یہ دل افرز اور میٹھی باتیں ترجمانی کس کی کرتی ہیں۔ اے خدا یہ تیری ترجمانی کرتی ہیں یا آدم کی؟ ظاہر ہے کہ وہ کتاب آدم کی ہدایت اور بہبود کے لیے آئی تھی تاکہ آدم کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کرے اور پھر اللہ کے ساتھ اس کا جو رشتہ ہے اس کی روشنی میں اور اللہ کے علم کامل کے حوالے سے اسے سمجھائے کہ خیر کیا ہے، شر کیا ہے۔

قرآن کا ارشاد ہے: ''وَفِی الْاَرْضِ آیات للموقنین وفی انفسکم افلا تبصرون''۔

ترجمہ: ''یقین لانے والوں کے لیے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں اور خود تمہاری ذات میں بھی۔ کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتا''۔

دوسرا ارشاد ہے: ''اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّھَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ''۔

ترجمہ ''بے شک رات اور دن کے الٹ پلٹ اور اللہ نے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے ان میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو اللہ سے ڈرتے ہیں''۔

اور یہ مضمون بار ہا دہرایا گیا ہے اور ہمیشہ خدا کی خلاقی کے حوالے سے دہرایا گیا ہے۔ خدا

Marfat.com

کی خلاّقی کے حوالے کے بغیر محض علوم طبیعی کیمیاوی اور حیوانی کے ذریعے خواہ وہ کتنے ہی ترقی کر جائیں انسان کا مقام نہیں جانا جاسکتا نہ اس کی ماہیت سمجھی جاسکتی ہے۔ خواص اشیاء کے باب میں نامربوط و متفرق آگاہی یعنی اشیائے فرد فرد سے تعارف ہوسکتا ہے جو ممکن ہے ترقی کرتے کرتے وحدۃ الوجود کی منزل تک لے جائے مگر یہ تعارف بہرحال ادراک بالحواس اور تعقل و تفکر سے آگے نہیں لے جاسکتا۔ دین کی یافت اور شناخت کا ذریعہ دل ہے جو وجدان کی عینک عطا کرتا ہے۔ اور وہ آگے کا مرحلہ ہے۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں:

''پھر جب ہم ان حقائق پر نظر ڈالتے ہیں جن کا تعلق ہمارے اپنے محسوسات و علامات سے ہے تو اس سے بھی یہی نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ حقیقت مطلقہ اپنی کنہ میں محض روح ہے اور اس لیے ہمیں اس کا تصور بطور ایک ''انا'' ہی کے کرنا چاہیے۔ لیکن یہاں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ مذہب کے عزائم فلسفے سے بلند ہیں۔ فلسفہ عبارت ہے حقائق کے عقلی ادراک سے لہٰذا وہ کسی ایسے تصور سے آگے نہیں بڑھتا جو ہمارے محسوسات و مدرکات کی گوناگوں دنیا کو ایک نظام میں مدغم کردے۔ وہ گویا دور ہی سے حقیقت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ برعکس اس کے مذہب اس سے قرب و اتصال کا آرزومند ہے۔ ایک نظریہ ہے دوسرا حقیقت تقرب اور اتصال لیکن یہ تقرب اور اتصال جبھی ممکن ہے کہ فکر اپنے حدود سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے جس میں اسے کامیابی ہوگی تو اس روش کی بدولت جسے مذہب نے دعا سے تعبیر کیا ہے، اور جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لب مبارک پر تادم آخر تھی۔

سیرِ زانو نیز ممکن نیست بے فرمان عشق!
پیش ما آئینہ است اما بدستِ دیگراست

آئینہ یعنی قرآن کے حوالے سے اگر آدم خود بیں یعنی خود شناس ہو اور اپنی ذات سے آگاہی رکھتا ہو تو اسے یقین میسر آجاتا ہے کہ اس کا مقام بہت ہی اونچا ہے۔ اس ضمن میں حضرت علامہ نے اپنی تائید میں گوئٹے کے الفاظِ ذیل درج کیے ہیں:

''قرآنِ مجید کا حقیقی مقصد تو یہ ہے کہ انسان اپنے اندر ان گوناگوں روابط کا علمی شعور پیدا کرے جو اس کے اور کائنات کے درمیان قائم ہیں۔ قرآنی تعلیمات کا یہی وہ بنیادی پہلو ہے جس کے پیش نظر گوئٹے نے باعتبار ایک تعلیمی قوت اسلام پر من حیث الکل تبصرہ کرتے ہوئے ایکرمن

Marfat.com

سے کہا تھا تم نے دیکھا اس تعلیم میں کوئی خامی نہیں، ہمارا کوئی نظام اور ہمیں پر کیا موقوف ہے کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا"۔

تخلیقی فعّالیت

گمان یہی ہے کہ گوئٹے نے خود قرآن نہیں بلکہ اس کا ترجمہ پڑھا اور اس کے باوجود اتنا متاثر ہوا۔ اگر وہ اصل قرآن پڑھنے پر اور اس کے مفاہیم کو براہ راست سمجھنے پر قادر ہوتا تو اس کا دل زندہ نہ جانے اسے کیا کیا سرشاری عطا نہ کرتا۔ اس لیے کہ ترجمۂ قرآن خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اصل "عربی مبین" کے بھرپور مفہوم کو اور پھر اس کے لازوال صوتی آہنگ کے اثر کو قطعاً منتقل نہیں کرتا۔ پروفیسر ہٹّی لکھتے ہیں کہ اسلوب قرآن اسلوب الٰہی ہے۔ بے نظر، ناقابلِ تقلید ہونا اس کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ اس کی تجوید میں بڑی تاثیر ہے۔ اس کا فنی جوہر اور جذبات آفرین پیغام ترجمے کی صورت میں اپنا اکثر کمال کھو بیٹھتا ہے۔

یہ قرآن ہے جو آدم کو بتاتا ہے کہ وہ نائب خدا ہے اور خدا کے بعد جملہ عناصر پر فرمانروائی اسی کی ہوگی۔ اسے بلندیوں، پستیوں، ہواؤں، بجلیوں، شعلوں، برفوں، طغیانیوں، جنّوں، عفریتوں، حیوانوں اور درندوں اور موسموں کے گوناگوں انقلابوں سے ہرگز گھبرانا نہیں چاہیے۔ اس لیے کہ گو اس کا وجود بظاہر بڑا عاجز ہے مگر اس کے اندر روح خداوندی کا جو ذرۂ نور مستور ہے وہ مفتوح ہونے کے لیے نہیں آیا۔ لہٰذا آدم کو اپنے اندر تغیر پیدا کرنا ہوگا۔ ہر صورت حال کا مقابلہ کرنے کی خاطر اللہ کی ودیعت کردہ صلاحیتوں سے کام لینا ہوگا۔ جی چاہتا ہے کہ بال جبریل کی نظم "روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" یہاں ساری نقل کر دی جائے۔

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ!
مشرق سے نکلتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایامِ جدائی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ !!
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ!
ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں

Marfat.com

یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں!
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں!
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ!
سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے!
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے!
پہنچیں گے فلک تک تیری آہوں کے شرارے
تعمیر خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ!
خورشید جہاں تاب کی ضَو تیرے شرر میں
پوشیدہ ہے ایک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ
تابندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے
تو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے
تو ''پیرِ صنم خانۂ اسرار'' ازل سے!
محنت کش و خوں ریز و کم آزار ازل سے
ہے راکب تقدیر جہاں تیری رضا دیکھ

پہلے دو بندوں میں کائنات کے مختلف مظاہر و مناظر دکھائے گئے ہیں تا کہ آدم فطرت کے کاروبار کا گہری نظر سے مطالعہ کر لے اور پھر آدم کو یہ خبر دی گئی کہ تم ان عناصر پر قابض ہو جاؤ گے اور اس لیے قابض ہو جاؤ گے کہ اللہ نے تمہارے وجود میں وہ تمام جوہر ودیعت کر دیے ہیں جو حاکمیت کے قابل بناتے ہیں۔ طبیعی موانع انسان کے عزم و ارادہ کی راہ نہیں روک سکتے۔ جان ڈیوی لکھتے ہیں:

Marfat.com

Knowledge is power and knowledge is achieved by sending the mind to school of nature to learn her process of change.

انسان کی بے پناہ صلاحیتوں کے اس مفہوم کو بال جبریل کی اشاعت سے قبل حضرت علامہ نے اپنے خطبات میں بایں الفاظ بیان کیا تھا اور قرآن کی ضمانت کے ساتھ بیان کیا تھا:

''جب اس کے گردوپیش کی قوتیں اسے اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں تو وہ ان کو جیسی چاہتا ہے شکل دے سکتا ہے اور جس طرف چاہے موڑ سکتا ہے۔ یعنی اگر اس کا راستہ روک لیں تو اسے یہ قدرت حاصل ہے کہ اپنے اعماقِ وجود میں اسے بھی ایک وسیع تر عالم خیال کر لے جہاں اس کو لا انتہا مسرت اور فیضانِ خاطر کے نئے نئے سرچشمے مل جاتے ہیں۔ اس کی زندگی میں آلام ہی آلام ہیں اور اس کا وجود برگِ گل سے بھی نازک۔ بایں ہمہ حقیقت کی کوئی شکل ایسی طاقتور، ایسی ولولہ خیز اور حسین و جمیل نہیں جیسی روحِ انسانی لہٰذا باعتبار اپنی کنہ کے، جیسا کہ قرآنِ پاک کا ارشاد ہے انسان ایک تخلیقی فعالیت ہے ایک صعودی روح جو اپنے عروج و ارتقا میں ایک مرتبۂ وجود سے دوسرے میں قدم رکھتا ہے۔

فَلَا اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ. وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ. وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ. لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ. (84/16-19)

ترجمہ: ''میں قسم کھاتا ہوں شفق کی اور رات کی اور ان چیزوں کی جن کو وہ سمیٹ لیتی ہے اور چاند کی جب وہ پورا ہو جائے کہ تم کو ضرور ایک درجے یا حالت سے دوسرے درجے تک پہنچنا ہے''

۔پھر بیداری اور نئی زندگی چاند کا آغاز اور تکمیل۔ اللہ نے ان سب چیزوں کی قسم کھا کر کہا تمہارا ارتقا اور سفرِ رفعت جاری رہے گا۔ یہ کائنات محض تکرار نہیں۔ یہ بڑھتی ہوئی اور ہر لحظہ ترقی پذیر کائنات ہے۔ یہاں رکاوٹ نہیں۔ اور بالخصوص انسان وہ شے نہیں جسے ایک ہی حالت پر رہنا ہو۔ انسان کی ترقی کی راہ میں کائنات کی ہر شے مدد ہے اور اس راہ کی سجاوٹ ہے، اس کی موت بھی زیادہ سے زیادہ نیند ہے جس کے بعد وہ تازہ دم ہو کر اٹھے گا اور مزید آگے کو بڑھے گا۔

Marfat.com

صعودِ آدم

اس طرح قرآن حوصلہ افزائی کرتا ہے ایک دور کے بعد دوسرا دور آئے گا۔ اور قرآن کے نزدیک ہر دور کی حیثیت محض ساعات کی سی ہے۔ لہٰذا حامل قرآن یعنی مردِ مسلمان کو ہمت اور حوصلے سے یہ منازل طے کرنا چاہئیں۔ اس کے فسانے اور زمانے بے حساب ہیں۔ وہ کسی ایک منزل پر رک نہیں سکتا۔ وہ رکے تو ایک نئی دنیا لا کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ اس کی تسخیر پر ابھارتا ہے مگر یہ کتاب زندہ صاحب ایمان کے دلِ زندہ کی طلبگار ہے:

صد جہانِ تازہ در آیات اوست
عصر ہا پیچیدہ در آیات اوست
بندۂ مومن ز آیات خداست
ہر جہاں اندر بر اُو چوں قباست!
چوں کہن گردد جہانے در برش!
می دہد قرآں جہانے دیگرش

عباس محمود العقاد کہتے ہیں: ''نطشے کا ایک قول ہے جو نہ جانے اس نے سنجیدگی کے ساتھ کہا یا ازراہِ تمسخر۔۔۔۔ کہ انسان، بندر اور فوق البشر (SuperMan) کے مابین پل کی حیثیت رکھتا ہے''۔ یہ قول سنجیدہ ہو خواہ تمسخر ہو بہر صورت وہ پل جو بندر کو فوق البشر میں منتقل کر دے موجود نہیں نہ ہو سکتا ہے۔ اس پل کو نہ بندر تعمیر کرتا ہے اور نہ فوق البشر، اور نہ خود انسان اور نہ دست فطرت اس لیے کہ فطرت تو (بقول نطشے) کبھی بلندیوں سے پستیوں کی طرف چل پڑتی ہے اور کبھی پستیوں سے بلندیوں کا رخ کر لیتی ہے۔ کوئی مقصد پیشِ نظر نہیں ہوتا۔

ہاں جو کہنا روا ہے یہ ہے کہ انسان زمین سے آسمان تک ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس پل کو تعمیر کرنے والا خدا ہے۔ اس پل کی نیو اسفل سافلین ہے اور چوٹی اعلیٰ علیین۔ مٹی سے برآمد ہونے والا آدمی جس کی جبلت میں ہے کہ روحانی اور عقلی آفاق تک چڑھتا چلا جائے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

يَاَيُّهَا الْاِنسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ. (84/6)

Marfat.com

ترجمہ: ''اے انسان تو اللہ کی سمت ہر محنت و مشقت اٹھاتا چلا جائے گا اور پھر اس سے جا ملے گا''۔

وہ ضرور اللہ تک جا پہنچے گا اس لیے کہ وہ حسب حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خالق کی صورت میں تخلیق کیا گیا ہے۔ اور پھر تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ صورت سے مراد جسدی صورت نہیں بلکہ صفات کے باب میں ہم صورت ہونا ہے اور وہ صفات ہیں ''رحمت، کرم، علم، عمل، مشیت، مجد، عظمت، فتح، ابداع، انشا (خلاقی) وغیرہ۔

اور یہ انسان کو پستیوں سے بلندیوں تک لے جانے والا ذریعہ قرآن ہے جسے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی رسی قرار دیا جو آسمانوں سے زمین تک پہنچی ہوئی ہے اور یہی وہ رشتہ ہے جس سے محروم ہو کر انسان انسان نہیں رہتا اور اسفل سافلین میں جا گرتا ہے۔

انسان کیوں بار بار گرتا ہے؟ اس باب میں انسان کو متنبہ کرنے کے لیے قرآن کریم زور دے کر کہتا ہے ان اقوام کے عروج و زوال کے احوال کا مطالعہ کرو جو تم سے پہلے ہو گزریں۔ وہ قومیں تم سے زیادہ طاقتور تھیں۔ اور آج ان کے آثار کبریائی میں سے محض دھندلے سے نشان باقی ہیں تا کہ تم عبرت حاصل کرو۔ ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی واضح کر دیا کہ قوموں کے زوال کا سبب یہ نہیں کہ اللہ ایک خاص مدت تک نعمت دے چکنے کے بعد ان سے یونہی شوقاً اور شغلاً توجہ ہٹا لیتا ہے اور پھر اسی طرح شوقاً اور شغلاً کسی دوسری قوم کو نوازنے لگتا ہے۔ یہ بات نہیں۔ انسان خود غافل ہو جاتا ہے۔ ضوابط کی پروا نہیں کرتا، انصاف کی راہ سے ہٹ جاتا ہے۔ فکر و عمل کی دیانت سے اپنے آپ کو عاری کر لیتا ہے۔ دوسروں کے حقوق کو پامال کرنے لگتا ہے۔ نیت میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔ اور اس کی پوری شخصیت کا رویہ انسانی کے بجائے بہیمی ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ اس تدریجی اندرونی زوال کے موافق اس میں قدرت و قوت کی کمی نمودار ہوتی چلی جاتی ہے لہٰذا اس کا رزق، اس کی فارغ البالی، اس کی آزادی، اس کی شان رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ. (8/53)

ترجمہ: ''اور یہ (سب زوال و عتاب) اس سبب سے ہے کہ اللہ کسی بھی نعمت کو کسی پر ارزانی کر چکا ہو تو نہیں بدلتا جب تک وہ لوگ خود جو کچھ ان کے اندر ہے اسے نہ بدل ڈالیں''۔

Marfat.com

مراد یہ ہے کہ انہوں نے حصولِ نعمت کے لیے اپنے اندر جو قابلیت پیدا کی تھی جب اس قابلیت ہی کو باقی نہ رکھا تو نعمت کیسے رہتی۔

تاریخ کا سبق

علامہ اقبال مطالعۂ ذات اور مشاہدۂ کارخانۂ فطرت کے بعد از روئے قرآن تیسرا مصدر علم وآگاہی تاریخ کو قرار دیتے ہیں اور تاریخ کی عطا کردہ بصیرت یہ قرار دیتے ہیں کہ قومیں اپنی اجتماعی غلط کاریوں کی سزا پاتی ہیں۔

"It is one of the most essential teachings of the Quran that nations are collectively Judged and suffer for their deeds here and now."

انفرادی سزا تو ہے۔اس سے مفر کیوں، وہ تو واضح حکم ہے کہ ہر ایک کو اللہ کے حضور آ کے اپنا اعمال نامہ پڑھنا ہوگا۔ باریک سے باریک اندراج بھی صاف نظر آئے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فہمائش کے انداز میں ارشاد ہوگا آج تو تمہاری نظر بہت تیز ہے۔ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ (50/22) مگر قوموں کو سزا اجتماعاً اس وقت ملتی ہے جب اُن میں افراد کی اکثریت غلط کار ہو جائے۔ وہ باقیوں کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان راست رو اور نیک عمل لوگوں کو اللہ اگلے جہان میں زیادہ بہتر بدلہ دے کر راضی کر دے تاہم جب قوموں کو اجتماعی سزا ملتی ہے تو بھلے لوگ بھی اس کی لپیٹ میں ضرور آتے ہی:

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

قرآن تو حضرت علامہ کے نزدیک کتاب زندہ ہے اور زندگی آموز روح عطا کرتی ہے، اس کا بھیجنے والا علیم وحکیم ہے لہٰذا قرآن کی تعلیمات لازوال ہیں اور انہیں کائنات میں رونما ہونے والے حادثات سے کسی قسم کا کوئی اندیشۂ خلل نہیں۔ ہر وہ بات جو حقیقت ہے وہ قرآن ہے باقی باطل۔

آں کتاب زندہ قرآنِ حکیم!
حکمت او لازوال است و قدیم

Marfat.com

قلب مومن راکتابش قوت است!
حکمتش حبل الورید ملت است

قرآن کی تعلیمات روشنی، دانش، ترقی اور قوتِ تسخیر کی ضامن ہیں۔ یہ ابدی فیصلے ہیں، چند سو سالوں یا چند نسلوں کی بات نہیں۔ چھوٹے چھوٹے واقعات جن سے باطل کی قوت ابھرتی دکھائی دے وہ ابد کے سمندر میں بلبلے کی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔ خدا کی مشیت اپنا کام کر رہی ہے اور انسان کے ساتھ جو وعدۂ تسخیر کیا گیا تھا وہ بہر صورت پورا ہو رہا ہے۔ مگر انسان ناشکر گزار ہے۔ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَا اَكْفَرَهٗ (80/17) ترجمہ: ''برا ہو انسان کا یہ کتنا ناشکرا ہے''۔ انسان کی حماقت اور سرکشی، بے صبری اور ناشکر گزاری کے باوصف جو ازلی پیمان تھا اللہ نے اسے نہیں توڑا کہ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (45/13) ترجمہ: ''اور اس نے تمہارے لیے آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اپنی طرف سے مسخر کر دیا''۔ چنانچہ حضرت علامہ یاد دلاتے ہیں۔

آیۂ تسخیر اندر شانِ کیست
ایں سپہر نیلگوں حیرانِ کیست

اور اگر یہ بے بصر آدم خدا شناس بھی ہوتا تو یہ دنیا اپنی وسعتوں کے باوصف تنگیوں کا جہنم دکھائی نہ دیتی۔ وضاقت علیهم الارض.....

قرآن پوری اولاد آدم کے لیے ہے مگر جن تک قرآن نہیں پہنچا وہ قرآن پر عمل پیرا ہونے کے اتنے ذمہ دار نہیں جتنے وہ جن کے پاس قرآن پہنچا۔ جن کے پاس قران پہنچا ان پر قرآن کا حق ہے کہ قرآن کو طاق میں اس طرح نہ سجائیں جس طرح برہمن بت کو طاق میں سجاتا ہے۔

درِ صد فتنہ را بر خود کشادی!
دو گامے افتی و از پا فتادی
برھمن از بتاں طاقِ خود آراست
تو قرآن را سر طاقے نہادی!

تجھے یہ نہیں زیب دیتا کہ تو قرآن کو طاق پر رکھ کر فراموش کر دے بلکہ اس پر عمل پیرا ہوتا کہ دونوں جہانوں کی رفعتیں اور برکتیں تجھے حاصل ہوں۔

Marfat.com

قرآن چھوڑنے سے ہم قرآن سے رسوا و بے خوار ہوتے گئے بقول حضرت علامہ

خوار از مہجوری قرآں شدی
شکوہ سنج گردش دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں افتندہ
در بغل داری کتاب زندہ

ظاہر ہے کہ قرآن بھی تو اللہ کی نعمت ہے جیسا کہ بالکل آغاز میں بحوالہ قرآن بیان ہوا کہ قرآن نور ہے اور قرآن نعمت ہے پھر اگر امت مسلمہ قرآن سے منہ پھیر لے گی حتیٰ کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حضور شکایت فرمائیں گے کہ یارب اِنّ قومی اتخذوا هذا القرآن مهجورا۔ ترجمہ: اے میرے رب میری قوم نے تو قرآن کو بالکل نظر انداز کر رکھا تھا تو نتیجہ یہ ہوگا دنیا جہاں کی دیگر نعمتوں کی طرح قرآن بھی چھن جائے گا۔ قرآن ان کے سپرد کر دیا جائے گا جو قرآن کے حقوق ادا کریں گے۔ حفظ قرآن الحمد للہ بڑی برکت، بڑا نور، بڑی دولت، بڑی نعمت مگر حفظ قرآن سے بڑھ کر جو شے قرآن کا تحفظ کرتی ہے وہ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنا ہے۔ قرآن تقویٰ اور بڑی تعلیم دیتا ہے اس کے مطابق ہر اس کام سے پرہیز لازم ہے جو مستوجب سزا ہو اور ہر اس کام کا اقدام لازم ہے جو باعث اجر ہو۔

Marfat.com

اسلامی تمدن کی اساس

پروفیسر حمید احمد خاں فرماتے ہیں:

''یہ مسلّم ہے کہ تہذیب کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب دینی نظریے کسی ملکی یا علاقائی معاشرت کے سانچوں میں ڈھلتے ہیں۔اس سے مطلب یہ ہے کہ تہذیب اس مرکب اندازِ فکر و عمل کا نام ہے جو کسی قوم کے مذہب اور جغرافیے اور تاریخ اور فنونِ لطیفہ اور علم و حکمت، الغرض ایمان و اخلاق اور عقل و احساس کے تمام سرچشموں سے بہرہ یاب ہو۔ترکیب و عمل کے باوجود مذہب اور تہذیب کی جداگانہ مگر متصل شخصیت اپنی اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔مذہب کے بنیادی حقائق اٹل اور ہر حال میں قابلِ تسلیم ہیں۔اس کے برعکس تہذیب کو لیجیے تو یہ کیا عقل، کیا جمالیات، کیا اخلاق ہر پہلو سے تنقید کی زد میں آتی ہے۔تہذیب میں زوال و فساد بھی ممکن ہے، اس لیے اس میں اصلاح و تغیر کی گنجائش برقرار رہتی ہے''۔(تعلیم و تہذیب، صفحہ 109,110)۔

پروفیسر صاحب مرحوم ذرا آگے چل کر بطور وضاحت رقم طراز ہیں:

''تمدن کے مظاہر خارجی دنیا میں موجود ہوتے ہیں۔مسجد کے گنبد و مینار، نقاشی کے رنگ اور خطوط، غزل کا قافیہ اور ردیف، راگ کے سُر اور بول، یہ سب ایک قومی تمدن کے عناصر ہیں، لیکن تہذیب ایک ذہنی کیفیت یا یوں کہیے کہ ذہنی کیفیتوں کا مجموعہ ہے، جو خارجی دنیا میں بالواسطہ منعکس ہوتا ہے۔ ہماری قومی تہذیب جس ذہنی پس منظر میں ابھری ہے، اس کا سب سے نمایاں عنصر دین اسلام ہے۔''(صفحہ 110-111)

اس سے یہ واضح ہوا کہ افراد معاشرہ کے افکار و کردار کی ایک خاص روش اور احساس و شعور کا ایک ممیز انداز تہذیب ہے اور جب ان انفرادی خصائص کا خارجی اظہار معاشرے اور قوم کی اجتماعی نسبت سے عمل میں آتا ہے تو وہ تمدن کہلاتا ہے۔گویا تمدن ہوا اجتماعی تہذیب کا خارجی اظہار۔ پہلے دل و دماغ میں مسجد کا نقش ابھرتا ہے، اس کا خارجی وجود بعد میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔

Marfat.com

قرآن کے ساتھ شغف دل ودماغ میں پہلے خوشبو بار ہوتا ہے، قرآنی خطاطی اور تزئین بعد میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ تمدن کے خارجی جلوے کم کم ہوتے ہیں۔ ذہنی اوفکری، قلبی اور روحانی جلوے ہر مہذب فرد کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور اس کے روپے میں جھلکتے ہیں۔

افرادی تہذیب افراد کے ہمراہ چلتی ہے، لہٰذا جغرافیے کی قیدی نہیں رہتی۔ پھر جہاں وہ افراد ڈیرہ ڈالتے ہیں اور کسی معاشرے کی بنا استوار کرتے ہیں وہاں وہ تہذیب خارج میں بھی نظر افروزی کرنے لگتی ہے اور اپنے اس وطنی ماحول سے دور، جہاں پیدا ہوئی تھی، اس مسافر اور مہاجر اور پھر آبادکار معاشرے کا نشان، تمدن یا اجتماعی تہذیب کا حوالہ بن جاتی ہے۔

مسجد کا آغاز مدینہ شریف سے ہوا۔ مسلمانوں کے دل ودماغ میں آبادیہ مسجد مسلمانوں کے ہمراہ سیر وسفر میں رہی اور جہاں جہاں مسلمان معاشرے قیام پذیر ہوئے وہاں وہاں مسجد بھی معرضِ وجود میں آ گئی۔ سپین میں عربی اسلامی تمدن بہار دکھانے لگا تو عربی شاعری نے بھی جڑ پکڑی۔ عربی صحرا اور اونٹوں کے مضامین وہاں بھی دہرائے جانے لگے جہاں نہ عربی صحرائی زندگی تھی اور نہ اونٹوں پر زندگی کا انحصار تھا۔ ہسپانوی عرب شعرا، جنہوں نے سرزمین عرب دیکھی بھی نہ تھی بلکہ جو عربی النسل بھی نہ تھے وہ بھی صحرانشین عربوں کے سے مضامین قلمبند کرتے تھے اور لطف لیتے تھے۔ آپ ان اردو شعرا کو دیکھیں جو عربی اور فارسی کے دلدادہ رہے ہیں۔۔۔ ان کی اردو شاعری میں، جو ظاہر ہے عربستان اور ایران کے بجائے برعظیم پاک وہند میں تصنیف کی جارہی تھی، دجلہ وفرات اور جیہون اور سیہون بار بار نظر آتے ہیں، مگر سندھ، جمنا، نربدا، راوی کم کم موجزن دکھائی دیتے ہیں۔ کوہ ابوقبیس، کوہ الوند، کوہ دماوند کا ذکر زیادہ مگر ہمالہ اور بندھیا چل کا تذکرہ شاذ ملتا ہے۔ غالب فرماتے ہیں:

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل بچوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

قطرۂ آب، جس کا ذکر دجلہ کی نسبت سے ہوا، وہ گنگا اور سندھ میں تو بہت زیادہ وسعت دیکھتا۔ دجلہ تو ان دریاؤں کے مقابلے ہماری اپر جہلم نہر کے برابر ہوگا مگر بات ہے ذہنی ماحول کے ٹھوس حقیقی عنصر ہونے کی۔ غالب ہی کا شعر ملاحظہ ہو:

Marfat.com

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
میری قسمت میں یا ربّ کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

اب یہ دل آویز مضمون عرب شعرا کا مضمون ہے۔ غالب کی محبوب یا محبوباؤں کا تعلق آگرہ اور دلی کی تنگ گلیوں سے تو ہوسکتا ہے مگر وہ صحرا کی خیمہ نشین محترمات یقیناً نہ تھیں۔ اسے آپ کیا کہیں گے؟ عرب مسلمانوں کا یہ تہذیبی عنصر شاعری مہاجر ہو کر آیا اور پھر برعظیم پاک و ہند میں بس گیا۔ گویا جغرافیائی وطن غیر وطن میں بھی ساتھ رہا اور اس ''پردیسی'' وطن کی بدولت وہ لوگ بھی عربی شعرا کے خوشہ چین بلکہ عربی المزاج بن گئے جن کا سرزمین عرب سے اصلی اور نسلی کوئی تعلق نہ تھا۔

اسی طرح کا ایک اور تہذیبی منظر ملاحظہ فرمائیں۔ کسی انسانی گروہ کا ذکر ہو رہا تھا۔ میں نے کہا: ''وہ بڑے قد آور لوگ تھے۔۔ چلتے پھرتے شمشاد و صنوبر''..... میرے ایک رفیق کار، جو انگریزی زبان و ادب کے استاد تھے، فوراً بولے: "Like Scotch Highglanders"۔

انہوں نے سکاٹ لینڈ دیکھ نہیں رکھا تھا۔ اب وہ پچھتر برس کے ہو رہے ہیں اور انہوں نے سکاٹ لینڈ اب تک نہیں دیکھا، مگر سکاٹ لینڈ کا ماحول، وہاں کا جغرافیہ اور تہذیب ذہن و دماغ کی فضا کا حصہ ہے۔ انہیں لمبے قد کی نسبت سے اپنے میانوالی، خوشاب، سرحد، قبائلی علاقے اور بلوچستان کے باشندے یاد نہ آئے اور وہ اس لیے یاد نہ آئے کہ ذہنی جغرافیہ بدل چکا تھا۔ آپ ان افراد کا احوال بھی جانتے ہیں جنکی تعلیم انگریزی مدرسوں میں ہوئی، لہٰذا جن کی گفتگو کا لب و لہجہ بھی انگلستانی ہو چکا ہوتا ہے۔ آپ ان سے جب دورانِ گفتگو میں لفظ ''دریا'' زبان سے نکالیں گے تو ان مخاطب عزیز یا عزیزہ کا ذہن فوراً اس کا ترجمہ کرے گا اور دریا River بن جائے گا اور پھر یقین مانیں وہ دریا راوی یا جہلم نہ ہوگا، وہ River لازماً لندن کا ٹیمز ہوگا۔ ایسے عزیزوں کے دل انگلستان کے شوق میں اچھلتے رہتے ہیں۔ ایسے افراد گویا اپنے معاشرے میں کسی غیر معاشرے کے چلتے پھرتے تہذیب پارے ہوتے ہیں۔

یہی عالم مسلمان مسافروں، سیاحوں، معلموں، حملہ آوروں اور تاجروں کا تھا جو غیر مسلم معاشرے میں جا کے قیام فرما ہوتے تھے۔ ان کے ہمراہ جانے والی تہذیب رفتہ رفتہ وطن غیر کے باشندوں کے ذہنوں میں اسلامی معاشرہ آباد کر دیتی اور پھر وطن غیر میں بھی مساجد تقریباً ویسی ہی

Marfat.com

تہذیبی سجاوٹیں دامن میں لیے ہوئے جلوہ دکھانے لگتیں اور وہاں کے لوگوں کے دل کعبے اور مسجد نبوی کی زیارت کے لیے بے تاب ہونے لگتے۔ گویا تمدن کسی مادی اور جغرافیائی ماحول اور حدود کا قیدی نہیں ہوتا۔ اس کے وارث اسے جہاں چاہیں، جا کے تعمیر کر دیں..... یہی دعویٰ خمستان والوں کا ہے کہ

جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی مے خانہ بنے!

الٰھکُم الٰہ واحد اور خلقکم من نفس واحدۃ..... وہ ایک خدا ہی خدا ہے، جس نے ایک ہی پھونک سے یا ایک ہی جان یا سانس سے جملہ اولاد آدم کو پیدا کر دیا..... مطلب یہ کہ روحانی مرکز ایک، بنو آدم کا اصل اور منبع و مصدر بھی ایک، لہٰذا مسلمانوں کو کسی نسلی تعصب اور غرور کا مرض از روئے اسلام لاحق نہیں ہونا چاہیے اور حق یہ ہے کہ دنیا کی بہت سی اقوام کے مقابل مسلمان اپنی دھرتی اور اپنی نسل اور اپنے رنگ کے امتیازات کی مصیبتوں میں کمتر مبتلا ہوتے ہیں ورنہ گوری نسل کے لوگوں نے جہاں کالے یا رنگ والوں (Coloured People) کے معاشرے میں اپنا ڈیرہ جمایا وہاں اپنا گورا گرجا گھر کالوں اور رنگ والوں کے گرجا گھروں سے الگ بنایا۔ اس رویے سے یورپ والوں کی اپنے وطن اور اپنی نسل کے ساتھ ایسی وابستگی نے انہیں حقیقی معنوں میں آدم کی اولاد نہ بننے دیا۔ وطنی، نسلی اور لونی عصبیت فساد روح آدمیت ہے۔ یہ امر آدمی کی اصل اور اساس کا دشمن ہے۔

ہیگل کے بقول ہندوستان کا ہندو معاشرہ اپنے وطن کی دھرتی سے اس طرح بندھا ہوا ہے کہ شاید ہی دنیا کا کوئی دوسرا معاشرہ اس طرح ''زمین پیوست'' ہو(Philosphy of History صفحہ 8)۔ ہندوؤں کا البیرونی کے حسب الرائے عقیدہ یہ تھا اور تا حال ہے کہ بھارت ورش کے باہر کی ہر دھرتی ناپاک ہے، فقط بھارت پوتر یعنی پاک ہے۔ اس کے مقابل ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے ساری دھرتی مسجد ہے، یعنی پاک ہے، لہٰذا کہیں بھی نماز پڑھی جا سکتی ہے ہندوؤں کے دیوتا ہندوستانی ہیں اور ساوتری دیوی کے الفاظ میں ہندوؤں کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اپنے دیوتاؤں کے ہم وطن ہیں (A Warning of Hindus صفحہ 3)۔ مخلوق خدا مسلمانوں کے معبود نہیں۔ ان کا ایک ہی خدا ہے جو خلاق العالمین ہے اور جو کسی ایک خاص خطے یا علاقے کا پابند یا باسی نہیں..... اسی کے مشرق، اسی کے مغرب، اسی

Marfat.com

کے شمال، اسی کے جنوب! اس پر ایمان رکھنے والا مردِ مومن بھی خطوں اور جہتوں کا بندھا ہوا نہیں۔ اس کا ایک ہی خدا ہے جو جہانوں کا خدا ہے، لہٰذا سارے جہانوں کی فضائیں صاحبِ ایمان کی جولانگاہ ہیں بلکہ بقول علامہ اقبال: سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی!

یورپ والوں نے غیر ابیض اقوام میں اپنا تمدن زیادہ پھیلایا، دین اس کے مقابلے میں کم پھیلایا، یا یوں کہہ لیجیے کہ دین پھیلانے کے باب میں انہیں اتنی کامیابی نصیب نہ ہوئی جتنی تمدن پھیلانے میں۔ عشرت کدے، قمار خانے، میکدے، تھیٹر اور لہو و لعب کے دیگر محل جو انہوں نے بنائے وہ گرجاؤں کے مقابل بہت زیادہ تھے۔ حق بات یہ ہے کہ یورپی اقوام کی قلبی اور فکری تہذیب مسیحی نہ تھی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات و سیرت ان کے سامنے نہ تھی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس سیرت کے مفصل نقوش قلمبند بھی کب ہوئے؟ یورپ والوں کے رگ و ریشہ میں جو تہذیب سمائی ہوئی ہے وہ یونانی دیوتاؤں کے کردار پر استوار ہے۔ یونانی دیوتا ظالم بھی تھے اور بہادر بھی، دروغ گو بھی تھے اور عاشق مزاج بھی، مغوی بھی تھے اور محرم در (Incestuous) بھی، چنانچہ یورپ والے اگر کسی کو ہیرو تصور کرتے ہیں تو اس میں حضرت مسیح کے اوصاف تلاش نہیں کرتے بلکہ اس میں وہ اوصاف تلاش کرتے ہیں جو یونانی دیوتاؤں میں پائے جاتے تھے، جن کے لیے کوئی اصول نہ تھے، جن کے لیے حق و ناحق یا حرام و حلال کا کوئی مفہوم نہ تھا۔

ہر تہذیب کے سیاسی عناصر میں مذہب اور عقیدہ بڑا اہم یا سب سے اہم عنصر ہوتا ہے تو پھر جہاں کئی متضاد الاوصاف خدا ہوں .....خواہ یونانی ہوں، خواہ ہندی .....وہاں وحدت کردار یا مزاجوں اور سیرتوں کے اندر توحید کس طرح کارفرما ہو سکتی ہے؟ ایسے اشخاص توازن و تناسب پر مبنی، حرام و حلال کے شعور پر مبنی، اخلاق و آداب کے مالک کیونکر بن سکتے ہیں؟ مسلمانوں نے دنیا والوں کو اہلِ یورپ کے استعماری ہتھکنڈوں کے بجائے اپنی سیرت سے متاثر کیا۔ یہ ان کی اندرونی تہذیب تھی جس نے غیر مسلموں کو سوچنے پر مجبور کیا کہ آخر وہ کون سا ضابطۂ حیات ہے جس نے مسلمانوں کو اس انداز کی تہذیب سے نوازا ہے کہ یہ لوگ ہر جگہ نماز پڑھ سکتے ہیں، یہ لوگ رنگ و نسل کا تعصب نہیں برتتے۔، یہ لوگ امانت دار ہیں، یہ لوگ اپنی دولت کا حصہ مفلسوں کو ان کا حق سمجھ کر ادا کرتے ہیں، ان کے کوئی بت نہیں ہیں، عمومی مزاج مہمان نوازی اور سیر چشمی کا ہے .....خواہ یہ مسافر ہیں، خواہ سیاح، خواہ تاجر، خواہ بادشاہ.....اور حق یہ ہے کہ دین بادشاہوں کے

Marfat.com

باعث نہیں پھیلا۔ وہ اسلامی تہذیب تھی جس میں کشش تھی۔ آپ دنیا کا نقشہ سامنے رکھیں: وہ ممالک بھی سامنے ہیں جہاں مسلمانوں نے باہر سے آ کے حکومتیں قائم کیں اور وہ ممالک بھی سامنے ہیں جہاں مسلمان کبھی عساکر کے ساتھ حملہ آور نہیں ہوئے۔ شمالی ساحلی افریقہ کو چھوڑ کر سارے براعظم افریقہ کی کروڑوں افراد پر مبنی آبادی مسلمانوں کی عسکری یورش کے باعث مسلمان نہیں ہوئی۔ خلیج سے لے کر مراکش تک، یعنی ساحل بحر اوقیانوس تک، جتنے مسلمان آباد ہیں شاید اس سے زیادہ فقط انڈونیشیا میں بس رہے ہیں اور وہاں نہ امویوں نے حملہ کیا نہ عباسیوں نے نہ مغلوں نے نہ سلجوقیوں نے نہ عثمانیوں نے۔ یہی عالم ملیشیا اور کمبوڈیا، فلپائن اور چین کا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے، 1951 میں پانچ ہزار ترک فوجی کوریا گئے۔ وہ عہد جدید کے فوجی لوگ تھوڑا سا اسلامی تہذیب کا رنگ بھی رکھتے تھے۔ ان کے کردار کا کوریا والوں پر اثر ہوا۔ کوریا والوں نے نہ تو ان کا قرآن پڑھا تھا نہ ان کی شاندار مساجد دیکھی تھیں نہ ان کے فنون اور ان کی صنعتیں ملاحظہ کی تھیں۔ مراد یہ ہے کہ ان کا تمدن اپنی شکوہ کے ساتھ اہلِ کوریا کے سامنے نہیں آیا تھا۔ اس کے باوصف ترکوں کی کوئی تہذیب تو تھی جس نے ان کو متاثر کیا اور آج وہاں ہزاروں کوریائی مسلمان ہیں اور ان کی حیثیت کوریائی زندگی کے سمندر میں ایک اسلامی جزیرے کی سی ہے جو خود مختار بھی ہے اور خود کفیل بھی (Children of Allah صفحہ 3)۔

مسلمانوں کے عقائد کا مرکزی نقطہ توحید ہے۔ ان کے اعمال، ان کے آداب اور ان کے اخلاق میں عقیدہ توحید کے تناسب سے وحدت پائی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک اوصافِ الٰہی کے پرتو کی بہترین مثال حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ہے۔ اس عقیدے کا اولین خارجی مظہر مسجد ہے۔ احکامِ دین اور سرچشمۂ ہدایت وحکمت قرآن کریم ہے۔ مسجد سادہ بھی مسجد ہے، مگر وقت کے ساتھ ساتھ، جیسا کہ لازماً ہوتا ہے، مزاجوں میں نفاست آتی ہے۔ مسلمانوں نے بھی مساجد کو سنوارنا شروع کیا۔ اسی طرح قرآن کے کلمات کو خوبصورت سے خوبصورت خط میں لکھنا شروع کیا۔ گویا مسلمانوں کے نمایاں ترین نمونہ ہائے تمدن میں ان کا ایک فن تو فنِ تعمیر ہے جس کی اساس تعمیر مساجد تھی اور دوسرا فن خطاطی ہے، جس کی بنا قرآن کریم سے محبت ہے۔ پھر انہوں نے مساجد کی دیواروں، قوسوں، محرابوں اور چھتوں کو آیاتِ قرآنی سے مزین کیا۔ کلمات قرآن کو اس طرح سنگ و رنگ میں پیش کیا کہ وہ کلمات بذاتِ خود گل،

Marfat.com

گلدستے اور پھولوں کے تختے دکھائی دینے لگے۔قرآن کریم کی خطاطی میں مسجد کے گنبدوں اور میناروں کی گولائیوں سے مشابہ نقش گری سے کام لیا گیا۔ازاں بعد پھولوں اور بیلوں سے قرآن کو بھی سجایا گیا اور مساجد کو بھی۔پھر تزئین قرآنی کا یہی خوش ذوق طریق دیگر علمی و دینی تصانیف اور خصوصاً شعری مجموعوں کی خطاطی کے کام آیا اور مساجد کی تزئین کا فن قصر اور محل اور قلعے اور مدرسے اور مقبرے کی تعمیر میں رنگ دکھانے لگا۔

مساجد ہی کی تزئین نے مسلمانوں کے بعض معاشروں کو قالین میں محرابوں کے نقش بھرنے کا شوق دلایا۔پھر جس طرح محرابوں کو بیل بوٹوں سے سجایا جاتا تھا اسی طرح قالینوں اور غالیچوں کو مزین کیا جانے لگا۔سنگ تراشی میں مسلمانوں نے وہ وہ نفاستیں اور باریکیاں پیدا کیں کہ بیان کی گرفت میں نہیں آسکتیں۔لیکن خواہ رنگ ہو خواہ سنگ، مسلمانوں نے انسانی وجود کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔اس کے مقابل ہندی، چینی، یورپی سنگ تراشی کے مظاہر زیادہ تر انسانی پیکروں کی تخلیق پر مبنی ہیں۔یورپ کی نقاشی ہو یا سنگ تراشی، سب میں نمایاں بلکہ مرکزی مقام آدم کی تصویر کشی اور پیکر تراشی کو حاصل ہے اور اس ضمن میں یونانی روایت صدیوں غالب رہی ہے۔

اسلام نے آغازِ کار میں بت پرستی کا قلع قمع کرنے کی خاطر انسانی تصویر سازی اور پیکر گری کی شدید الفاظ میں مخالفت کی، جس کا اثر صدیوں تک رہا۔یہ بھی ظاہر ہے کہ دینی اثر تھا اور کسی خاص خاکِ وطن سے وابستہ نہ تھا۔یورپی مسلمانوں نے یورپ میں رہتے ہوئے بھی آدمی کی تصویر کشی کو اپنے مصورانہ فن کمال کا مرکزی نقطہ نہ بنایا۔ہاں، بیل بوٹے خوب بنائے۔واضح رہے کہ ہر تمدن انسانی شعور، افکار، عقائد، جذبات امید و بیم وغیرہ عناصر کا ترجمان ہوتا ہے۔جو کسی معاشرے کے اندرون ہوگا وہی تمدن کا روپ دھارے باہر آئے گا۔کوئی قومی اخلاق جب رنگ یا پیکر اختیار کرے تو وہ کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ وہ قومی آداب و اخلاق کا پرتو ہوگا اور اخلاق کی اساس عقائد ہیں.....وہ بت پرستوں کے عقائد ہوں یا مظاہر پرستوں کے، ارواح پرستوں کے ہوں یا خدا پرستوں کے.....پھر انہی عقائد کا پرتو ہیں تمدنی جلوے! عقائد ماحول کی پیداوار ہوں تو فن بھی ماحول کا قیدی.....مگر اسلام کسی وطنی یا جغرافیائی ماحول کا قیدی نہیں، لہٰذا اسلام جن جن کے دلوں میں اترتا ہے ان کا ادب و اخلاق ایک خاص سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔نتیجہ یہ کہ بخارا، بیجنگ، ٹوکیو، رباط اور جکارتہ کے مسلمان ایک دوسرے کے مزاج شناس ہیں۔انہیں باہمی پسند اور ناپسند کا

Marfat.com

علم ہے، لیکن اسی شہر کے رہنے والے غیر مسلم افراد کا دنیا کے بارے میں، حرام وحلال کے بارے میں، طہارت وعصمت کے بارے میں، مہمانی ومیزبانی کے بارے میں اور شرم وحیا کے بارے میں جداگانہ نقطۂ نظر ہوگا۔ ہم نے برعظیم پاک وہند میں یہ منظر دیکھا۔ جے اے رحیم کے والد سر عبدالرحیم متحدہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے صدر تھے۔ ان کا بیان ہے:

''ہم ہندوستانی مسلمانوں میں کوئی افغانستان، ایران، وسط ایشیا، چین کے مسلمانوں عربوں اور ترکوں کے یہاں سفر کر رہا ہو تو اس کی اجنبیت دور ہوتے ذرا دیر نہیں لگتی اور وہ یوں محسوس کرنے لگتا ہے گویا اپنے ہی گھر میں ہے۔ اسے کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس کے ہم عادی نہ ہوں اور جو ہماری دیکھی بھالی نہ ہو، مگر اس کے خلاف ہندوستان میں جب ہم اپنی گلی عبور کر کے اس حصے میں چلے جائیں جہاں ہمارے ہم شہر ہندو رہتے ہیں تو ہم سماجی معاملات میں اپنے آپ کو ہندوؤں سے بالکل دور اور اجنبی پاتے ہیں (الیف کے درانی: Meanings of Pakistan صفحہ 2)

حضرت سعدی کی ''گلستان'' کا مطالعہ کیجئے تو مسلم ملت کی وحدت کا منظر کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ حضرت سعدی ایک جانب دیار مغرب (مصر سے مغرب کی سمت واقع شمالی افریقہ کے ساحلی علاقے) کے کسی بدمزاج، تند خو استاد مدرسہ کا ذکر کرتے ہیں تو دوسری طرف کاشغر کی جامع مسجد میں عربی صرف ونحو پڑھنے والے کسی خوبرو طالب علم کی کیفیت بیان کرتے ہیں اور ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعدی کا دور طوائف الملوکی کا دور تھا..... ہر دوسرے تیسرے شہر کا کوئی اور ہی بادشاہ تھا، مگر ''گلستان'' بتاتی ہے کہ نیل کے ساحل کے پرے کاشغر تک کہیں بھی تہذیبی منظر اور اخلاقی وادبی انداز واسلوب نہیں بدلتا، اگرچہ مصر سے لے کر کاشغر تک خدا جانے کتنے وطن پڑتے تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ اشتراک عقائد نے اس وسیع آبادی کو عموماً ایک ہی طرح کے رویے عطا کر رکھے تھے..... ان کی تہذیب کی اساس اسلام پر استوار ہونے کے باعث ان میں اساسی نقطہ ہائے نظر توحیدی منظر پیش کر رہے تھے۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن لکھتے ہیں:

"We understand an object only when

Marfat.com

there is something in us akin to it. when any picture or poem or life produces in us a wonderful effect we may be sure that there is an interior responding wonderthat meets it."

(An Idealist View of Life, London 1964)

توحیدی عقیدے کے باعث اور توحیدی تعلیم کی بدولت مسلمانوں کے مزاج جس تہذیبی سانچے میں ڈھل جاتے ہیں وہ ظاہر وخارج میں انہی جلوہ ہائے تمدن کو پسند کر سکتے ہیں جوان کے مزاجی، تہذیبی انداز واسلوب اور رویے اور نقشے سے متوازی ہوں اور عیاں ہے کہ اس صورت حال کی اساس دین ہے نہ کہ کوئی خاص خطہ، جغرافیائی ماحول یا نسلی اختصاص۔

Marfat.com

ملّتِ مسلمہ.....شاہ پسند کہ فقیر دوست

تاریخ اجتماعی حافظے کا دوسرا نام ہے۔ جس طرح فرد سے حافظہ چھن جائے تو ''دیوانہ'' نظر آنے لگے اسی طرح اگر کسی قوم سے اس کی تاریخ چھین لی جائے تو وہ احمق ہو کر رہ جائے۔ تاریخ آن پر جان دینا سکھاتی ہے۔ تاریخ عبرت کا درس دیتی ہے۔ تاریخ تازیانے لگاتی ہے۔ جو کچھ پایا وہ کیوں پایا، جو کچھ کھویا وہ کیوں کھویا مگر جس طرح ہم اپنے اردگرد سرسری نظر سے دیکھتے ہیں اور گزر جاتے ہیں اسی طرح تاریخ کے اوراق کو بھی دفع الوقتی کے وسائل سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ ہم بصارت کو کافی جانتے ہیں۔ بھول جاتے ہیں کہ بصارت کو بصیرت ہی کسی منزل پر پہنچاتی ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ کے درجنوں پہلو ہیں۔ سیاسی پہلوان میں سے فقط ایک ہے مگر بدقسمتی سے اہلِ مدرسہ نے سیاسی تاریخ ہی پر زور صرف کیا۔ چنانچہ ہمارے نزدیک تاریخ کا معنی محدود ہو گیا۔ مزید برآں یہ کہ سیاسی تاریخ کو بھی اصول وقواعد سے عاری کر کے محض بادشاہوں کی فتوحات واموات کی داستان بنا کر رکھ دیا گیا۔ پھر جب یہ بات ذہنوں میں راسخ ہو گئی کہ تاریخ اسلام کا مطلب ہے تاریخ شاہانِ اسلام تو دیگر مطالب ونتائج میں سے ایک یہ ہے کہ مسلمان من حیث الملت بادشاہت پرست ہیں۔

مگر بادشاہوں کی تاریخ کے متوازی مسلمانوں نے فقیروں اور درویشوں کی تاریخ بھی مرتب کی ہے۔ وہ بے نیاز فقیر اور درویش جن کے مزاج میں خلق خدا کی ہمدردی راسخ تھی۔ جن کا وظیفۂ حیات اولاد آدم کی تعلیم وتربیت تھا۔ جو جہاں بیٹھتے تھے رُشد وہدایت کی شمعیں روشن کر دیتے تھے۔ جو بڑے ہی مصروف معلم ومدرس تھے۔ آپ عہد ماضی کے کسی بھی بڑے درویش، فقیر اور صوفی کا تصور کیجئے۔ اس جمعیت کا تقریباً ہر فرد اپنے دور کے علوم عقلی ونقلی میں طاق تھا۔ وہ علمی کمال کے بعد روحانی جمال کا اکتساب کرتا تھا۔ حضرت داتا گنج بخش کے بقول یہ قریباً سب لوگ اصحابِ علم تھے''۔ ایشاں اہلِ علم بودہ اند''۔ ''علموں بس کریں او یار'' اور ''اِکو الف تیرے

Marfat.com

درکار'' کے مقولے پر غور کریں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حواس خمسہ اور عقل کے ذرائع سے حاصل کردہ آگاہی سے اہل شوق کا پیٹ نہیں بھرتا چنانچہ وہ روحانی اور وجدانی وسائل اختیار کرتے ہیں۔ ''اکوالف تیرے درکار'' کہنے کے لیے ضروری ہے کہ پتا ہو کہ ''الف'' کے آگے کیا کچھ ہے جو ''الف'' کے آگے کچھ جانتا ہی نہیں وہ ''اکوالف'' کہہ ہی نہیں سکتا۔

کہنے کا مطلب یہ تھا کہ فقرائے امت اور درادیش ملت تقریباً سب کے سب بڑی محنت سے علوم مروجہ حاصل کرتے تھے۔ ان میں سے اکثر مصنف تھے اور کئی کئی کتب کے مصنف۔ مثال کے طور پر فقط خواجہ فریدالدین عطار ہی کا تذکرۃ الاولیاء اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ عموماً ہر بزرگ کے احوال کے ساتھ اس کی علمی تصنیفی منزلت وکاوش کا ذکر موجود ہے۔ مطلب یہ کہ ہمارے صوفیاء وفقراء محض تارک الدنیا سادھو نہ تھے۔ خلوت ان کی زندگی کی گوناگوں منزلوں میں سے ایک منزل تھی۔ اگر وہ محض تارک الدنیا ہوتے تو امت کے افراد کے ساتھ اتنا گہرا رابطہ کیونکر قائم رکھتے۔

میں بادشاہوں اور درویشوں کی تاریخ کو ساتھ ساتھ دیکھتا ہوں تو عام نظریے اور خیال کو باطل پاتا ہوں یعنی میں امت کو شاہ پسند کی بجائے فقیر دوست دیکھتا ہوں۔ شاہوں کی حیثیت انتظامی امور کی زمام سنبھالنا تھی اور یہ بڑی ضروری ڈیوٹی تھی۔ یہاں میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ از روئے دین نسلی بادشاہی کا ادارہ جواز پذیر ہے یا نہیں۔ خودمختاری مطلق العنانی استبداد وغیرہ یہ دیگر مسائل ہیں۔ فی الحال شاہ اور فقیر سلطان اور درویش جیسے کہ وہ ہیں زیر نظر ہیں۔ ہاں مگر فقیر اور درویش سے مراد گداگر اور بھک منگا نہیں۔ اس سے مراد وہ مستغنی اور بے نیاز افراد امت ہیں جو اپنے عزم وارادہ سے درویشی اور فقر کو بطور طرز حیات منتخب کرتے ہیں۔ یہ ان کے حالات کی مجبوری نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس یہ ان کے اختیار کی آن بان ہوتی ہے۔ یہ مزاج اور قلب کی ایک کیفیت کا نام ہے۔

ایک طرف بادشاہوں نے اقتدار سنبھالا، امن کا بندوبست اور انصاف کا اہتمام کیا۔ جو آئین ہوا نافذ کیا اور اسے تحفظ دیا۔ بیرونی حملوں کا سدِ باب کیا وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اجتماعی زندگی کی صیانت وحفاظت کے لیے حکومتی ادارہ لازم اور ناگزیر ہے۔ دوسری صورت میں افراتفری اور انارکی جسے قرآن ''فتنہ'' کہتا ہے اور اسے قتل سے ہولناک تر قرار دیتا ہے۔ یہی باعث ہے حضرت علیؓ نے خوارج کے نعرہ ''لاحکم الا للہ'' (حکم فقط اللہ کا) کے جواب میں فرمایا تھا: ''نیک کلمہ ہے مگر

Marfat.com

اس سے بدی مقصود ہے"۔ حکومت کے بغیر چارۂ کار نہیں۔ وہ صالح حکومت ہو خواہ فاسق، حکومت کے بغیر افراتفری مچ جاتی ہے اور کسی شے کا تحفظ ممکن نہیں رہتا۔ لہٰذا حکومت کے مختلف اداروں میں شامل ہو کر خدمت انجام دینے والے بھی اک اہم اور مقدس ڈیوٹی سرانجام دیتے ہیں مگر جس بات کو میں واضح کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ملازمت و خدمت کو لازماً ارادت و عقیدت نہیں جاننا چاہیے۔ اجتماعی فرض کی ادائی ایک طرف اور محبت ایک طرف۔ کسی بادشاہ کی مجلس کی رکنیت ایک طرف اور کسی مرشد و ہادی مرد درویش کی ارادت دوسری طرف۔ یہ دونوں سلسلے متوازی ہیں، متضاد نہیں۔

اب میں اصل نکتے کی طرف آتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ امتِ مسلمہ کو عقیدت اور محبت کس سے رہی ہے؟ بادشاہ سے یا درویش سے؟ ملازمت اور بات ہے خواہ کسی بھی شعبے کی ہو۔ مسئلہ ارادت کا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو عجب عالم نظر آتا ہے اور فیصلہ کن امر یہ نکتہ ہے کہ جو بھی اور جب بھی کوئی سلطان یا حاکم کسی درویش کی بارگاہ میں حاضر ہوا امت کی نظروں میں اس کی عزت بڑھ گئی۔ آج تک یہی عالم ہے۔ آج بھی اہلِ حکم امت کے دل میں جگہ حاصل کرنے کی خاطر فقراء کے درِ فیض پر حاضر ہوتے ہیں اور ہدیہ کی صورت میں خراجِ عجز پیش کرتے ہیں۔ مگر اس کے برعکس جو بھی اور جب بھی کوئی درویش کسی بادشاہ کی درگاہ میں حاضر ہونے کا شائق پایا گیا امتِ مسلمہ کی نگاہوں میں اس کی عزت گھٹ گئی۔ یہ سلسلہ بھی آج تک جاری ہے۔ ابھی ماضی قریب میں آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ جو مستغنی عالم مرشد اقتدار اعلیٰ کے معتوب ٹھہرے ان کی توقیر لوگوں کی نظروں میں دوچند ہوگئی اور جو جو عالم مرشد دربار کا طوافی طائفہ بن گئے، وہ لوگوں کی نظروں سے گر گئے۔ مسلمانوں کے اس مزاج کو سمجھنے کی شدید ضرورت ہے کہ انہوں نے ملازمت سے بڑھ کر عقیدت کے قابل فقط انہی سلاطین و حکام کو جانا جن کے مزاج میں درویشی تھی۔ جو راہِ خدا کے جانباز غازی تھے۔ جو مخیّر تھے اور خیر جو، ہم قطب الدین ایبک کی عزت علاء الدین خلجی سے زیادہ کرتے ہیں۔ ناصر الدین محمود کو غیاث الدین بلبن پر ترجیح دیتے ہیں۔ شہنشاہ اکبر کے مقابل سلطان ٹیپو کو بہت چاہتے ہیں۔ سلطان سنجر کے مقابل صلاح الدین ایوبی کی بہت قدر کرتے ہیں۔ یعنی شاہوں اور شاہوں میں بھی فرق و امتیاز رہا۔ گویا ملازمت کبھی کبھی عقیدت بھی بنتی رہی مگر معیار یہی تھا کہ مزاج کی بے نیازی اور انصاف پسندی کس میں زیادہ تھی۔ ہوس پرستی اور بدعقیدگی و بدکرداری سے کون

Marfat.com

کتنا دور تھا۔ میدان کربلا سے لے کر آج کے دورِ ابتلا تک ساری داستان ملازمت اور ارادت ہی کے امتیاز کی داستان ہے۔ ابو جعفر منصور نے حضرت امام جعفر صادقؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے مقابل میدان عقیدت میں شکست کھائی۔ مامون و متوکل حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے مقابل ہارے۔ جہانگیر کی جہانگیری حضرت شیخ احمدؒ سرہندی کے سامنے عاجز آ گئی۔ آج بھی شہر لاہور ہی میں دیکھ لیجئے۔ شاہی اکابر کے مزار بھی موجود ہیں اور فقیری اکابر کے مزار بھی موجود ہیں، لوگ سیر کرتے ہیں تو کہاں جاتے ہیں اور جبینِ عقیدت جھکانے کی خاطر کہاں حاضر ہوتے ہیں؟

حضرت امیر خسرو نے سات بادشاہوں کی ملازمت کی۔ ان کے قصیدے بھی کہے مگر جب حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی بارگاہ عقیدت کی باری آئی تو یہ فرمایا کہ:

شاہنشہہ بے سریر و بے تاج
شاہانش بہ خاک پائے محتاج

امیر خسرو بادشاہوں کے بارے میں بخوبی جانتے تھے کہ ان کا مقام کیا ہے اور فقیروں کی منزلت کیا ہے۔ انہی امیر خسرو سے بادشاہ دہلی جلال الدین خلجی نے کہا کہ ہمیں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء سے ملوا لائیں۔ انہوں نے اپنے مرشد سے ذکر کیا۔ مرشد نے اجازت نہ دی۔ بادشاہ نے کہا امیر خسرو بے اجازت چلے چلیں گے۔ چنانچہ دن مقرر ہو گیا۔ خواجہ امیر خسرو نے اپنے مرشد کو اس امر سے آگاہ کر دیا اور وہ اس دن سے قبل پاک پتن کی زیارت کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب جلال الدین خلجی وہاں پہنچا تو بے مزا ہوا۔ اس لیے کہ خواجہ بندہ نواز کی زیارت سے محروم رہا۔ چنانچہ اس نے امیر خسرو سے سرزنش کے لہجے میں کہا "**سِرِّ مارا کشف کر دی و مارا سعادتِ پابوس سلطان المشائخ محروم گردانیدی۔**" (تو نے ہمارا راز فاش کر دیا اور ہمیں سلطان المشائخ کی پابوسی کی سعادت سے محروم کر دیا)۔

امیر خسرو نے جواب دیا: "**از رنجش بادشاہ ہمیں خوفِ جان است فامّا از رنجش سلطان المشائخ خوفِ سلب ایمان است**"۔ (بادشاہ کی رنجش سے تو بس جان ہی کا خطرہ ہے مگر حضرت سلطان المشائخ کی رنجش سے ایمان کے چھن جانے کا خوف ہے)۔

اسی ایک مثال سے دونوں حالتوں کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ اس لیے گزارش ہے کہ "دیدن دگر آموز و ندیدن دگر آموز"۔

Marfat.com

ایمان کی اہمیت

ایک عجیب وغریب سوال ہے۔میں اس سوال سے بار ہادوچار ہوا ہوں۔اور حق یہ ہے کہ اس سوال نے مجھے خاصا پریشان کیا ہے۔توقع یہی ہے کہ اس سوال سے آپ کو بھی ضرور سابقہ پڑا ہوگا۔مزید توقع یہ ہے کہ آپ بھی میری ہی طرح پریشان ہوئے ہوں گے۔سوال یہ ہے کہ انگریز یا ہندو، چینی یا جاپانی، روسی یا جرمن اپنے اپنے مذہب پر قائم رہے یا نہ رہے وہ عیسائی ہو، وہ بت پرست ہو وہ دیوتا پرست ہو وہ دہریہ ہو کچھ بھی ہو مگر بہرحال انگریز، انگریز ہی رہتا ہے، جاپانی جاپانی ہی رہتا ہے۔روسی، روسی ہی رہتا ہے۔ ہندو، ہندو ہی رہتا ہے۔اس کے برعکس جب مسلمان، مسلمان نہیں رہتا تو وہ کچھ بھی نہیں رہتا۔زیادہ قریبی اور زیادہ پریشان کن مثال ہندو کی ہے کہ وہ بت پوجے جب بھی، ہندو، گائے کو مقدس جانے جب بھی ہندو اور مسلمانوں کی دیکھا دیکھی گائے کھاتا پھرے جب بھی ہندو، ویدوں کو الہامی کتاب جانے جب بھی ہندو اور انہیں انسانی تصنیف جانے جب بھی ہندو، خالص دہریہ ہو جب بھی ہندو کٹر مذہبی ہو جب بھی ہندو حالانکہ مسلمان اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے منحرف ہو گیا تو کہیں کا بھی نہ رہا کچھ بھی نہ رہا۔سبب کیا ہے؟

اگر ذرا غور کریں تو سوال میں جو مغالطہ پوشیدہ ہے واضح ہو جاتا ہے۔سوال کرنے والے جب ہندو یا انگریز یا جاپانی کہتے ہیں اور اس کے مقابل مسلمان کا تذکرہ فرماتے ہیں تو بھول جاتے ہیں کہ انہوں نے ایک نسلی، جغرافیائی اور لسانی قومیت کو ملّت کے مقابل لا کھڑا کیا ہے۔جب خالی مسلمان کہا گیا تو گویا یہ تسلیم کرلیا گیا کہ یہ وہ جمعیت ہے جس کا امتیازی نشان ان مادی شناختوں سے بالاتر ہے۔یہاں یہ امر ذہن نشین رہنا چاہیے کہ ''ہندو'' کسی دھرم یا مذہب کا نام نہیں۔ ہندو سے بالکل اسی طرح ایک خاص قوم مراد ہے جس طرح انگریز۔ہاں یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے بعض معاشرتی اور سماجی آداب ایسے وضع کر رکھے ہیں جن کی وجہ سے وہاں کی بھاری اکثریت کا مزاج اور زندگی کے بارے میں نقطہ نظر ایک سا ہے اور ان آداب ورسوم نے کہنہ

Marfat.com

روایات بن کر ایک طرح سے مذہب کی شکل اختیار کر لی ہے۔ وہ ان کا رہن سہن ہے وہ ان کی طبقاتی تقسیم ہے جو ذاتوں کے امتیاز پر مبنی ہے۔ وہ ان کے فصل میلے ہیں اور وہ ان کی غیر ہندو سے بے پناہ نفرت ہے جو ان کو تشخص عطا کرتی ہے۔

جب آپ مسلمان کہتے ہیں تو کوئی ایک علاقہ ذہن میں نہیں ابھرتا، کوئی ایک خاص رنگ یا کوئی ایک خاص نسل سامنے نہیں آتی۔ مطلب یہ ہے کہ غیر مسلم کا ہم ذکر اس کی قومی حیثیت سے کرتے ہیں اور مسلمان کا ذکر اس کی ملّی حیثیت سے کرتے ہیں۔ یہی اس کا کمال ہے اور یہی اس کا زوال ہے۔ کمال یہ کہ ہر طرح کے علاقائی، لسانی اور نسلی اعتبارات سے بلند، پوری اولاد آدم کو ایک برادری ماننے اور بنانے کا مدعی دین، دین اسلام ہے۔ اور زوال یہ ہے کہ اسلام اپنی روح کے اعتبار سے اور اپنی اصل کی رُو سے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی ایسے نشان یا سہارے کا قائل ہی نہیں جو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بدل ہو سکے۔

عیسائیت کا مرکز ثقل یورپ ہے اور یورپ نے مذہب کو قومیت کے ماتحت رکھا یعنی انگریز کا تشخص یہ ہے کہ وہ انگریز ہے۔ اسی طرح فرانسیسی کا تشخص یہ ہے کہ وہ فرانسیسی ہے۔ یہی عالم اطالوی اور جرمن آبادی کا ہے چنانچہ ان میں سے ہر ایک قوم اپنی علاقائی اور نسلی روایات پر فخر و ناز کرتی ہے چنانچہ وہ سب باہم حریف ہیں۔ فرانس کے ہیرو انگلستان کے ہیرو نہیں۔ اٹلی کے ہیرو انگلستان کے ہیرو نہیں۔ اس کے برعکس عالم اسلام میں جب کوئی فرد کسی بھی علاقے سے یوں ابھرے کہ اس پر فخر کیا جا سکے خواہ وہ زندگی کے کسی بھی ہمت آموز میدان سے ابھرے تو پورا عالم اسلام اس کو اپنا ہیرو بنا لیتا ہے۔ وہ صلاح الدین ایوبی ہو یا باکسر محمد علی (سابق کلے) ہو۔

مطلب یہ ہے کہ غیر مسلم قومیں مثلاً مسیحی، ہندو اور بدھ وغیرہ مذہب پر استوار نہ تھیں اور نہ ہیں۔ ان کی قومی زندگی میں مذہب ایک عنصر ضرور رہا۔ یہ عنصر کبھی طاقت ور رہا اور کبھی کمزور، مگر یہ عنصر کبھی ایسا حاوی عنصر نہ رہا کہ اس کے مقابل دیگر قومی مشخصات دب کر رہ جاتے حق یہ ہے کہ اکثر مذہب دبا رہا اور علاقائی، لسانی، نسلی اور تمدنی چھاپ نمایاں تر رہی۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ وہ قومیں مذہب سے عاری ہو کر بھی رہ سکتی ہیں۔ اس لیے کہ انہیں اپنے علاقہ کی محبت باقی رکھ سکتی ہے۔ انہیں اپنی تمدنی روایات سہارا دے سکتی ہیں۔ انہیں مخصوص تہذیبی اعتبارات مدد بہم پہنچا سکتے ہیں۔ انہیں عہدِ عتیق کے کھیل تماشے، میلے ٹھیلے اور موسمی و فصلی تہوار مشغول رکھ سکتے ہیں۔

Marfat.com

قدیم دیو مالائی قصے اور کہانیاں دل چسپی اور دل لگی مہیا کر سکتی ہیں۔

مراد یہ ہے کہ غیر مسلم اقوام جن ننھے اور محدود مادی سہاروں پر زندہ ہیں وہ ان کے مذہب سے اس طرح کبھی متاثر نہیں ہوئے کہ مذہب کے زوال کے ساتھ ہی وہ بھی زوال پذیر ہو جائیں۔ ان کے نصب العین بلند نہیں لہٰذا وہ بلندی سے نہیں گرتے۔ بلندی سے نہیں گرتے لہٰذا نہیں مرتے۔

مسلمان کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اس کا امتیازی اور واحد نشان اسلام ہے۔ اس کی قومی اور وطنی ہر حیثیت اسلام کی روشنی میں متعین ہوتی ہے۔ اس کا معاشرتی، معاشی اور سیاسی اخلاق دین کے حوالے سے ربط و ضبط حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ وہ جب تک صاحبِ ایمان رہتا ہے اس کا نقطہ نظر خواہ اس کا تعلق زندگی اور کائنات کے کسی بھی پہلو سے ہو دین سے متاثر بلکہ دین پر مبنی ہوتا ہے اور وہ ہر شے کا فیصلہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی روشنی میں کرنا چاہتا ہے۔ نکاح و طلاق، صلح و جنگ، حلال و حرام، خوراک و صحت، حقوق و فرائض، آداب و رسوم، اعمال و اخلاق وغیرہ ہر شے اللہ کے احکام اور اللہ کے نواہی کے مطابق فیصل ہوتی ہے یا تمنا ہوتی ہے کہ اس طرح فیصل ہو۔

یہ بلند نصب العینیت کمتر سہاروں سے بے نیاز رکھتی ہے۔ عملاً وہ بلندی نصیب ہو یا نہ ہو مقصود و مرام کی حیثیت سے سامنے ضرور رہتی ہے۔ چنانچہ نظریں اور کسی شے کو جو اس لائحہ سے موافق نہ ہو قبول نہیں کرتیں۔ اصولاً یہ روحانی قوت بے نظیر دولت ہے۔ یہی مقصود آدم ہے۔ یہی محبوب فطرت ہے۔ یہ قوت ہر گھٹیا معیار سے بلند کر دیتی ہے۔ مہمل تعصبات کی قید سے آدم کو آزاد کرتی ہے۔ عالی اخلاق سے سنوارتی ہے اور مزین فرماتی ہے۔ گویا صاحب ایمان کی تقدیسیں بھی دین کے باعث ہیں اور عصمتیں بھی، پسند ناپسند بھی۔

ہاں تو جب ایمان والے کا ایمان لٹ جائے تو وہ بالکل خالی ہو جاتا ہے۔ خوفِ خدا اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہ رہے تو وہ کچھ بھی نہیں رہتا۔ مومن کی انسانیت کی عمارت دین پر کھڑی ہوتی ہے۔ جب مومن ایمان سے محروم ہو جائے تو وہ انسانیت کے مقام سے بھی گر جاتا ہے۔ وہ سیدھا وحشت و بربریت کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔ مثلاً اس کی قوم اور اس کا وطن بھی جو کچھ حیثیت رکھتا ہے وہ دین کی روشنی میں طے پاتی ہے۔ لہٰذا جب دین کا دامن ہاتھ سے نکل جائے تو باقی جو وحشی دو پایہ رہ جاتا ہے اسے قوم اور وطن کے ساتھ غداری کرتے ہوئے کوئی تکلیف نہیں

Marfat.com

ہوتی۔ بلکہ جب یہ ایمان سے محروم ہوتو ایسی غداری اور اوباشی اور بے حیائی پر اتر آتا ہے کہ دوسرے دیکھتے رہ جائیں۔اس لیے کہ اس کا ضمیر ہی اس کا دین ہے۔دین گیا تو ضمیر بھی گیا۔ حلال وحرام کا تصور، ماں بہن کی عصمت کا تصور، ہمدردی، صلہ رحمی، غریب پروری، ہمسایہ نوازی، غرضیکہ شرافت کی تمام قدریں دین کے جانے کے ساتھ ہی چلی جاتیں ہیں اور سبب واضح ہے کہ وہ جب ایک نہایت بلند نصب العین کی سرشاری سے یتیم ہو جاتا ہے تو بالکل بے آسرا رہ جاتا ہے۔ چنانچہ انسان کے بجائے حیوان کی سطح پر زندگی گزارنے لگتا ہے۔مسلمان کی گراوٹ جب بھی عمل میں آتی ہے، شدید ہوتی ہے۔کیا پھر مردِ مومن کو بھی درمیانی درجے کے سہاروں پر کھڑا کرنے کی کوشش کی جائے۔یہ ناممکن ہے۔جب تک اس کے پاس قرآن ہے اس کا نصب العین بلند ترین رہے گا اور اسی طرح جب بھی یہ اپنی روحانی قوت سے محروم ہوگا وحشت وحیوانیت کی طرف لوٹ آئے گا۔مومن کے لیے درمیان کا کوئی سٹیشن ہے ہی نہیں۔درمیانی سہاروں کے باعث خواہ وہ علاقائی ہوں، خواہ لسانی، خواہ نسلی، خواہ تمدنی، خواہ دیومالائی، مسلمان نہ فرد کی حیثیت سے باقی رہ سکتا ہے نہ اجتماعی حیثیت سے، بغیر ایمان کے فرد بھی لاشے اور مملکت بھی لاشے.....کیا میرا یہ تجزیہ درست ہے؟

Marfat.com

مسلمان اور تمدن جدید

تمدن جدید نے مسلمانوں کو حسبِ استعداد ہر ملک میں متاثر کیا۔ یہ تاثر مادی اور نظریاتی دونوں اعتبار سے برابر ہے۔ تار برقی، نشریات، جمہوری نظام، حکومت اور اس نوع کی دیگر باتیں اسی تمدن کے اثرات ہیں۔ یہ چیز ابتداً نہ تو کسی کوشش کا نتیجہ تھی اور نہ کسی فکر و تدبیر کا۔ کیونکہ جب تمدن جدید کا مسلمانوں پر حملہ ہوا اس وقت وہ خوابِ خرگوش میں مدہوش تھے۔ چنانچہ جب توپوں کی گھن گرج پر انہوں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ تمدن جدید ان پر حملہ آور ہے اور ان کے وطن میں گھس کر ان کی حکومتوں بلکہ ہر چیز میں داخل ہو چکا ہے۔ یہ دیکھ کر مفکروں نے سوچنا شروع کیا کہ اس ریلے کے سامنے ان کا موقف کیا ہو۔ کیا وہ اسے تمام حدود پر چھا جانے دیں یا پوری قوت سے اس کی راہ روکیں یا کوئی اور تدبیر عمل میں لائیں۔ اس الجھن نے مصلحین کو تین گروہوں میں تقسیم کر دیا۔

ایک مثال مصطفیٰ کمال کی ہے جس نے تمدن جدید کو بلادِ عثمانیہ میں کاملاً منتقل کر لیا۔ مادی اعتبار سے بھی اور نظریاتی اعتبار سے بھی۔ تنظیم و ترتیب عمارات، کاربند جمہوریت پارلیمنٹ کا قیام، قانونِ ملک کی تیاری، قانون سازی برائے تعزیرات، نکاح، طلاق، وراثت اور اقتصادی و اجتماعی نظم اور ضبط وغیرہ اسی کا نتیجہ ہیں۔ یہاں تک کہ مصطفیٰ کمال نے کتابت کو بھی لاطینی حروف کا لباس پہنا دیا۔

گاندھی جی نے اس کے بالکل برعکس سوچا اس نے تمدن جدید کی کلیتہً مخالفت کی اور ہندوؤں کو چرخہ کاتنے کی تلقین کی تاکہ ان کا لنکا شائر کے انگریزی کارخانے سے کوئی تعلق باقی نہ رہے۔ اس نے یہاں تک سوچا کہ منشیات اور سامان لہو و لعب جو تمدن جدید کی نمایاں خصوصیات ہیں وہ بھی ان تک نہ پہنچیں۔ وہ اپنے اس مسلک پر کاربند رہا اور لوگوں کو اسی جانب دعوت دیتا رہا۔ مگر تمدن جدید کی تند موجیں اسے بہا لے گئیں۔ کیونکہ اس کی قوم نے اس تمدن کی بہت سی باتوں کو اپنا لیا۔ وہ خود بھی اس سے محفوظ نہ رہا۔ کیونکہ وہ انگریزی میں گفتگو کرتا تھا اور اپنی آنکھوں

Marfat.com

پر عینک جو تمدنِ جدید ہی کی اختراع تھی، لگائے رکھتا تھا۔

تیسری قسم کے مصلحین اس رائے کے حامل ہیں کہ انتخاب کو کام میں لانا چاہیے یعنی تمدن کی اچھی باتوں کو لے لیا جائے اور مضر باتوں کو چھوڑ دیا جائے۔ اسی طرح تمدن قدیم کی خوبیوں کو اپنا لیا جائے اور برائیوں سے اجتناب کیا جائے کیونکہ نہ ہر نئی چیز مفید ہے اور نہ ہر قدیم مضر۔ قدیم میں بعض ایسی خوبیاں بھی ہیں جو جدید سے بہر حال فائق ہیں۔ کیا حرج ہے اگر ہم قدیم سے فیاضی تفکیر روحانی اور عفو کو لے لیں۔ اور اسی طرح جدید سے زندگی کی علمی اساس، حریتِ فکر اور اسی قسم کی دوسری باتیں اخذ کر لیں۔ اگر ہم اس طریق پر کار بند ہوں تو ہم ایک ایسا تمدن استوار کر سکتے ہیں جو قدیم و جدید دونوں سے بہتر ہوگا۔ کیونکہ یہ دونوں کی خوبیوں سے مزین اور دونوں کی برائیوں سے مبّرا ہوگا۔

یہ سب کچھ بجا۔ مگر بہت سے لوگوں نے اس انتخاب کی کوشش کی اور ناکامی کا منہ دیکھا جیسے کہ ہم مسلمانوں نے کئی معاملات میں شکست کھائی ہے۔ زراعت، تعلیم اور عدلیہ ہی کو لے لیجئے۔ ایک گروہ مدارس میں یورپی انداز پر علم حاصل کر رہا ہے تو دوسرا قرون وسطیٰ کے طریقے پر۔ ایک جماعت جدید ترین آلات کی مدد سے کاشت کاری کر رہی ہے اور دوسری رہٹ، چھٹا اور توکل بتقدیر کے ذریعے سے۔ اسی طرح ان کے یہاں شرعی عدالتیں بھی قائم ہیں اور ملکی عدالتیں بھی۔ ان میں سے بعض آدمی یورپی لباس پہنتے ہیں اور بعض وطنی، بعض لوگ بچوں کی تربیت جدید ترین طریقوں پر کر رہے ہیں اور بعض خرافات و اوہام پر۔ وعلیٰ ھذا القیاس۔

ان سب باتوں کی وجہ سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آ گیا ہے جس کے افراد باہم متنفر ہیں اور جو بالکل برعکس نتائج کا باعث ہوگا۔ لہٰذا اگر حقیقی اصلاح مقصود ہے تو لازم ہے کہ یہ معاملہ ماہر مصلحین کے حوالے کیا جائے جو یہ جانتے ہوں کہ کون سے عناصر رچ سکیں گے اور کون سے نہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو میں امید کرتا ہوں کہ لوگوں کو ناکامی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

لیکن اس ضمن میں کئی امور قابل لحاظ ہیں۔ وہ یہ کہ مصلح کی ایک آنکھ تو اس چیز پر رہنی چاہیے کہ وہ قدیم و جدید سے کیا کچھ لے رہا ہے اور ایک آنکھ اپنے ملک کے حالات اور طبعی واجتماعی کوائف پر رہے کیونکہ اگر ایک چیز ایک قوم کے لیے موافق ہے، ایک چیز مغرب کے لیے مناسب ہے تو مشرق کے لیے غیر مناسب، نتیجہ ناکامی ہوتا ہے۔

Marfat.com

میرے مشاہدے سے بھی اس قسم کا ایک واقعہ گزرا ہے۔ وہ یہ کہ میرا ایک دوست عازم انگلستان ہوا تا کہ پرانی اون سے نئے کپڑے بنانے کا کام سیکھے۔ اس نے دیکھا کہ انگلستان میں پرانے اونی کپڑوں کو جمع کر کے ان میں کچھ کیمیاوی مادے ڈالے جانے کے بعد انہیں مشینوں میں داخل کر دیا جاتا ہے اور وہ کھمبی کی طرح سفید اون کی شکل میں برآمد ہوتے ہیں۔ بعد میں اس اون کو حسبِ منشا رنگ لیا جاتا ہے اور نئے سرے سے سستے داموں بیچ دیا جاتا ہے۔

ہمارے دوست نے یہ سب کچھ دیکھا لہٰذا جب وہ مصر واپس آیا تو مشینری اور کئی ماہر کاریگر بھی ہمراہ لایا اور یورپ والوں کے انداز پر کام شروع کر دیا۔ لیکن اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ اس نے دو سب سے زیادہ اہم باتوں کا خیال نہ رکھا تھا۔ اول یہ کہ خشک آب و ہوا کی وجہ سے انگلستان میں گرم کپڑوں کی کثرت ہے لیکن مصر میں گرم آب و ہوا کے باعث ان کی شدید کمی ہے۔ دوسری بات یہ کہ انگریز جو اونی کپڑے اتارتے ہیں تو ان میں جان باقی ہوتی ہے۔ مگر اہلِ مصر اس وقت اتارتے ہیں جب وہ بالکل بیکار ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ناکامی ان منطقوں کے اختلافِ حالات کی وجہ سے رو پذیر ہوئی۔

اگر میرے دوست نے اس مسئلہ کا علم، ہر پہلو کی دیکھ بھال کر کے حاصل کیا ہوتا تو اسے اس صورتِ حال کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ یہی مصلحین کی کیفیت ہے کہ اختلافِ زمان و مکان کی وجہ سے پیدا شدہ بہت سی باریکیاں ان کی نظروں سے پوشیدہ رہتی ہیں۔ نتیجتاً ان سے اس نوع کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔

اگر انتخاب اچھا ہو۔ مفید عناصر کو کما حقہٗ جان لیا جائے۔ ایک عنصر سے دوسرے عنصر کا تعلق سمجھ لیا جائے اور اس طرح ایک موافق عنصر کو دوسرے موافق عنصر ہی سے وابستہ کیا جائے اور قوموں میں ترویج اصلاح کے وقت ہر باریک رشتے کو ملحوظ رکھا جائے تو میرے خیال میں ناکامی کی کوئی وجہ نہیں..... واللہ الموفق۔

Marfat.com

مَاتَ الْیَھُوْدی

یہودی مر چکا ہے

جب عرب میں دینِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا بول بالا ہوا اور جزیرہ نمائے عرب کے باشندے ایک ہم نظر و ہم آہنگ معاشرے کے معمار کی قوت حاصل کرنے لگے تو ایک جانب ایران کی حکومت کو اور دوسری جانب مشرقی رومن سلطنت کو پریشانی لاحق ہوگئی۔ ایرانیوں نے بھی چاہا کہ عرب کی اس نومولود اسلامی مملکت کو ابھرنے نہ دیا جائے اور رومیوں نے بھی ایسا ہی ارادہ کرلیا۔ عراق اور نواح عراق کے علاقے ایرانیوں کے باجگزار عرب امرا کے تحت تھے۔ شام اور اس کے ملحقہ منطقے رومیوں کے نائب عرب رؤسا کی قلمرو تھے۔ چنانچہ ایرانیوں نے عراق کی راہ سے اور رومیوں نے شام کی راہ سے اسلامی مملکت کے معاملات میں مداخلت شروع کردی۔ رومیوں کی مداخلت تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علی وسلم کے زمانے ہی میں تشویش پیدا کرنے لگ گئی تھی جس کے باعث غزوۂ موتہ ظہور میں آیا اور اس سبب سے اس غزوے کے بعد آنحضور ﷺ نے حضرت اسامہ بن زید کی مہم تیار فرمائی تھی۔ وہ مہم جس کی تیاری کے آخری مرحلے پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوگیا۔

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں ایرانیوں کی طرف سے بھی اور رومیوں کی طرف سے بھی چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی اور مسلح تصادم رفتہ رفتہ یوں بڑھے کہ لڑائیوں کی صورت اختیار کرگئے۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انتقال فرمایا تو عرب کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ حضرت عمر بن الخطابؓ اس صورتِ حال سے پریشان تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں اور نامسلمانوں کے مابین کوئی ایسی دیوار کھڑی ہوجائے کہ یہ تصادم ختم ہوں مگر یہ تصادم کیسے ختم ہوتے؟ نہ رومیوں کے وسائل اور رقبے اور مورچے اور انتظامی حملے رکتے تھے اور نہ ایرانیوں کے، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کو عرب سے باہر نکلنا پڑا۔ امیر المومنین حضرت عمر بن الخطابؓ کا جی جل رہا تھا۔ آپ پریشان تھے۔ باعثِ پریشانی یہ امر تھا کہ عرب کے

Marfat.com

بدو بقول حضرت عمرؓ عرب کا خام مال تھے ابھی وہ پختہ نہ ہوئے تھے۔ ابھی ان کا اسلام ایک اصول اور ضابطے کے لسانی اقرار سے آگے نہ بڑھا تھا۔ ابھی وہ ایمان کو بخوبی جان نہ پائے تھے۔ ابھی ایمان دلوں میں نہ اترا تھا اور انہیں عرب کی اساسی تربیت گاہ سے محروم ہونا پڑ رہا تھا۔ عرب کا خام مال باہر جا کر بحیثیت مسلمان کیونکر پختگی کے درجے کو پائے گا۔ بہرحال نہ ایرانیوں نے دم لینے دیا، نہ رومیوں نے اور عرب کے باشندے اسلامی معاشرے کے دشمنوں کی یلغاریں روکتے روکتے مجبوراً دور تک عرب سے باہر نکل گئے۔

کوفہ و بصرہ کے نواح میں صاحب رسول ﷺ حضرت سعد بن وقاص گورنر تھے مگر ان کو مدد دینے کے لیے صاحب تجربہ مسلمان موجود نہ تھے لہٰذا انہیں بھی انتظامی امور میں دوسرے مسلمان سربراہوں کی طرح ایسے غیر مسلم افراد سے مدد لینا پڑتی تھی جو تجربہ رکھتے ہوں۔ سبب ظاہر ہے کہ عرب اپنی منظم مملکت کے وجود میں آتے ہی ملک سے باہر نکلنے پر مجبور ہو گئے تھے ان کی کسی بھی شعبہ انتظام میں بخوبی تربیت ابھی عمل میں نہ آئی تھی۔ جب تک مسلمان تربیت یاب نہ ہوتے اہل تجربہ مجوسیوں، عیسائیوں اور یہودیوں سے کام لینا لابد تھا۔ یہاں جملہ معترضہ کے طور پر گزارش ہے کہ وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ قرن اول کے مسلمان محض شوق فتوحات کے جذبہ بے اختیار کے تحت شمشیر بکف اور تکبیر بلب نکل کھڑے ہوئے تھے انہیں امیر المومنین حضرت عمرؓ بن الخطاب کی اس فکرمندی اور تشویش کو پیش نظر رکھ کے کسی نتیجہ پر پہنچنا چاہیے جس کی طرف ابھی اوپر اشارہ ہوا ہے کہ مسلمانوں کو اتنی جلدی جزیرہ نمائے عرب سے باہر نکلنا کس قدر ناگوار تھا۔

ہاں تو حضرت سعد بن وقاص کے ماتحت محاصل کا اعلیٰ افسر یہودی تھا۔ نظام الملک طوسی نے ایک موقع پر ''سیاست نامہ'' میں ضمناً ذکر کیا ہے کہ وہ یہودی صاحب تجربہ تو تھا مگر مسلمانوں کو تنگ کرتا تھا۔ مسلمانوں نے اپنے خلیفہ حضرت عمرؓ کے حضور درخواستیں اور شکایتیں ارسال کیں کہ ہمارے امیر نے ایک یہودی کو محاصل کا حاکم اعلیٰ مقرر کر رکھا ہے جو دیانت داری کے پردے میں ہم مسلمانوں پر بے پناہ سختی کرتا اور اس طرح مذہبی انتقام لیتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ کو ہدایت کر بھیجی کہ اس یہودی کو اس منصب سے ہٹا دیا جائے جواباً حضرت سعدؓ نے استدعا تحریراً ارسال کی کہ میرے پاس کوئی مسلمان فی الحال ایسا نہیں جس میں اتنا بڑا منصب سنبھالنے کی اہلیت اور جسے اس کام میں تجربہ حاصل ہو جو یہودی سرانجام دے رہا ہے۔ حضرت سعدؓ کی التجا اپنی جگہ

Marfat.com

واضح تھی کہ جب کوئی مسلمان تجربہ حاصل کرلے گا اور تربیت پالے گا تو اسے یہ منصب دے دیا جائے گا اور جب تک کوئی تجربہ کار مسلمان میسر نہ آئے یہودی کو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔

جب امیر المومنین حضرت عمرؓ نے یہ جواب پڑھا تو اسی کاغذ پر دو لفظ تحریر کر کے کاغذ واپس کر دیا۔ وہ دو لفظ تھے۔ ''مات الیہودی'' (یہودی مر چکا ہے) جب یہ دو لفظ حضرت سعدؓ کی نظر سے گزرے تو بات فوراً ان کی سمجھ میں آ گئی کہ فرض کیا آج یہ یہودی رحلت کر جائے تو پھر؟ پھر تو کوئی متبادل بندوبست کرنا ہے۔ لہٰذا میں فرض کیوں نہ کرلوں کہ وہ مر چکا ہے۔ اور متبادل بندوبست کرنا ہے۔ اس لیے صاحب تجربہ نہ سہی کوئی صاحب اہلیت وصلاحیت مسلمان اس کی جگہ لگا دینا چاہیے جو اپنی اہلیت اور حسنِ نیت کے باعث کام سیکھ لے گا۔

نظام الملک رقم طراز ہیں کہ زندگی کے جس بھی شعبے میں اور جہاں بھی اور جب بھی کوئی ایسی صورت حال پیش آئی اس کے تدارک کے لیے حضرت عمرؓ کے یہ دو لفظ رہنمائی کرتے تھے۔ گویا جب یہ کہا جاتا کہ فلاں منصب یا شعبہ فلاں کے بغیر سنبھالا ہی نہیں جا سکتا تو جواب یہی ملتا۔ مات الیہودی۔ (یہودی مر چکا ہے) مطلب یہ کہ کسی کا بھی وجود ناگزیر نہیں۔

ہمارے یہاں مختلف شعبہ ہائے حیات میں ہمیشہ نہ سہی اکثر اوقات تبادلوں کے ضمن میں یا سبکدوشی اور توسیع ملازمت کے باب میں یا ترقی وتنزلی سے متعلق امور میں اسی قسم کے سفارشی کلمات کہے اور لکھے جاتے ہیں کہ فلاں تبدیل ہو گیا تو بس آ گئی آفت۔ سب کام رک گئے۔ یا فلاں ریٹائر ہو گیا تو آسمان کا رنگ نیلا نہ رہے گا، فوراً پیلا پڑ جائے گا۔ اگر فلاں کے لیے دیگر جملہ فلاں فلانوں کو نظر انداز اور محروم کر کے ترقی کا اہتمام نہ کیا گیا تو زمین اپنے محور سے ہل جائے گی اور ذمہ داری ہماری ہو گی۔ حالانکہ اکثر ایسے مقامات پر مقصد، نیت اور خوشی یا مجبوری اصولی نہیں ہوتی۔ بات کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ یہ تو شعبہ جاتی باتیں ہیں مگر یہی بے اصولی اور بے یقینی اوپر جاتے جاتے شرک کا رنگ اختیار کر لیتی ہے اور کسی ایک شخص یا چند اشخاص ہی کو پوری معاشرتی زندگی کے وجود و بقا کا باعث جان لیا جاتا ہے۔ یہ شخص یا یہ جمعیت نہ رہی تو کیا بنے گا؟ یہ کہنے والے بھول جاتے ہیں کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تھا تو اصحاب رسولؐ اچانک گھبرا گئے تھے۔ حضرت عمرؓ اس طرح چکرائے تھے کہ بولے: ''جس نے کہا محمد فوت ہو گئے ہیں میں اس کا سر اڑا دوں گا''۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیق نے وہ ایمان آموز اور یقین افروز

Marfat.com

کلمات ارشاد فرمائے تھے جو اہلِ ایمان کا دوامی نظریہ وشعار بن گئے۔ وہ الفاظ تھے:

ان کنتم تعبدون محمداً فانّہ' قد مات وان کنتم تعبدون اللہ فانّ اللہ حیٌّ لایموت.

ترجمہ: یعنی اے اہلِ ایمان اور اے معشر المسلمین اگر تم محمد ﷺ کی پرستش کرتے تھے تو جان لو کہ وہ فوت ہو گئے ہیں اور اگر تم اللہ کی پرستش کرتے تھے تو جان لو کہ اللہ زندہ و قائم ہے۔ وہ موت پذیر ہستی نہیں"۔ پھر وہ عمرؓ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت پر سب سے بڑے رمز شناسِ نبوت کی زبانی یہ الفاظ سنے اور ان الفاظ کی حقانیت کو دل میں جگہ دے، اس عمرؓ کے لیے کسی حاکم و عامل کا کسی شخص پر اس قدر انحصار کر لینا کیونکر قابلِ برداشت ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی سوچ کے پیچھے کچھ خوف چھپے بیٹھے ہوتے ہیں (اور ان خوفوں کے پیچھے کئی صورتیں ہیں) اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد یوں ہے کہ "خوف کی بنا شرک ہے"۔ ظاہر ہے کہ جب خدا کے قادر مطلق ہونے پر ایمان ضعیف ہونے لگے تو مختلف وسوسے، تقاضے اور سہارے غلط اشارے کرنے لگتے ہیں اور خدا کی جگہ دیگر چیزیں دل میں جاگزیں ہونے لگتی ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ شرک ہے اور خدا کا ارشاد ہے کہ وہ ہر گناہ معاف کر دے گا مگر شرک وہ گناہ ہے جس کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ یہی ضعفِ ایمان بندۂ مومن کا زوال ہے باقی ہیچ۔ حضرت علامہ کے بقول:

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

جس طرح کوئی بھی غیر خدا وجود پائیدار اور باقی نہیں، اسی طرح ہر شخص کو خود اپنی ذات کے باب میں بھی آگاہ رہنا چاہیے کہ یہ بھی باقی و غیر فانی نہیں۔ حضرت علامہ کے الفاظ میں:

علم مسلم کامل از سوز دل است
معنی اسلام ترک آفل است

اسلام کا معنی ہے ترکِ آفل۔ آفل کا مطلب ہے غروب ہو جانے والا۔ ستارہ ہو، چاند ہو، سورج ہو سب غروب ہو جاتے ہیں۔ ایک وہی ہستی باقی رہتی ہے جو ان سب تابندہ درخشندہ طاقتور اور عالی مقام ہستیوں کی خالق اور نگران ہے اور جس کا حکم ہر شے پر چلتا ہے۔ پھر آفل

Marfat.com

کا مجازی معنٰی ہو گیا ہر فانی وجود۔ جو کچھ بھی غیر خدا ہے وہ زوال پذیر ہے اور بس، مگر اس کے باوجود فرد یہ کیوں فرض کر لیتا ہے کہ میں یہیں رہوں گا۔ چاہیے کہ وہ اپنے بارے میں بھی ''مات الیہودی'' کے الفاظ یاد رکھے۔ وہ اگر ایسا کرے گا تو سہولت میں رہے گا۔ مثلاً آپ ایک عزیز یا دوست کی مثال لیں، جو کسی ناحق کارروائی میں مجبوراً شریک تھا۔ وہ اشک بار بھی تھا، نادم بھی تھا۔ کہا گیا کہ بھائی اگر بات اسی طرح ہے تو آپ اصول کا اور ضابطے کا تحفظ کرتے۔ وہ عزیز یا دوست بولے: کیا کروں پیٹ ہے۔ بچے ہیں۔ جواباً کہا گیا: فرض کیا کہ ابھی یہ بات کرتے کرتے آپ کا دل بیٹھ جائے اور آپ رحلت کر جائیں تو پھر؟ اور اگر خدانخواستہ اچانک یہیں کھڑے کھڑے یہ خبر سنیں کہ بچے کسی حادثے کی نذر ہو گئے تو پھر؟ ''مات الیہودی'' کو یاد رکھو۔ آرام میں رہو گے۔ خوف سے محفوظ رہو گے۔ شرک سے بچے رہو گے۔ سر اونچا رہے گا۔ ضمیر ملامت نہ کرے گا۔ تمہاری روحِ انسانیت مجروح نہ ہو گی۔

Marfat.com

چاند اور دوسرے اجرامِ فلکی تک انسان کی رسائی ہرگز اسلامی تعلیمات کے خلاف نہیں

از قلم

شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز

وائس چانسلر، اسلامی یونیورسٹی، مدینہ منورہ

ترجمہ: پروفیسر مرزا محمد منور

الحمد لِلّٰہ وحدہٗ والصلٰوۃ والسلام علی من لانبیّ بعدہٗ وعلٰی الہٖ وصحبہٖ۔

بعد حمد وصلوٰۃ عرض ہے آج کل ایک مسئلہ بار بار سامنے آ رہا ہے یعنی بعض خلابازوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ چاند کی سطح تک پہنچ چکے ہیں نیز یہ کہ وہ چاند کے علاوہ دوسرے کواکب پر پہنچنے کی بھی کوشش کر رہے ہیں۔ اس مسئلے کے بارے میں بہت سوال جواب ہوئے، غور وخوض عمل میں آیا، جس سے آگاہ ہو کر میں نے مناسب جانا کہ اس مسئلے کی راہ صاف کرنے کے لیے دو حرف تحریر کر دوں تا کہ اس ضمن میں حقیقتِ حال پر روشنی پڑے۔ ان شاء اللہ۔ میری گزارش یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے بغیر آگاہی کے بات کرنا اپنے بندوں کے لیے حرام قرار دیا ہے اور اس بارے میں ان کو متنبہ کرنے کے لیے اپنی کتاب مبین میں فرمایا ہے:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ تُشْرِکُوا بِاللّٰهِ مَالَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ○

''کہہ دے کہ میرے رب نے ہر بے حیائی کو حرام قرار دیا ہے۔ وہ برائی ظاہر ہو یا پوشیدہ۔ ناحق زیادتی کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ اس بات کو بھی کہ تم اس شے کو اللہ کا شریک ٹھہراؤ جس کے ضمن میں اللہ نے کوئی سند نہیں اتاری۔ اور اس سے بھی کہ اللہ

Marfat.com

پر وہ کچھ تھوپ دو جس کو تم نہیں جانتے"۔(7/33)

اسی طرح خدائے تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَقْفُ مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا. (17/36)

"جس شے کے بارے میں تجھے کچھ بھی معلوم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ جا۔ بالتحقیق کان، آنکھ اور دل سب اس کی طرف سے جواب دہ ہیں"۔

اور اللہ سبحانہ نے اس امر سے بھی باخبر کیا کہ شیطان بغیر آگاہی کے بات کرنے کی ہدایت دیتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ○

"اے لوگو زمین کی چیزوں میں جو کچھ حلال و پاکیزہ ہے کھاؤ اور دیکھو! شیطان کی پیروی نہ کرو۔ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تو تمہیں بدی اور بے حیائی ہی کا حکم دے گا۔ اور یہ کہے گا کہ اللہ پر وہ کچھ تھوپ دو جس کا تمہیں علم نہیں"۔(2/168-169)

اسی انداز پر اللہ تعالیٰ وسبحانہ نے اپنے مومن بندوں کو حکم دیا ہے کہ فاسقوں کے ذریعے ملنے والی خبروں کی اچھی طرح چھان پھٹک کر لیا کریں۔ چنانچہ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ.

"اے اہلِ ایمان اگر کوئی بدعمل شخص تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی خوب تحقیق کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ اندھا دھند کسی قوم پر ٹوٹ پڑو اور پھر اپنے کیے پر پچھتاتے رہو"۔(6/49)

عامۃ المسلمین پر عموماً اور طالبانِ علم پر خصوصاً واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ضمن میں کوئی بات بغیر آگاہی کے نہ کہیں چنانچہ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھنے والوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ کہیں

Marfat.com

یہ حرام ہے۔ یہ حلال ہے۔ یہ جائز ہے۔ یہ ممنوع ہے۔ وہ اگر ایسا کہیں تو کسی لائقِ اعتماد حجت کی بنا پر کہیں۔ اگر کوئی حجت میسر نہیں تو ان کے لیے بھی وہی راہ کھلی ہے جو ان کے پیشرو اہل علم کے لیے کھلی تھی نیز یہ کہ ان کو جس بات کا علم نہ ہو اس میں مداخلت نہ کریں اور یہ کہہ دیں کہ ہر بات کا بہتر علم اللہ ہی کے پاس ہے۔ میں تو نہیں جانتا۔ فرشتوں نے اللہ عزوجل کے حضور کیا خوب عرض کیا تھا:

سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ.

''اے ذاتِ بے ہمتا! ہمیں تو وہی کچھ معلوم ہے جو کچھ تو نے ہمیں سمجھایا۔ سب سے بڑا عالم بھی تو ہی ہے اور سب سے بڑا صاحب حکمت بھی تو ہی ہے''۔(2/32)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے جب کوئی ایسی بات پوچھتے جس کا انہیں علم نہ ہوتا تو وہ جواب دیتے: ''اللہ اور اللہ کا رسول بہتر جانتے ہیں''۔ ان کا یہ قول فقط اس لیے تھا کہ انہیں کمال علم و ایمان میسر تھا اور وہ اللہ کی تعظیم بدرجۂ اتم کرتے تھے۔ وہ اختراع اور گھڑنت سے دور بھاگتے تھے۔ فساق و کفار وغیرہ کے اُن جملہ اقوال کی چھان پھٹک کا فرض بھی اسی ذیل میں آتا ہے جو کواکب، ان کے خواص اور ان تک رسائی کے امکان وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں پر اس معاملے میں بھی وہی کچھ واجب ہے جو دوسرے معاملات میں ہے اور وہ ہے خوب جانچ پڑتال کر لینا، تصدیق و تکذیب کا اقدام فقط اس وقت کیا جائے جب اتنی کافی معلومات حاصل ہو جائیں کہ ان کی بنا پر ایک مرد مسلم پورے اطمینان کے ساتھ تصدیق و تکذیب پر قادر ہو سکے اور یہی انداز مقصود ہے۔ سورۂ حجرات سے تعلق رکھنے والی آیۂ سابقہ کا ''یٰاَیُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا'' ۔۔۔ ''تبیّن'' سے چھان پھٹک مراد ہے۔ یہاں تک کہ ایسے قرائن یا ایسی معلومات ہاتھ لگ جائیں کہ اہلِ فسق کی لائی ہوئی خبر کی تصدیق یا تکذیب ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ اگر کوئی فاسق شخص خبر لائے تو اسے ردّ کر دو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے برعکس تحقیق و تصدیق کا حکم دیا ہے اس لیے کہ فاسق خواہ وہ کافر ہے یا کوئی معصیت کار مسلم، سچی خبر بھی لا سکتا ہے۔ لہٰذا اس کے معاملے کی دیکھ بھال واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کے اس رویے کو سخت ناپسند کیا ہے کہ وہ قرآن کی تکذیب بے جانے بوجھے کرتے ہیں۔ لہٰذا اللہ

Marfat.com

تعالیٰ نے فرمایا:

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَالَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّايَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ.

''برعکس اس کے انہوں نے تو ہر چیز کو جھٹلا دیا جس کے علم کا احاطہ نہ کر سکے۔ اور حال یہ ہے کہ تا حال اس امر کی کوئی وضاحت ان تک نہیں پہنچی۔ ان کے پیشرو بھی اسی طرح جھٹلایا کرتے تھے لہٰذا دیکھ کہ حد سے تجاوز کرنے والوں کا انجام کیا ہوا''۔(10/28)

علامہ ابن القیمؒ نے اپنے قصیدے ''کافیۃ الشافیہ'' میں کیا خوب کہا ہے:

ان البدار بردِّ شئی لم تُحِط
علماً بہٖ سببٌ الیٰ الحرمان

''کسی شے کو پوری طرح جانے بغیر کھٹ سے ردّ کر دینا محرومی کا سبب ہے''۔

اس سے بھی عظیم تر اور خوفناک تر اقدام تو یہ ہے کہ کسی کو کتاب الٰہی اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل شدہ لائق اعتماد حجت کے بغیر کافر یا فاسق قرار دے دیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا اقدام کہ اللہ اور اللہ کے دین کے خلاف جسارت و گستاخی کا ارتکاب ہے اور یہ اسی ذیل میں آتا ہے جس ذیل میں بغیر آگاہی اور علم کے اللہ کے ضمن میں ناصواب کہے جانا۔ یہ رویہ اہلِ علم اور اہلِ ایمان، سلف صالحین رضی اللہ عنہم کی روش کے بالکل خلاف ہے۔ اللہ نے کرم کیا کہ ہمیں ان صالحین کا پیرو بنایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درست مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''من قال لاخیه یا کافر فقد باء بها احدهما''۔ ''جس نے اپنے بھائی کو کافر کہہ کر خطاب کیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان دو میں سے ایک پر ضرور اس قول کی زد پڑی''۔ اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ''من دعا رجلاً بالکفر او قال یا عدو الله ولیس کذلك الا حار علیه''۔ ''جس شخص نے کسی غیر کافر کو کافر کہا یا اے دشمنِ خدا کہا اس کا یہ قول اسی پر پلٹ پڑا''۔ مطلب یہ کہ وہ خود اپنے قول کا ہدف بن گیا۔ یہ گویا بڑی شدید وعید ہے جو متنبہ کر رہی ہے کہ بے علم و بے بصیرت کسی کو کافر اور فاسق ہرگز ہرگز نہ کہا جائے۔ اسی طرح یہ اور اس قبیل کی دیگر ہدایات ہیں جو بسیار گوئی اور سکوت سے بالتنبیہہ روکتی ہیں ماسوا اس کے کہ مقصود خیر ہو اور بر بنائے علم ہو۔

Marfat.com

بہر حال ہمیں موضوع بحث کی طرف جو پیش نظر ہے لوٹنا چاہیے۔ تو عرض ہے کہ ہم نے قرآن کریم میں مندرجہ ان سب آیات پر غور کیا جن کا تعلق سورج، چاند اور ستاروں سے ہے اور ہمیں کوئی ایسی شے نہیں ملی جو صریحاً اس امر پر دلالت کرے کہ چاند اور دیگر ستاروں تک رسائی ا مکان معدوم ہے۔ یہی عالم سنت مطہرہ کا ہے۔ وہاں بھی ایسی کوئی چیز نہیں ملی۔ اس امر کو تسلیم نہ کرنے والوں کا اس کے قائلوں کو کافر قرار دینے والوں کے بارے میں خداوند کریم نے اپنی کتاب حکیم میں جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ سورۂ حجرات کی رو سے یہ ہے:

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجاً وَّزَیَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِیْنَ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَیْطٰنٍ رَّجِیْمٍ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِیْنٌ۔

''ہم نے آسمان میں بروج بنائے اور اسے اہلِ نظر کے لیے سجا دیا اور اسے ہر شیطان مردود سے بچا بھی رکھا ہے۔ ماسوا اس کے جو چوری چھپے کان لگا لے مگر اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے انگارہ درخشندہ''۔(15/16)

اسی طرح خدا تعالیٰ نے سورہ فرقان میں ارشاد کیا ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجاً وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجاً وَّقَمَرًا مُّنِیْراً۔

''متبرک ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج بنائے اور پھر اس میں چراغ رکھ دیا اور ماہتاب بھی جو تابندہ کر دیتا ہے''۔(25/61)

اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ نِ الْكَوَاكِبِ. وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَیْطٰنٍ مَّارِدٍ. لَایَسَّمَّعُوْنَ اِلَی الْمَلَاِ الْاَعْلٰی وَیُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ. دُحُوْراً وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ. اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ۔

''اور ہم نے سجایا نیچے والے (دنیا والے) آسمان کو ستاروں کی سجاوٹ سے اور اسے ہر شیطانِ سرکش سے محفوظ رکھا۔ وہ اوپر والی مجلس سے کچھ بھی سن نہیں سکتے۔ انہیں ہر جانب سے ہانک دیا جاتا ہے۔ اور انہیں پے در پے مار پڑتی ہے۔ ماسوا اس کے جو چھپاک سے کچھ اچک لایا مگر اس کے پیچھے درخشندہ انگارہ

Marfat.com

لگ جاتا ہے"۔(37/6)

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْماً لِلشَّيٰطِيْنِ۔

"اور ہم نے سجایا ہے نیچے والے (یا دنیا والے) آسمان کو چراغوں سے اور اسے شیطانوں کے لیے سرکوب بنادیا"۔(67/5)

اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقاً. وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْراً وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجاً۔

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے سات آسمان تہ برتہ بنادیے اور ان میں قمر کو نور اور شمس کو چراغ بنادیا"۔(71/15-16)

ان آیاتِ کریمہ اور اسی مفہوم سے متعلق دوسرے ارشاداتِ الٰہی سے یہ معنٰی لے لیا گیا کہ کواکب آسمان کے اندر ہیں یا اس کے ساتھ چپکے ہوئے ہیں لہٰذا ان کی سطح تک رسائی کیسے ممکن ہوئی۔ اسی طرح انہوں نے بعض علمائے فلکیات کی ان آراء پر بھی حاشیہ آرائی کی جن کی رو سے چاند دنیا کے آسمان میں ہے۔ عطارد دوسرے آسمان میں ہے، زہرہ تیسرے آسمان میں، سورج چوتھے میں، مریخ پانچویں میں، مشتری چھٹے میں اور زحل ساتویں میں..... اس رائے کو بہت سے مفسرین نے نقل کیا ہے اور پھر چپ سادھ لی ہے..... جواباً عرض ہے کہ ان آیات مذکورہ میں ایسی کوئی بات نہیں جو اس امر پر دلالت کرے کہ سورج، چاند اور دوسرے سیارے آسمان میں داخل ہیں اور اس کے لیے باعثِ زینت ہیں۔ لغت کی رو سے لفظ "سما" کا اطلاق ہر اس شے پر ہوتا ہے جو بلند اور رفیع ہو۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِى السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِىَ تَمُوْرُ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِى السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِباً فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ۔

"کیا تم بے خوف ہو گئے ہو اس سے جو آسمان میں ہے (اگر چاہے) تمہیں زمین میں دھانس دے درآنحالیکہ وہ لرز رہی ہو۔ یا کیا اس سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے کہ (چاہے تو) تم پر پتھروں کی بارش برسادے۔ عنقریب جان لو گے کہ میرا ڈراوا کیسا ہوتا ہے"۔(67/17)

مفسرین کا ایک گروہ اس امر کا قائل ہے کہ ان دو آیتوں میں "فی" کا کلمہ ظرفیت کے لیے

Marfat.com

ہےاور یہ کہ ''السّماء'' سے مراد علوم اور ارتفاع ہے۔اس ضمن میں ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جہت ارتفاع میں ہے۔عرش کے اوپر،اس کے معنی اس کے سوااور کچھ نہیں کہ آسمان (السماء) کا اطلاق بلندی پر ہوتا ہےاور لغت عربیہ میں یہ امر عام معروف ہے۔دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں ''فی'' کا کلمہ ''علٰی'' کے معنوں میں آیا ہے لہٰذا یہاں ''السماء'' سے مراد ''سماءِ'' ذوالبنا ہے (وہ کوئی ٹھوس شے ہے) جیسا کہ خدائے تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''فسیحوا فی الارض''۔ (زمین پر خوب گھومو پھرو) یہاں ''فی'' سے ''علٰی'' مراد ہے یعنی زمین پر چلو پھرو۔اسی طرح یہ بھی کہ اللہ آسمان میں ہے دراصل ظاہر کرتا ہے کہ آسمان پر ہے اور وہ وہاں پوری طرح مسلط و قابض ہے۔یہ خدائے عزوجل کی شانِ جلال کے عین مطابق ہے۔مخلوقات کا قابض ومسلط ہونا اس کے ساتھ کوئی مشابہت نہیں رکھتا۔جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے: لیس کمثلہ شیء و ھو السمیع البصیر۔ ''اس کی مثل اور کوئی شے نہیں۔وہی سمیع ہے وہی بصیر ہے''۔اسی طرح فرمایا: ولم یکن لہٗ کفوا احد۔اس کا ہم چشم وقریں کوئی نہیں''۔اور مزید فرمایا: فلاتضربوا للّٰہ الامثال. ان اللہ یعلم و انتم لاتعلمون. ''اللہ تعالیٰ کے لیے مثالیں نہ گھڑو،اللہ تو جانتا ہے اور تم نہیں جانتے''۔جس نے اس معنی کو قبول نہ کیا اور اللہ تعالیٰ کی توصیف اس کے خلاف کی تو اس نے گویا کتاب وسنت کے اُن شرعی دلائل کی خلاف ورزی کی جو اللہ سبحانہ کے علو اور اس کے عرش پر یوں متمکن ہونے پر دلالت کرتی ہیں جو اس کی شانِ جلالت کے لائق ہے اور یہ بغیر تکثیف، تمثیل، تحریف اور تعطیل کے ہے۔ساتھ ہی یہ بھی کہ اس نے گویا سلفِ امت کے اجماع کی بھی مخالفت کی.....اسی ذیل میں حق سبحانہ سورۂ بقرہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ o الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِہٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ.

''اے لوگو عبادت کرو اپنے رب کی جس نے تمہیں اور تمہارے پیش روؤں کو پیدا کیا۔ممکن ہے تم پرہیز گار بن جاؤ (عبادت کرو اس کی) جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو عمارت بنا دیا۔اور پھر آسمان سے پانی بھیجا اور اس پانی کے ذریعے ہر طرح کے پھل نکالے تا کہ تمہارا رزق بنیں۔ لہٰذا دیدہ دانستہ اللہ کے برابر اور اس کے جوڑ کا کسی کو نہ

Marfat.com

ٹھہراؤ"۔(2/21-22)

مفسرین کی ایک جماعت کا بیان یہ ہے کہ "وانزل من السماء ماءً" کی آیت میں السماء سے مراد بادل ہیں جن کو لوگوں کے اوپر ہونے اور بلند ہونے کے باعث یہ نام دیا گیا ہے اسی ضمن میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی آتا ہے جو سورۂ حج میں شامل ہے:

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَن لَّنْ يَّنصُرَهُ اللّٰه فِى الدُّنيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ۔

"جسے یہ گمان ہو کہ اللہ دنیا میں اور آخرت میں اس کی ہرگز مدد نہ کرے گا تو اسے چاہیے کہ آسمان کے رخ کوئی رسی تان لے"۔(22/15)

مفسرین کی رائے میں اس کا معنی یہ ہے کہ آسمان کی جانب کوئی رسی تانے، چھت کی سی۔ چنانچہ اسے "سماء" کہا۔ اس علو کے باعث جو اسے اپنے سے نیچے کی چیزوں کے تناسب سے حاصل ہے۔ اسی ضمن میں حق سبحانہ کا یہ بیان ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِى السَّمَاءِ۔

"کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کیسی مثال بیان کی ہے۔ پاکیزہ بات پاکیزہ درخت کی طرح ہے جس کی جڑ مضبوط ہو ٹہنی آسمان میں ہو"۔(14/25)

یہاں بھی کلمۂ سماء سے علو مراد ہے۔ صاحب قاموس کہتے ہیں "سماء" سے مراد سمو یعنی علو ہے۔ کسی چیز کا بلند ہونا اور اسی سے اَعْلَاهُ (اس نے اسے بلند کیا) کے مترادف ہے "اسماہ" بنا۔ آگے چل کر صاحب قاموس کہتے ہیں "السماء" معروف عام ہے۔ ہر کوئی اسی طرح کہتا ہے۔ ہر شے کی چھت مراد ہے۔ یہاں صاحب قاموس کا بیان ختم ہوا۔ بہرحال لفظ سماء کا کسی مرتفع چیز پر اطلاق پذیر ہونا عام ہے۔ اور اس باب میں کلام الٰہی، کلامِ رسولِ اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور کلام مفسرین سے بکثرت مثالیں مل جاتی ہیں۔ جب یہ امر معلوم ہو گیا تو پھر احتمال یہ ہے کہ (متعلقہ) آیات کا معنیٰ ممکن ہے یہ ہو کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کواکب کو سماء الدنیا اور ارض کے مابین کسی مدار میں قائم کیا اور پھر مدار کو اس کی بلندی کے باعث "سماء" کہا۔ ہمارے علم کی حد تک کوئی دلیل اس مفہوم کو مانع نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ سورج اور چاند فلک

Marfat.com

(مدار) میں رواں رہتے ہیں۔ سورۂ انبیاء کی یہ دو آیتیں حق سبحانہ کا بیان پیش کرتی ہیں:

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ۔

''اور وہی ہے جس نے رات اور دن پیدا کیے اور چاند اور سورج بنائے۔ ہر ایک اپنے دائرے میں تیرتا پھرتا ہے''۔(21/34)

اسی طرح خداوندِ تعالیٰ سورۂ یٰسین میں فرماتے ہیں:

لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ۔

''سورج کو ضرورت نہیں کہ وہ چاند کو جا لے اور نہ رات کو ضرورت ہے کہ دن سے آگے بڑھے۔ ہر کوئی اپنے اپنے گھیرے میں تیر رہا ہے''۔(36/40)

اگر چاند اور سورج آسمان کے ساتھ چپکے ہوئے ہوتے تو ان کی تعریف میں تیرنا نہ کہا جاتا۔ اس لیے کہ ''سبح'' پانی وغیرہ میں رواں رہنے کو کہتے ہیں۔ ابن جریرؒ اپنی مشہور تفسیر میں لکھتے ہیں کہ لغتِ عرب کی رو سے فلک دائرے کی سی شے کو کہتے ہیں۔ اور اس ضمن میں علمائے سلف کے متعدد اقوال منقول ہیں۔ ازاں بعد جریرؒ نے جو کہا وہ یہ ہے: ''صحیح تر قول اس امر میں وہی ہے کہ حسب ارشاد خداوندی کہا جائے ''وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ''۔ جو ہے سو دائرے میں رواں ہے (تیر رہا ہے) یہ کہنا بھی جائز ہے کہ فلک چکی کے مانند ہو جیسا کہ مجاہد خیال کرتے ہیں۔ الحسن بھی ایسی ہی رائے رکھتے ہیں۔ وہ اسے چکی کی کلّی کی طرح قرار دیتے ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ وہ گرداب ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ قطب سماوی ہو۔ وہ اس لیے کہ کلامِ عرب میں ہر دائر شے کو فلک کہتے ہیں جس کی جمع افلاک ہے۔ پھر جریرؒ نے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کے الفاظ نقل کیے ہیں اور وہ یہ ہیں ''فلک'' زمین و آسمان کے مابین ستاروں اور سورج اور چاند کی گزرگاہوں کا نام ہے۔ ازاں بعد قرآن کی یہ آیت پڑھی 'تَبَارَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَاۤءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ''اور وضاحت کی کہ بروج زمین و آسمان کے مابین ہیں نہ کہ زمین میں..... یہاں طبری کا بیان ختم ہوا۔

حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں ابن زید کے اس قول کو قبول کرنے کے سے انکار کیا ہے لیکن ان کے انکار کی کوئی وجہ ذرا بھی سوچیں تو معلوم نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ وہ انکار کے ضمن میں

Marfat.com

کوئی دلیل نہیں دیتے۔ نسفیؒ نے اپنی تفسیر میں جو رائے ظاہر کی ہے وہ یہ ہے: ''جمہور کی رائے یہ ہے کہ آسمان کے نیچے ایک گرداب کا نام فلک ہے جس میں چاند، تارے اور سورج رواں دواں ہیں''۔ نسفی کا بیان ختم ہوا۔

آلوسی نے اپنی تفسیر ''روح المعانی'' میں یہ رائے ظاہر کی ہے: ''اکثر مفسرین کا بیان یہ ہے کہ وہ (فلک) آسمان کے نیچے گردش میں رہنے والی موج کا نام ہے۔ جس میں سورج اور چاند رواں رہتے ہیں''۔ آلوسی کا بیان ختم ہوا۔ فلک کی اس تفسیر کی روشنی میں اور ان آیات کی رو سے جو پیش کی جا چکی ہیں چاند یا کسی دوسرے سیارے کی سطح پر پہنچنا مقبول دلائل سے متصادم نہیں۔ اور اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ قرآن کے بیان کردہ ''سماء'' کی تردید ہو جاتی ہے جس میں سورج اور چاند موجود ہیں۔ اور جو یہ گمان کرے کہ افلاک سے ٹھوس سماوات مقصود ہیں تو اس کا قول ہمارے علم کی حد تک بے دلیل ہے۔ لائق اعتماد نہیں۔ اس کے برعکس منقولہ اور دوسری دلائل صریحہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سات آسمان اور شے ہیں اور افلاک اور شے۔ احتمال یہ ہے کہ حق سبحانہ کے نزدیک ''سماء'' کا معنی حسب آیات مذکورۃ الصدر دنیا کا آسمان ہے جیسا کہ آیت مشمولہ الحجرات سے ظاہر ہوتا ہے: ''وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوْجاً وَّزَيَّنَّهَا لِلنَّاظِرِين''۔

اس سے حق تعالیٰ کی مراد یہ نہیں کہ بروج آسمان کے اندر داخل ہیں۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ وہ آسمان کے قریب ہیں اور آسمان سے منسوب ہیں۔ جیسا کہ لغت عرب میں یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص مدینہ میں یا مکہ میں مقیم ہے خواہ وہ اس کے گرد و نواح میں قیام پذیر ہو، رہا یہ کہ اللہ نے کواکب کو آسمان کی زینت قرار دیا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کواکب آسمان کے ساتھ چپکے ہوئے ہیں۔ یہ امر محتاجِ دلیل ہے۔ اس کے برعکس یہ بالکل بجا ہے کہ انہیں آسمان کی زینت کہا جائے۔ اگرچہ وہ آسمان سے الگ ہوں اور ان کے اور آسمان کے مابین فضا (خلا) موجود ہو۔ جیسا کہ آدمی مکان کی چھتوں کو ساز و سامان سے اور بجلی کے لٹوؤں اور ٹیوبوں وغیرہ سے آراستہ کرے ضروری نہیں کہ وہ سب کچھ چھت کے ساتھ چپکا ہوا ہو۔ اس کے باوصف عربی زبان میں یہی کہا جائے گا کہ فلاں نے گھر کی چھت سجالی ہے۔ خواہ سجاوٹ اور چھت کے مابین خلا موجود ہو۔ رہا سورہ نوح میں بیان کردہ قولِ ربانی کہ ''اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰاتٍ طِبَاقاً وَّ جَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْراً وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجاً''، اس کا معنی کسی دلیل کی رو سے بھی یہ طے

Marfat.com

نہیں پاتا کہ شمس وقمر آسمان میں داخل ہیں۔اکثر کے یہاں اس کا معنی یہ ہے کہ ان دونوں کا نور آسمانوں میں ہے نہ کہ ان کی ٹکیا۔۔اس لیے کہ خود ان کی ٹکیا تو سماوات سے الگ ہے نور سماوات میں ہے۔اب جریرؒ اس آیت کی ذیل میں حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ بن العاص کے حوالے سے جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ بھی اسی مفہوم کی طرف رہبری کرتا ہے۔

چنانچہ ابن جریر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''ہمیں عبدالاعلیٰ نے بتایا اور ان کا بیان ہے کہ انہیں ابن ثور نے معمر سے سن کر بتایا۔اور معمر نے قتادہ سے سنا۔قتادہ نے عبداللہؓ بن عمروؓ بن العاص سے کہ انہوں نے فرمایا شمس وقمر کے چہرے آسمانوں کی جانب ہیں اور پیٹھیں زمین کی طرف''۔

قتادہ کی سند میں انقطاع ہے اس لیے کہ قتادہ نے عبداللہؓ بن عمروؓ کا دور نہیں پایا۔اور اگر مان بھی لیں کہ یہ بیان عبداللہؓ بن عمروؓ ہی کا ہے تو پھر ممکن ہے انہوں نے یہ مضمون بنو اسرائیل سے لیا ہو۔اس لیے کہ آیت بالوضاحت دلالت کر رہی ہے اس امر پر کہ آسمانوں میں ان دونوں کا نور ہے نہ کہ ٹکیائیں۔رہا ان کے چہروں کا آسمان کی جانب ہونا تو اس میں کلام کی گنجائش ہے۔ خدائے تعالیٰ سبحانہ ہی بہتر جانتے ہیں۔رہا کسی صاحب تفسیر کا یہ کہنا کہ یہ ''کل کے بعض پر اطلاق'' کے اصول کے ذیل میں آتا ہے اس لیے کہ قمر تو آسمانِ دنیا میں ہے اور سورج چوتھے آسمان میں ہے۔ایسے ہی جیسے کہا جائے ''میں نے بنو تمیم کو دیکھا ہے''۔حالانکہ میں نے ان میں سے چند ایک کو دیکھا ہے۔یہ مثال نہ ٹھیک بیٹھتی ہے نہ اس مسئلے کی طرف رہبری کرتی ہے اور نہ ہمیں اپنے علم کی حد تک کوئی ایسی حجت میسر ہے جو دلالت کرے اس امر پر کہ چاند دنیا کے آسمان میں ہے اور سورج چوتھے آسمان میں۔اگر یہ قول کسی ماہر فلکیات کا بھی ہو تب بھی وہ قابلِ اعتماد سند نہیں اس لیے کہ ان کے اقوال بڑی حد تک مبنی بر تخمین وگمان ہیں۔اور یہ تخمین وگمان نہ شرعی قواعد پر استوار ہے اور نہ قطعی بنیادوں پر لہٰذا حزم واحتیاط لازم ہے۔اس مسئلہ پر حافظ ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں ان الفاظ کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا کہ ''اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا'' کا مفہوم ہے ایک دوسرے کے اوپر، کیا اسے محض سن سنا کر قبول کر لیا جاتا ہے یا یہ معاملہ مدرکات حسیہ میں سے ہے، وہ ادراک جو سیاروں کی سیر اور ان کے گرہنوں وغیرہ کے علم سے حاصل ہوتا ہے۔اس لیے کہ یہ کواکب جو سبع سیارہ ہیں ایک دوسرے کو گرہن لگاتے ہیں۔سب سے نزدیک آسمانِ دنیا کا چاند ہے جو اپنے اوپر والے کو گرہن لگاتا ہے۔عطارد

Marfat.com

دوسرے آسمان میں ہے۔زہرہ تیسرے میں،سورج چوتھے میں،مریخ پانچویں میں،مشتری چھٹے میں اورزحل ساتویں میں۔باقی سب ستارے ثوابت ہیں(سیارنہیں)اور یہ آٹھویں آسمان میں ہیں اسے فلک الثوابت کہتے ہیں۔(ان ستارہ شناسوں میں)جو اہل شرع ہیں اُسے کرسی قرار دیتے ہیں۔نواں آسمان اطلس ہے جوان کے نزدیک اثیر(ایتھر)ہے۔وہ جس کی گردش باقی سارے افلاک کی حرکت کے برعکس ہے۔اس لیے کہ اس کی حرکت جملہ حرکات کا مبدأ ہے۔یہ حرکت مغرب سے مشرق کو ہے۔حالانکہ باقی سارے افلاک مشرق سے مغرب کوحرکت کرتے ہیں اورانہی کے اتباع میں سارے کواکب گردش کرتے ہیں لیکن سیاروں کی گردش انکے افلاک کی گردش کے الٹ ہوتی ہے۔اس لیے کہ افلاک مغرب سے مشرق کو جاتے ہیں۔ہر سیارہ اپنے حساب کے مطابق اپنا فلک(دائرہ)عبور کرتا ہے۔مثلاً چاند اپنے فلک کوایک ماہ میں ایک بار طے کرتا ہےاورسورج ایک سال میں اورزحل تیس سالوں میں۔یعنی ہرایک اپنے فلک کی وسعت کے مطابق وقت لیتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ ہرایک کی تیزیٔ رفتار اپنے اپنے فلک کے ساتھ متناسب ہوتی ہے۔یہ ہے ملخص ان سارے بیانات کا جو جملہ اختلافات سمیت اس مسئلے کے ضمن میں مختلف مقامات پر مندرج ہوئے۔ہم اپنی طرف سے کچھ نہ کہیں گے''۔ابن کثیر کا بیان ختم ہوا۔

حافظ ابن کثیرؒ کا قول کہ اس امر میں ''جملہ اختلافات سمیت.....'' الخ،دلالت کرتا ہے اس بات پر کہ علمائے فلک کے حوالے سے جو کچھ بیان کیا جاتا رہا ہے اس میں عدم اتفاق موجود ہے۔ مثلاً قمر کا آسمانِ دنیا میں ہونا،عطارد کا آسمانِ ثانی میں ہونا،زہرہ کا آسمانِ ثالث میں ہونا اور شمس کا آسمانِ رابع میں ہوناوغیرہ اگران کے پاس قطعی دلائل ہوتے تو وہ باہم مختلف نہ ہوتے۔اگر ہم یہ فرض بھی کرلیں کہ وہ امر مذکور میں متفق ہیں تو جب بھی ان کا اتفاق حجت نہیں۔اس لیے کہ وہ معصوم نہیں۔اجماعِ معصوم ان علمائے اسلام کا اجماع ہے جو شروطِ اجتہاد سے بخوبی بہرہ مند ہوں اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ''لایزال طائفة من امتی علی الحق منصورة''۔چنانچہ جب علماء کسی حکم کے ضمن میں اجماع قطعی کو پہنچ جائیں.....اجماع سکوتی نہیں .....تو پھر بلا شک وشبہ وہ حق پر ہیں اس لیے کہ نصرت یاب طائفہ انہی میں سے ہے۔اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آگاہ فرمایا ہے کہ وہ طائفہ تادمِ حشر حق پر رہے گا۔مذکورہ بالا دلائل سے اور بہت سے اہلِ علم کے بقول اور بقول نسفی اکثر اہلِ علم اور نیز آلوسی کی رائے کی روشنی میں یہ امر

Marfat.com

واضح ہو جاتا ہے کہ جملہ کواکب جن میں سورج اور چاند بھی شامل ہیں ''تحت السمٰوات'' ہیں، داخل سمٰوات نہیں۔ اس اعتبار سے جانا جاسکتا ہے کہ کواکب اور آسمان (سماء الدنیا) کے مابین خلا (فضا) کا وجود ممکن ہے۔ اور یہ بھی کہ اس میں خلائی مرکبات تیرتے پھرتے ہوں۔ پھر ان مرکبات کا چاند اور دیگر کواکب کی سطح پر اترتے رہنا بھی ممکن ہے۔ اس کے عدم امکان کا قائل ہونا جائز نہیں۔ ماسوا اس کے کہ کوئی صریح اور واضح شرعی دلیل موجود ہو جس کا سہارا لیا جائے۔ اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ پھر کسی کے خالی یہ کہہ دینے ہی پر اس کی تصدیق کر دی جائے کہ وہ سطح قمر پر یا کسی اور سیارے کی سطح پر پہنچ گیا تاوقتیکہ وہ ایسے سائنسی دلائل پیش نہ کرے جو اس کے دعوے کی تصدیق کریں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عام لوگ فضائی (خلائی) معلومات کے ضمن میں (بلکہ خود خلاباز بھی) متفاوت ہیں۔ ان میں بعض ایسے ہیں جنہوں نے رصد گاہوں وغیرہ کی مدد سے معلومات حاصل کیں اور انہی پر قناعت کر لی۔ ایسوں کے علم نے انہیں امریکی خلابازوں کے اس دعوے کی تصدیق کے راستے پر ڈال دیا کہ وہ سطح قمر پر پہنچ گئے اگر وہ تصدیق کریں تو معذور ہیں۔ لیکن جس کو اس باب میں وافر معلومات میسر نہ ہوں اسے توقف کرنا چاہیے اور چھان پھٹک کرنی چاہیے حتیٰ کہ اسے تصدیق وتکذیب کے لیے وہ کارگر دلائل میسر آجائیں جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

اس ذیل میں کہ کواکب کی جانب پرواز ممکن ہے یہ قول خداوندی سورۂ رحمٰن میں مسطور ہے:
وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَاءَ فَوَجَدْنَاهَا مُلِئَتْ حَرَساً شَدِيداً وَّ شُهُباً وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَن يَسْتَمِعُ الآنَ يَجِدْ لَهُ شِهَاباً رَّصَداً۔

پھر اگر جنوں کے لیے آسمان کی طرف صعود کرنا ممکن ہے یہاں تک کہ وہ آسمان کو چھو لیں تو پھر یہ امر آدمی کے لیے اور وہ بھی بیسویں صدی کے آدمی کے لیے جبکہ سائنس اور اختراع اس قدر ترقی کر چکی ہو کیونکر محال ہے۔ اس علمی اور اختراعی ترقی نے آدمی کو وہاں پہنچا دیا ہے جہاں پہنچنا خود ان اختراع کنندگان کے بھی وہم میں نہ آسکتا۔ رہا آسمانوں کا ٹھوس وجود والا ہونا اور اس ضمن میں یہ اعتقاد کہ اس کے دروازے محفوظ ہیں اور وہاں پاسباں مقرر ہیں لہٰذا وہاں انس اور جن میں سے کوئی شیطان ہرگز ہرگز داخل نہیں ہو سکتا تو اللہ تعالیٰ کا یہ قول پیش نظر رہنا چاہیے: **وَحَفِظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ الرَّجِيمِ۔**

Marfat.com

اوراحادیث صحیحہ کی رُو سے ثابت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت جبریل کی معیت میں معراج پر گئے تو وہ آسمانِ دنیا میں حکم واذنِ الٰہی کے بعد گئے تھے۔

رہا حق تعالیٰ کا یہ قول جو سورۂ رحمٰن میں شامل ہے:

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَاتَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ۔

''اے جن وانس کی جمعیتو اگر بس چلتا ہے کہ حدود سمٰوات وارض کو عبور کر جاؤ تو پھر کر جاؤ عبور۔ تم اسے بے سند (یا بے قوت) عبور نہ کر سکو گے''۔(55/24)

تو یہ آیت کواکب پر پہنچنے کے امکان پر واضح دلالت نہیں کرتی اس لیے کہ اس کے ظاہری معنی، اس کا ماقبل اور مابعد یہ احساس دلاتا ہے کہ حق تعالیٰ کا یہ بیان انس وجن کو حدود سمٰوات وارض طے کر سکنے کے معاملے میں عاجز قرار دے رہا ہے۔ اس آیۂ کریمہ کی تفسیر میں امام ابن جریرؒ اور بعض دوسرے مفسرین نے کئی آراء ظاہر کی ہیں۔ ان میں سے یہ دو خوب تر ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد یومِ قیامت ہے اور حق تعالیٰ نے اس آیت کی رُو سے خبردار کیا ہے کہ روزِ حشر کی ہولناکیوں سے فرار جن وانس کے اختیار وامکان سے باہر ہوگا۔ ابنِ جریر نے یہ قول پیش کرنے کے بعد اس کے مابعد کی آیت کی تفسیر میں جو کچھ بیان کیا اس سے عیاں ہے کہ انہوں نے اس قول کو قبول کر لیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ آیت مذکورہ انس وجن کا یہ عجز ظاہر کر رہی ہے کہ وہ موت سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ اس لیے کہ ان کے پاس کوئی ایسی سند یا قوت نہیں جس کی مدد سے وہ موت کی دسترس سے باہر جا سکتے (یہی عالم عجز قیامت کے دن کی ہولناکیوں سے بچ نکلنے کے معاملے میں ہوگا) ان دونوں بیانوں میں ''سلطان'' سے مراد قوت ہے۔

ہمارے اس بیان کی رو سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سیاروں پر جا چڑھنے کے امکان کو تسلیم کرنے والوں کے لیے یہ آیت کوئی دلیل مہیا نہیں کرتی۔ نیز یہ اس امر پر بھی دلالت نہیں کرتی کہ سلطان سے مراد علم ہے۔ یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس ضمن میں قابل قبول ترین قول ان کا یہ کہنا ہے کہ اس سے مراد یومِ قیامت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ انس وجن کو یہ بات قیامت کے روز ان پر ان کے عجز کو ظاہر کرنے کے لیے کہیں گے اور انہیں خبردار کریں گے کہ آج تم قبضۂ خداوندی میں ہو اور آج میں جو سلوک چاہوں تمہارے ساتھ کروں تم بھاگ نہیں سکتے۔ اسی لیے تو بعد کی آیت میں

Marfat.com

فرمایا: يُرْسِلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّن نَّارٍ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرَانِ" (سورۂ رحمٰن) جس کا معنی (خدا ہی بہتر جانتا ہے) یہ ہے کہ "اگر آج تم فرار کی کوشش کرو گے تو اللہ تم پر آگ کے شعلے اور دھوئیں برسائے گا اور تم نپٹ نہ سکو گے"۔ رہا دنیا کے اندر موجود ہونا تو اس صورت میں ٹھوس وجود والے آسمانوں کی حدود کو عبور کرنا کسی کے بس میں نہیں اس لیے کہ ان کی حدود اور ابواب پر پاسبان معیّن ہیں لہٰذا وہ محفوظ ہیں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا۔ بہر حال حقیقت کو تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔

وَصَلَّى اللّٰهُ وَسَلَّمَ وَبَارَكَ عَلٰى عَبْدِهٖ وَرَسُوْلِهٖ نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تم ہی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تم ہی تو ہو

سب کچھ تمہارے واسطے پیدا کیا گیا
سب غائیتوں کی غایت اولیٰ تم ہی تو ہو

جلتے ہیں جبرائیل کے پر جس مقام پر
اس کی حقیقتوں کی شناسا تم ہی تو ہو

Marfat.com

الامانت سے الامین تک

پروفیسر محمد منوّر

297.
176
108

Marfat.com